امت سازی (۱)

از نظر قرآن



گروہ معارف

باسمہٖ تعالیٰ

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّة" يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتِ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَاب" عَظِيْم" " (سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

ماہِ مبارکِ رمضان ماہِ نزولِ قرآن ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شہراللہ ہے اور ماہِ ضیافۃ اللہ ہے، مہمانیِ خدا کا مہینہ ہے یعنی اس ماہ میں انسان وبالخصوص مومن اللہ کا مہمان ہے واس مہمانی میں خدا کی ذات بذاتِ خود میزبان ہے جو دسترخوان ذاتِ حق نے انسان کے لئے مہیا کیا ہے وہ قرآن ہے جیسا کہ روایت میں تعبیر ہے کہ

"القرآن مادبة اللّٰه "

قرآن خدا کا دسترخوان ہے وہ دسترخوان جو خدا نے اپنے بندوں کے لئے آمادہ کیا ہے اور انسان کی ہر ضرورت خدا نے اس دسترخوان پر مہیا کردی ہے اور انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ اس دسترخوان کی طرف رجوع کرے اور اپنی ضرورتِ ہستی وضرورتِ زندگی اس سے انتخاب کرے اور اس کو حاصل کرے۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہدایت ہے چونکہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے خلقت میں انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز قرار دیا ہے اور انسان کی خلقت کا امتیاز یہ ہے کہ انسان کئی طرح کی ہدایت کا محتاج ہے۔ ایک ہدایت ایسی ہے جو تمام موجودات کو خدا نے عطا کی ہے جس طرح قرآن کریم کا خطاب ہے حضرتِ موسیٰؑ کی زبان سے کہ

"رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى" (طه، ۵۰)

میرا رب وہ ہے جس نے ہر شئے کو خلقت عطا کی ہے اور اسے ہدایت بھی عطا کی ہے، خلقت میں بھی انسان دوسروں کے ساتھ شریک ہے کہ اصلِ خلقت خدا کی جانب سے ہے اور ہر شئے کو خدا نے ہدایت دی ہے کہ یہ ہدایت انسان اور غیر انسان میں مشترک ہے لیکن ایک مخصوص ہدایت ہے جو فقط انسان کے لئے ہے، وہ ہدایت جو قرآن وکتبِ آسمانی کی صورت میں ہے، انبیائے کرام جس ہدایت کو بشر کے لئے لے کر آئے ہیں، جس ہدایت کے لئے تعلیم، تربیت، معرفت اور عمل کی ضرورت ہے۔ ہدایت سے مراد یعنی انسان کو اپنے مقصدِ خلقت تک پہنچنے کے لئے جو ضروری معرفت، راستہ اور اس کے لوازمات ہیں وہ سب کے سب اس ہدایت کے اندر موجود ہیں جو انسان کی سب سے پہلی ضرورت ہے ان ضرورتوں میں اور اس ہدایت کا ایک اہم حصہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی اجتماعی ہدایت واجتماعی نظم کی صورت میں بیان وتدوین فرمایا ہے لہٰذا قرآن انسان کی جامع ہدایت کا منبع ہے یعنی قرآن مجید میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کے لئے ہر طرح وہر

> ہدایت سے مراد یعنی انسان کو اپنے مقصدِ خلقت تک پہنچنے کے لئے جو ضروری معرفت، راستہ اور اس کے لوازمات ہیں وہ سب کے سب اس ہدایت کے اندر موجود ہیں جو انسان کی سب سے پہلی ضرورت ہے ان ضرورتوں میں اور اس ہدایت کا ایک اہم حصہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی اجتماعی ہدایت و اجتماعی نظم کی صورت میں بیان و تدوین فرمایا ہے

پہلو سے ہدایت مقرر فرمائی ہے۔

مقام خلافت الٰهی مقصد انسان

جس طرح خدا نے انسان کے وجود کو ترتیب دیا ہے، اسی ترتیب سے ہدایت بھی تدوین فرمائی ہے چونکہ انسان کو اپنا مقامِ انسانیت خود حاصل کرنا ہے، مقصدِ خلقت خود پانا ہے۔ باقی تمام مخلوقات کو خدا نے ان کی ذات، ان کی ہستی، ان کی حقیقت عطا کر دی ہے جبکہ انسان کو اپنی حقیقت کی خود جستجو کرنی ہے واس حقیقت تک خود اسے پہنچنا ہے یا وہ تعبیر جو پہلے بھی استعمال ہوئی ہے کہ باقی تمام مخلوقات کو خدا نے وہیں پر پیدا کیا ہے جہاں کے لئے تھیں جس نکتے کے لئے تھیں اسی میں پیدا ہوئی ہیں اور اسی شہر میں ہی انہیں رکھا گیا ہے جبکہ انسان کے لئے ایسا نہیں ہے، انسان کے محلِ پیدائش میں اور مقصدِ پیدائش میں بہت فاصلہ ہے، اس نکتہِ پیدائش سے چل کر اس کو نکتہِ ہدف تک پہنچنا ہے جو بہت دراز سفر ہے اور وہ سفر مقصدِ خلقت ہے۔ انسان کا یہی اصلی سلوک واصلی سفر ہے جس کو قرآن مجید نے مختلف تعبیروں سے ذکر کیا ہے، کبھی لقاءاللہ سے، کبھی قربِ خدا سے اور اگر اس کو واضح کر کے بیان کریں یعنی انسان کا مقصدِ تکاملی کہ جہاں پر انسان مقصدِ خلافت و مقامِ خلافتِ الٰہی تک پہنچتا ہے، درحقیقت مقامِ خلافتِ الٰہی ہی مقامِ انسانیت ہے۔ جونہی کوئی انسان مقامِ انسانیت پر پہنچتا ہے تو مقامِ خلافتِ الٰہی بھی اس کو ساتھ ہی نصیب ہوجاتا ہے یہ دو الگ مقام نہیں ہیں، آدمیت، انسانیت و نیابتِ الٰہی و خلافتِ الٰہی دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں جو خلافتِ الٰہی کے منصب سے دور ہیں درحقیقت وہ انسانیت کے منصب سے بھی دور ہیں۔ لہٰذا مختلف تعبیروں کے ساتھ اس مقصد کو ذکر کیا گیا ہے کہ اس سفر کی نوعیت یہ ذکر کی گئی ہے کہ یہ سفرِ تکاملی ہے، یہ سفرِ تکمیلی واستکمالی ہے یعنی انسان نے کمالات حاصل کر کے اپنے اندر اس مقامِ قربِ الٰہی یا مقامِ لقاءاللہ یا مقامِ انسانیت یا مقامِ خلافتِ الٰہی تک پہنچنا ہے کہ ہم سب اس راستے کے راہی ہیں۔

مقصد تک اکا دکا پہنچے ہیں باقی سب اس راہ میں ہیں، اس طرف جا رہے ہیں، کچھ راستے میں بہک گئے ہیں، گمراہ ہوگئے ہیں، کچھ بھٹک گئے ہیں، کچھ نے دائیں بائیں اپنا رخ موڑ لیا ہے، کچھ رک گئے ہیں، کچھ نے تنزل شروع کر دیا ہے، سکوت وانحراف شروع کر دیا ہے، مقامِ انسانیت سے گر گئے ہیں، حیوانیت، شیطنت و درندگی کی طرف مائل ہوگئے ہیں جبکہ سفرِ انسانی بہت کم افراد نے جاری رکھا ہوا ہے۔ جو اس راہ پر ہیں اس سلوک پر ہیں ان کے لئے ہدایت کی ضرورت ہے۔

فردی اور اجتماعی هدایت

جامع ہدایت، جامع ہدایت انسان کی ضرورتوں کے مطابق بنائی گئی ہے اور اس کا ایک حصہ انفرادی ہدایت ہے اور بڑا حصہ اجتماعی ہدایت ہے چونکہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی ہستی و جود اس طرح سے ترتیب دیا ہے کہ اس کو یہ سفر دو پہلوؤں سے کرنا ہے، انفرادی پہلو سے بھی اس نے ارتقاء، نشوونما وتکامل کرنا ہے اور مقامِ خلافت تک پہنچنا ہے اور اجتماعی طور پر بھی اس نے یہ سفر طے کرنا ہے، تنہا انفرادی سفر نہیں ہے، انسان انفرادی طور پر کہیں بھی نہیں پہنچ سکتا اگرچہ انفرادی لحاظ سے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلے جب تک وہ نظام جو خدا نے اجتماعی طور پر اس کے لئے مقرر کیا ہے، اس میں رہ کر، اس سے منسلک ہوکر، اس سے مرتبط ہوکر اور اس کا ایک جزء و عضو بن کر نہیں آگے بڑھتا اس وقت تک اپنا یہ انفرادی سفر بھی طے نہیں کرسکتا۔

ہم اس کی مثال انسان کے بدن کے ساتھ دیتے ہیں، انسان کا بدن مختلف اعضاء و اجزاء سے مل کر بنتا ہے، ہر عضو دوطرح کا ارتقاء کررہا ہے، نشوونما کررہا ہے۔ ایک اس کی انفرادی نشوونما ہے مثلاً ہاتھ کی ایک انگلی یہ بدن کا ایک عضو ہے، یہ انگلی تنہا انفرادی طور پر نشوونما نہیں کرسکتی، اس کو پورے جسمانی نظام کے ساتھ منسلک و مرتبط رہ کر نشوونما کرنی ہے۔ انگلی کے دو ارتقاء ہیں ایک انفرادی حیثیت وتشخص کے ساتھ اور ایک عضوِ بدن و جزوِ

بدن ہونے کے اعتبار سے کہ بدن کی اجتماعی نشو ونما میں انگلی کا بڑا کردار و بڑا رول ہے اور بدن کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ اس عضو کا بھی نشو ونما میں اہم کردار ہے یعنی خود بھی نشو ونما کرے گی اور بدن کی نشو ونما میں بھی یہ شریک ہے اس وقت انگلی اپنے درست مقام تک پہنچ سکتی ہے۔اسی طرح انسان اجتماعی نظام کے اندر فرد ہے اس کو انفرادی طور پر بھی ارتقاء کرنا ہے اور اجتماعی نظام کے اندر منسلک رہ کر، ایک عضو و جزو بن کر بھی ارتقاء و نشو ونما کرنا ہے لہٰذا انسان کی اکثر نظامِ ہدایت اجتماعی ارتقاء کو شامل ہے اس کے لئے آیا ہے چونکہ زیادہ غلبہ اس کا ہے اور بہت کم حصہ انفرادی نشو ونما کا ہے لہٰذا ہدایت کا انفرادی پہلو آسمانی کتابوں کے اندر و خصوصاً قرآن کے اندر کم ہے یعنی جتنا ضرورت ہے اتنا ہی ہے قرآن کا زیادہ زور و زیادہ اسرار اجتماعی نظام کی طرف ہے۔دین کا بنایا ہوا اجتماعی نظام بشریت کے لئے ہے جس نظام سے منسلک ہو کر بشر ارتقاء کر سکتا ہے اور اپنے مقامِ خلقت تک پہنچ سکتا ہے جو مقامِ خلافتِ الٰہی و مقامِ کمالِ انسانی ہے یا مقامِ قربِ خدا و لقاء اللہ ہے یہ سب ایک ہی مقصد کی مختلف تعبیریں و پہلو ہیں ان تک پہنچنے کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کے لئے اجتماعی نظام مقرر فرمایا ہے چونکہ انسان اپنی خلقت میں اس طرح سے ہے کہ اسی نظام کے اندر رہ کر نشو ونما کر سکتا ہے مثلاً جس طرح انسان کا ایک عضو بازو ہے، اب یہ بازو بدن کے ساتھ منسلک رہ کر اجتماعی نظام کا جزء بن کر بھی کمال تک پہنچ سکتا ہے اور بدن کے کمال کا بھی اہم حصہ بن سکتا ہے۔

نظام امت

قرآن مجید میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے جو اجتماعی نظام ذکر کیا ہے اس کا نام امت ہے۔یہ اجتماعی نظام قرآن و دین کے ساتھ مخصوص ہے البتہ پہلی آسمانی کتابوں میں بھی یہی نظام متعارف کروایا گیا ہے لیکن اس نظام کا جو کمال یافتہ حصہ ہے وہ قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔ہدایتِ انسانی یا ہدایتِ الٰہی کا جو فراموش شدہ پہلو ہے وہ امت ہے۔قرآن مجید میں جا بجا اس نظام کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن ہم، ہم سے مراد مفسرین، مترجمین، قارئین و قرآن سے سروکار رکھنے والے ان آیات سے بہت سرسری گزر جاتے ہیں۔ہر آدمی اپنے ایک خاص ذائقے کے مطابق ان آیات سے گزر جاتا ہے مثلاً عموماً فن تجوید و قرأت میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ امت کا تلفظ کیسے ہونا چاہئے، میم شد کے ساتھ کیسے پڑھنی ہے، ت کے ساتھ کیسے پڑھنا ہے، اس میں وقلقلہ کیسے کرنا ہے اور اس طرح کے فنون امت کے اوپر فٹ کیے جاتے ہیں کہ یہ لفظِ امت تلفظ کیسے کرنا ہے؟ اور جب ایک قاریٔ قرآن لفظِ امت کا اچھا تلفظ کرلے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں موفق ہوگیا ہوں اور میں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے یا ایک مفسر جب لغوی اعتبار سے لفظ امت کی تشریح کر دیتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ امت کا حق ادا کر دیا ہے یا ایک مترجم اس آیت کا فصیح و بلیغ ترجمہ کرلیتا ہے جس آیت کے اندر لفظ امت استعمال ہوا ہے وہ بھی سمجھتا ہے کہ اس نے اپنا فریضہ ادا کر دیا ہے اور اسی طرح دیگر عام لوگ ان آیات کو ثواب، تبرک وتیمن کے لئے پڑھ کر گزر جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔جبکہ قرآن انسان کے لئے ہدایت کا جامع نظام لے کر آیا ہے اور ہدایت کے جامع نظام میں خصوصاً اجتماعی نظام کو محور قرار دیا ہے اور قرآن مجید نے اس کے پہلو میں انفرادی ہدایت کا نظام بھی ذکر کیا ہے لہٰذا اہم ترین بحث جو قرآن مجید نے پیش کی ہے وہ ہے نظامِ امت۔وہ نظام جس کا نام امت رکھا ہے یہ کیسا نظام ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

سورہ مبارکہ آلِ عمران میں آیہ۱۰۴ میں خداوند تبارک وتعالیٰ کا صراحت کے ساتھ حکم ہے کہ

"وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ"

امر ہے، یہ حکم ہے، تم بنو، تم ایک امت ہو جاؤ، وہ امت کیا ہو؟

"يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ"

جس کا کام خیر کی طرف دعوت دینا ہو

انسان کو اپنا مقامِ انسانیت خود حاصل کرنا ہے، مقصدِ خلقت خود پانا ہے۔باقی تمام مخلوقات کو خدا نے ان کی ذات، ان کی ہستی، ان کی حقیقت عطا کر دی ہے جبکہ انسان کو اپنی حقیقت کی خود جستجو کرنی ہے و اس حقیقت تک خود اسے پہنچنا ہے یا وہ تعبیر جو پہلے بھی استعمال ہوئی ہے کہ باقی تمام مخلوقات کو خدا نے وہیں پر پیدا کیا ہے جہاں کے لئے تھیں جس نکتے کے لئے تھیں

"وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوف"

جومعروف کی طرف امر کریں

"وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَر"

اورلوگوں کومنکرات سے روکیں

"وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ"

کہ یہ لوگ جوامت بن جائیں اور امت بن کر دعوتِ خیر دیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کریں کہ یہی لوگ فلاح یافتہ ہیں۔

یہاں ایک مقدمہ تمہید کے طور پر بیان کرنا ضروری ہے کہ عموماً ہم جس ذہنیت سے قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اس ذہنیت سے قرآن ہمیں کچھ اور شکل میں نظر آتا ہے۔ہم قرآن کی طرف ایک مقدس اور ثواب آور کتاب کے طور پر رجوع کرتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھنے سے انسان کو تبرک و تقدس حاصل ہوتا ہے اور ہم نے تقدس اور تبرک کا معنیٰ بھی خود سے کیا ہوا ہے،ہم تقدس کو بھی ایک کرنٹ سمجھتے ہیں جونہی اس کو ٹچ کریں تو وہ تقدس ہمارے اندر بھی منتقل ہوجاتا ہے،اسی طرح سے تبرک بھی ایک کرنٹ ہے جو اس کے اندر موجود ہے اس کو اگر گھر میں رکھیں تو پورے گھر کے اندر تبرک و تقدس کا کرنٹ پھیل جاتا ہے۔اس ذہنیت سے ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں جبکہ یہ ذہنیتیں قرآن کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

حقیقی قرآن فهمی سے دوری کے اسباب

مشربِ ناب میں شناختِ قرآن کے حوالے سے ایک مضمون آغاز سے ہی چلا آرہا ہے اور وہ شناختِ قرآن کے لئے بنیادہے۔قرآن میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ قرآن کیا ہے؟یعنی ہم اگر وہ مضمون پڑھ کے قرآن کی طرف آئیں تو پھر قرآن ہمیں کچھ اور طرح سے سمجھ میں آئے گا لیکن اگر وہ سبق پڑھے بغیر قرآن کی طرف آئے تو قرآن ہمیں کچھ اور طرح سے سمجھ میں آئے گا یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر ہم موجود ہ ذہنیت کے ساتھ جو قرآن مجید کے بارے میں رائج ذہنیت ہے، اگر یہ ذہنیت لے کر قرآن کی طرف آئے تو قرآن کو بدل کر اپنے معنیٰ سے ہٹادیں گے اور قرآن کو اپنی ذہنیتوں پر فٹ کرنے کی کوشش کریں گے،قرآن کے معانی میں ردوبدل کردیں گے لیکن ہم اگر وہ سبق پڑھ کے آئیں تو پھر ذہن بدل کر قرآن کی طرف آئیں گے یعنی دوکام درحقیقت ہوسکتے ہیں ایک ذہن کوایسے ہی رہنے دیں جیسے ہےاور قرآن کو اپنی ذہنیت کے مطابق بنالیں یہ کام جو عموماً ہورہا ہے۔اور ایک یہ ہے کہ قرآن کو ایسے ہی رہنے دیں جیسے ہے ہم اپنے ذہن کو قرآن کے مطابق بنائیں،اب وہ مضمون جو مشربِ ناب میں شناختِ قرآن کے حوالے سے چل رہا ہے جسے خصوصاً طلاب کے لئے اس کا پڑھنا ضروری ہے بلکہ سب کے لئے ضروری ہے لیکن علومِ قرآنی وعلومِ دین سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے شناختِ قرآن کے حوالے سے اس کو پڑھنا ضروری ہے کہ ہم قرآن کے متعلق اپنا ذہن تبدیل کریں ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم قرآن کو ہی تبدیل کردیں گے۔جس طرح علامہ اقبالؒ نے کہا کہ

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

خودنہیں بدلتے بلکہ قرآن کو بدل دیتے ہیں۔مولانا رومؒ کے بقول کہ

کردہ ای تاویل حرفِ بکر را

خیش راتاویل کن نہ ذکر را

بہت ہی خالص بات کوتم نے بدل دیا ہے،اپنے آپ کو بدلو ذکر کو مت بدلواسے ویسے ہی رہنے دو جیسا خدا نے اسے مقرر کیا ہے۔

قرآن فہمی کے لئے اپنی ذہنیتوں کو قرآن کے مطابق وموافق بنانا ضروری ہے چونکہ قرآن میں ہرطرح کا ذہن لے کرآنے سے خرابی پیدا ہوتی ہے یعنی انسان قرآن کو تبدیل کرتا ہے جیسا کہ آپ تفاسیر میں،ترجموں میں، خطابوں اور کتابوں میں مشاہدہ کریں تو قرآن مجید کے بارے میں جو سب

> **انسان کے محلِ پیدائش میں اور مقصدِ پیدائش میں بہت فاصلہ ہے،اس نکتۂ پیدائش سے چل کراس کو نکتۂ ہدف تک پہنچنا ہے جو بہت دراز سفر ہے اور وہ سفر مقصدِ خلقت ہے۔انسان کا یہی اصلی سلوک واصلی سفر ہے جس کو قرآن مجید نے مختلف تعبیروں سے ذکر کیا ہے،کبھی لقاءاللہ سے،کبھی قربِ خدا سے اور اگر اس کو واضح کرکے بیان کریں یعنی انسان کا مقصدِ تکاملی کہ جہاں پر انسان مقصدِ خلافت ومقامِ خلافتِ الٰہی تک پہنچتا ہے،درحقیقت مقامِ خلافتِ الٰہی ہی مقامِ انسانیت ہے۔**

> انسان انفرادی طور پر
> کہیں بھی نہیں پہنچ سکتا اگرچہ انفرادی لحاظ سے
> کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لے جب تک وہ نظام جو
> خدا نے اجتماعی طور پر اس کے لئے مقرر کیا ہے، اس میں رہ کر،
> اس سے منسلک ہو کر، اس سے مرتبط ہو کر اور اس کا ایک
> جزء و عضو بن کر نہیں آگے بڑھتا اس وقت تک اپنا
> یہ انفرادی سفر بھی طے نہیں کر سکتا۔

سے زیادہ کام ہوا ہے وہ قرآن کو غیر شعوری، غیر محسوس طور پر قرآن کو اپنے معنٰی سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کا نام قرآن فہمی رکھا گیا ہے، بلکہ قرآن فہمی یہ ہے کہ قرآن جیسا ہے ویسا رہے، ہم اپنے ذہن بدلیں۔ اس وقت جو ہماری ذہنیت ہے وہ یہ کہ قرآن ایک مقدس اور پُر برکت کتاب ہے اس کے اندر نیک و اچھی اچھی باتیں ہیں ان میں سے اگر انسان کسی پر عمل کر لے تو خوب ہے اور اگر عمل نہ بھی کرے فقط پڑھ لے تو بھی خوب ہے انسان قرآن سے جس حوالے سے بھی سروکار رکھے تو یہ انسان کو فائدہ ہی دیتا ہے۔ اب اس ذہنیت سے انسان قرآن سے ثواب ضرور حاصل کرتا ہے لیکن باقی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

قرآن منشور ھدایت

ہماری ذہنیتیں قرآن کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، ہم قرآن کے معانی کو سمجھنے کے لئے یہ ذہن میں رکھیں کہ قرآن منشورِ ہدایت ہے، قرآن کو نہ بدلیں چونکہ قرآن انسان کی ہدایت کے لئے اللہ کا منشور ہے۔ ہم قرآن کو اس طرح سے پڑھیں جس طرح منشور پڑھا جاتا ہے مثلاً ہر ملک کا اس وقت ایک منشور ہے، اس کو کس طرح پڑھا جاتا ہے اس کو پڑھنے کے لئے کس ذہنیت کی ضرورت ہے، کس ذہن سے انسان اس منشور کی طرف آتا ہے اور اس منشور سے کیا لینا چاہتا ہے؟ مثلاً قانون پاکستان کا آئین اگر کوئی پڑھے تو اس کو انسان کس ذہن سے پڑھتا ہے؟ منشوری نگاہ سے پڑھتا ہے اگر اس کو ہم فقط یہ سمجھ لیں کہ آئینِ پاکستان پڑھنے کا ثواب ہوتا ہے، آئینِ پاکستان مقدس و متبرک ہے صرف اس عنوان سے اس کو اگر نگاہ کریں تو کبھی بھی اس کی منشوری حیثیت ہمارے ذہن میں منتقل نہیں ہوگی، بلا شک قرآن مجید مقدس و متبرک ہے یعنی قرآن پاک ترین منشور ہے جس میں ذرہ برابر ناخالصی نہیں ہے، ذرہ برابر باطل اور اس میں کجی نہیں ہے، پاک ترین و منزہ ترین منشور ہے، اس میں غلطی کا ذرہ برابر امکان نہیں ہے یعنی ایک منشورِ مقدس ہے۔ مقدس سے مراد یعنی غلطیوں و خطاؤں سے پاک ہے یعنی اس کا تقدس بھی منشوری تقدس ہے۔ ایک ایسا آئین جو غلطیوں سے پاک ہو جس آئین کے اندر کسی قسم کا قانونی انحراف موجود نہ ہو اس لیے اللہ کا بنایا ہوا یہ پاک قانون ہے، منزہ قانون ہے، ہدایت کا منشور سمجھ کر اس کو اپنائیں اور اس کی اصطلاحات اور اس کی ٹرمینالوجی کو ہم اس رنگ میں سمجھیں جس طرح منشور کی اصطلاحیں ہوتی ہیں نہ جس طرح عام معجزہ و وعظ و نصیحت یا عام گفتگو ہوتی ہے چونکہ ہر گفتگو کی خاص اصطلاحیں ہوتی ہیں، ہم کچھ اصطلاحات گپ شپ میں استعمال کرتے ہیں، گپ شپ میں جو اصطلاح استعمال کی جائے اس پر انسان غور نہیں کرتا چونکہ گپ شپ ہے لیکن یہی اصطلاح اگر علوم کے اندر آ جائے تو اس میں انسان غور کرتا ہے چونکہ علمی اصطلاح ہے مثلاً ایک لفظ علم کے اندر بھی موجود ہے، یہی لفظ قرآن کے اندر بھی موجود ہے اور یہی لفظ عام گفتگو کے اندر بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر برہان ایک لفظ ہے جو ہم عام بول چال میں بھی استعمال کرتے ہیں، ممکن ہے بہت ساری چیزوں کا نام برہان ہو، کتابوں کا نام برہان ہے، جگہ کا نام برہان ہے یا ممکن ہے کسی شخص کا نام، عورت مرد کا نام برہان ہو، جیسے اکثر نام ہوتے ہیں! برہان الدین، برہان، اسی طرح منطق میں جائیں تو منطق میں برہان ایک اصطلاحِ خاص ہے، قرآن مجید میں آئیں تو وہاں بھی اصطلاحِ برہان پائی جاتی ہے۔

"فَاتُوا بُرْهَانَكُم"

تم برہان پیش کرو

چند جگہ پر برہان کا لفظ استعمال ہوا ہے، کسی کے نام کے طور پر برہان کا لفظ استعمال ہوا ہے، کسی جگہ کے نام کے طور پر برہان کا لفظ آیا ہے۔ جب نام آتا ہے کہ فلاں آدمی کا نام برہان ہے تو اس میں ہم غور نہیں کرتے چونکہ پتہ ہے کہ ایک نام ہے اور نام سے ماورا کچھ بھی نہیں ہے ایک فرد کا نام ہے اس

انسان اپنی خلقت میں اس طرح سے ہے کہ اسی نظام کے اندر رہ کر نشوونما حاصل کرسکتا ہے مثلاً جس طرح انسان کا ایک عضو بازو ہے، اب یہ بازو بدن کے ساتھ منسلک رہ کر اجتماعی نظام کا جزء بن کر بھی کمال تک پہنچ سکتا ہے اور بدن کے کمال کا بھی اہم حصہ بن سکتا ہے۔ قرآن مجید میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے جو اجتماعی نظام ذکر کیا ہے اس کا نام امت ہے۔

میں غور کی ضرورت نہیں ہے نام یعنی علامت، یہ کلمہ، یہ اصطلاح، یہ لفظِ برہان ایک فردِ خاص کے لئے علامت ہے۔ اگر جگہ کا نام برہان ہو یعنی یہ لفظ ایک خاص جگہ کے لئے علامت ہے اس میں کوئی اور معنٰی موجود نہیں ہے، اس کے اندر کوئی گہرائی نہیں پائی جاتی، یہ لفظ برہان کسی خاص چیز کی غمازی نہیں کرتا لیکن یہی لفظِ برہان جب علمِ منطق میں استعمال ہوتا ہے تو یہاں پر انسان غور کرتا ہے اس کے اصطلاحی معانی تلاش کرتا ہے۔ برہان کس کو کہتے ہیں، برہان کے ارکان کیا ہیں، برہان کے اصول کیا ہیں، برہان کی شرائط کیا ہیں، برہان کی قسمیں کیا ہیں؟ یہ ساری چیزیں فوراً ذہن میں آجاتی ہیں سوال اٹھتے ہیں اور انسان اس میں غور کرتا ہے، یہی لفظ جب قرآن مجید میں آتا ہے تو اس کے اندر مزید گہرائی آجاتی ہے۔ جب تک یہ کسی کا نام ہے تو اس کے اندر کوئی گہرائی نہیں ہے چونکہ اس کا کوئی معنٰی نہیں ہے۔ یہی لفظ جب علمِ منطق کے اندر آتا ہے تو اس کے اندر معنٰی پیدا ہوجاتا ہے، گہرائی آجاتی ہے اور یہی لفظ جب قرآن استعمال کرتا ہے تو قرآن کا اپنا ایک خاص پسِ منظر واپنا ایک نظام ہے۔ اس نظام کے اندر قرآن نے برہان کا لفظ کسی خاص معنٰی کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے، لہٰذا یہاں برہان کے اندر زیادہ گہرائی پیدا ہوجاتی ہے کہ یہ فقط ایک لفظ نہیں ہے۔

فلاح قرآن کی اصطلاح میں

اب ہمیں ان کو سمجھنا ہوگا کہ جب قرآنی اصطلاحیں ہمارے سامنے آتی ہیں تو ان اصطلاحات کا ہم کس تناظر میں معنٰی کریں وکس طرح سے سمجھیں؟ مثلاً اس آیہ کے آخر میں ہے کہ

"اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"

فلاح جس کو بارہا ہم نے قرآن میں پڑھا ہے، مفلحون کا لفظ آغازِ قرآن سے آخر قرآن تک متعدد دفعہ قرآن میں استعمال ہوا ہے

"اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"

یا

"قَدْ اَفْلَحَ"

اس طرح کے مفاہیم زیادہ استعمال ہوئے ہیں

فلاح، قرآن کی نگاہ میں ایک خاص معاشرتی حالت کا نام ہے یعنی قرآن مجید کے مدنظر جو نظام ہے اس نظام کے ایک خاص مرحلے کا نام فلاح ومفلحون ہے۔ اب مفلحون کو ہم ڈکشنری سے نہیں سمجھ سکتے، جب قرآن میں استعمال ہوا تو یہ ایک خاص اصطلاح ہے قرآن نے ایک خاص معاشرتی حالت کے لئے لفظِ مفلحون استعمال کیا ہے۔ مفلحون کون لوگ ہیں؟ ہم ان کا معنٰی کامیاب کرتے ہیں، نہ، اس کا معنٰی کامیاب نہیں ہے۔ ایک خاص نکتے اور ایک خاص مرحلے تک پہنچا ہوا معاشرہ مفلحون کہلاتا ہے۔ بعبارتِ دیگر فلاح ایک مقام ہے، مرتبہ ہے جہاں تک انسان کو پہنچنا ہے، فلاح کا اپنا ایک مفہوم و اپنی (defination) ہے، فلاح کا ایک خاص تصور وقرآنی (concept) ہے اور انسانوں کو حکم ہے کہ تمہیں اس فلاح تک پہنچنا ہے، نہ یہ کہ ہم جو کام بھی کریں اس کو کہیں کہ یہ فلاح ہے، ہم اس لفظ کو جا بجا استعمال کرکے پھر آخر میں کہتے ہیں کہ یہ فلاح ہے یہاں تک جب پہنچو گے اس نکتے پر جب پہنچو گے تو تم مفلحون کہلاؤ گے، دوسرے لفظوں میں ہم قرآن کی آئیڈیالوجیکل تفسیر نہیں کرتے بلکہ ہم قرآن کی کشکولی تفسیر کرتے ہیں جبکہ قرآن انسانوں کے لئے آئیڈیالوجی کا منبع ہے معدنِ آئیڈیالوجی ہے، خود قرآن آئیڈیالوجی نہیں ہے بلکہ آئیڈیالوجی کی معدن، ذخیرہ وخزانہ ہے جس سے انسان کے لئے آئیڈیالوجی نکلتی ہے یعنی ایک منظم نظامِ حیات فکری، جس کے اندر انسان کی زندگی کی تمام ضروریات ایک خاص ترتیب، نظم وربط کے ساتھ موجود ہوں اور قابلِ عمل ہو، آئیڈیالوجی بشریت کے کاروان کے لئے ایک راستہ ہے جو ہموار راستہ ہے اور جس کی منزلیں، رخ، ہدف، جہت، سرعت ورفتار، فرائض اور ذمہ داریاں معین ومشخص ہیں اور آئیڈیالوجی یعنی وہ محرک ونظریہ جو انسان کو اس راہ پر حرکت کرنے کے لئے تیار کرتا ہے، آگے

بڑھتا ہے۔قرآن آئیڈیالوجی کا منبع ہے، ہم آئیڈیالوجی کے لئے لفظ مکتب استعمال کریں گے،مکتب کے کئی معانی و اصطلاحات ہیں، ہماری گفتگو میں جب بھی لفظ مکتب استعمال ہوگا تو اس سے مراد آئیڈیالوجی ہے اور آئیڈیالوجی سے مراد یہی مفاہیم ہیں جو عرض کیے ہیں یعنی زندگی کا ایک منظّم نظام حیات جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہو، ہدایت کا ایسا ہموار راستہ جس میں ہر چیز معین و مشخص ہو، جس میں نظریہ موجود ہو، ہدف موجود ہو، راہ موجود ہو، راہ کو طے کرنے کے لئے ضابطے موجود ہوں، ذمہ داریاں معین و مشخص ہوں، ہر چیز اس کے اندر طے شدہ و معین ہو اس معین نظام کو ہم آئیڈیالوجی کہیں گے۔ہم اگر قرآن کی مکتبی تفسیر کریں یعنی اس قرآن کو مکتب بشر کے طور پر لیں تو پھر ان اصطلاحات کا معنٰی کچھ اور ہو جاتا ہے، اگر غیر مکتبی نگاہ سے قرآن کو دیکھیں مثلاً ہماری یہی رائج نگاہ جو ابھی ہے کہ جب ماہِ رمضان آجائے تو قرآن پڑھا جائے، کیوں پڑھا جائے؟ اس لئے کہ ثواب ہوتا ہے، خوب اس صورت میں انسان ان اصطلاحات سے مکتب و آئیڈیالوجی استفادہ نہیں کرتا بلکہ انسان کو صرف ثواب ملتا ہے۔لہٰذا ''مفلحون'' کا ایک مکتبی معنٰی ہے اور ایک غیر مکتبی معنٰی ہے، غیر مکتبی معنٰی جو اس وقت ترجموں میں، تفاسیر میں موجود ہے، مفلحون یعنی کامیاب، جو بھی کام کرو تم کامیاب سمجھے جاؤ گے لیکن مکتبی طور پر اگر دیکھیں تو مفلحون ایک اجتماعی حالت کا نام ہے، ہر قوم مفلحون نہیں ہے، آج ہم مفلحون نہیں ہیں، ایک ویران معاشرہ، ایک تباہ معاشرہ، ایک بے نظم معاشرہ، بے ترتیب معاشرہ، ہرج و مرج کا شکار معاشرہ، بے ہدف معاشرہ جس کے اندر کچھ بھی نہ ہو اور ریوڑ کی طرح رہ رہا ہو اور خوش ہو کہ ہم مفلحون میں سے ہیں۔جب قرآن پڑھتے ہیں اور اس میں چند صفات آتی ہیں کہ جو روزہ رکھتا ہے، جو نماز پڑھتا ہے وہ مفلحون میں سے ہے تو اس سے ہم بھی خوش ہوتے ہیں کہ پس ہم بھی مفلحون میں سے ہیں، نہ بلکہ دیکھیں کہ یہ اصطلاح جو قرآن استعمال کر رہا ہے یہ عیناً انہیں اصطلاحات کی طرح ہے جو ہم روزمرہ زندگی میں اپنے لئے، اپنے رائج نظام کے لئے استعمال کرتے ہیں، مثلاً ہم دو یا تین اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں ترقی یافتہ ممالک، ترقی پذیر ممالک اور غیر ترقی یافتہ ممالک، یہ تین اصطلاحیں ہم روزمرہ سنتے ہیں اور استعمال بھی کرتے ہیں، اب ترقی یافتہ ممالک کن کو کہا جاتا ہے؟ ترقی یافتہ ممالک ایک خاص معاشرتی حالت کا نام ہے یعنی جو علمی طور پر، ٹیکنالوجی کے لحاظ سے، نظام کے لحاظ سے، حکومت کے لحاظ سے، معاشرتی لحاظ سے، ہر حوالے سے اس نکتے پر جو پہنچ چکے ہوں اس کو ترقی یافتہ ممالک کہتے ہیں اس وقت یہ اصطلاح دنیوی ممالک کے لئے ہے سات آٹھ ممالک کے لئے ہے کہ یہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک ہیں اور ایک بڑی تعداد کو ترقی پذیر ممالک میں شمار کیا جاتا ہے وہ ترقی یافتہ ممالک نہیں ہیں کیونکہ ابھی یہ ممالک اس نکتے پہ نہیں پہنچے لیکن ادھر جانے کی تگ ودو میں ہیں، کوشش میں ہیں، انہوں نے اس طرف رخ کیا ہوا ہے لہٰذا یہ ترقی پذیر ممالک ہیں اور وہ ممالک جن کا ادھر کوئی رخ و کوئی رجحان ہی نہیں ہے ان کو غیر ترقی یافتہ ممالک یا تیسری دنیا کہا جاتا ہے، فقیر ممالک، جن کے اندر ترقی کی طرف کوئی قدم اٹھ بھی نہیں رہا، یہ اصطلاحیں ترقی یافتہ، ترقی پذیر و غیر ترقی یافتہ ایک خاص معانی کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

قرآن میں ترقی یافتہ معاشرہ

قرآن مجید نے بھی استعمال کی ہیں قرآن کی نگاہ میں ترقی یافتہ سوسائٹی کو ''مفلحون'' کہا جاتا ہے، البتہ اس کا معیار یہ نہیں ہے جس معنٰی میں مغربی ممالک کے متعلق ترقی یافتہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ ترقی یافتہ کا معیار و میزان الگ رکھتے ہیں، جس میں مثلاً انڈسٹری و سیاسی نظام اس سطح پہ پہنچ چکا ہو یا اس میں حقوق اس سطح کے موجود ہوں، ان کو ترقی یافتہ ممالک کہتے ہیں۔قرآن کی اپنی خاص اصطلاح ہے ہم مفلحون کا اگر مکتبی معنٰی کریں یعنی ترقی یافتہ معاشرہ۔قرآن کی اصطلاح اور نظام کے تحت ترقی یافتہ معاشرہ کون سا ہے؟ ایسا ترقی یافتہ معاشرہ کہیں بھی نہیں ہے یعنی کہیں بھی مفلحون

> **اس نظام کا جو کمال یافتہ حصہ ہے وہ قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔ ہدایتِ انسانی یا ہدایتِ الٰہی کا جو فراموش شدہ پہلو ہے وہ امت ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا اس نظام کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن ہم، ہم سے مراد مفسرین، مترجمین، قارئین و قرآن سے سروکار رکھنے والے ان آیات سے بہت سرسری گزر جاتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے ایک خاص ذائقے کے مطابق ان آیات سے گزر جاتا ہے**

نہیں ہیں۔ روزے رکھ رہے ہیں مگر مفلحون نہیں ہیں، نمازیں پڑھ رہے ہیں مفلحون نہیں ہیں، عزاداریاں کر رہے ہیں مفلحون نہیں ہیں چونکہ مفلحون قرآن کی ایک خاص اصطلاح ہے، ترقی یافتہ سوسائٹی از نظرِ قرآن، خداوند تبارک وتعالی کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق، ترقی یافتہ ہونے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے اس میں جہاں اور بہت ساری چیزوں کی ضرورت ہے وہاں پر ایک خاص اجتماعی نظام کی بھی ضرورت ہے ترقی یافتہ یا مفلحون بننے کے لئے خاص اجتماعی نظام چاہیئے ۔ مثلاً اس وقت ہم دنیا کے اندر دیکھیں تو ہر ملک میں اجتماعی نظام موجود ہے، کہیں قبائلی اجتماعی نظام موجود ہے، کہیں قدیم سنتی، کہیں مثلاً ماڈرن اجتماعی نظام موجود ہے، کہیں نیم قبائلی یہ مختلف اجتماعی نظام ہیں جو اس وقت موجود ہیں۔ ہم جس معاشرے کے اندر رہ رہے ہیں اس کا اجتماعی نظام کون سا ہے، کس اجتماعی نظام کے تحت ہم زندگی بسر کر رہے ہیں؟ اب ہمارا جو بھی اجتماعی نظام ہو، مگر قرآن اپنا ایک خاص اجتماعی نظام لے کر آیا ہے کہ یہ اجتماعی نظام تم اپنے اوپر لاگو کرو، اس کی طرف بڑھو، اس کو سمجھو، قرآن کے اجتماعی نظام کا نام امت ہے لہٰذا خداوند تبارک وتعالی کا حکم ہے کہ

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ"

تم امت بنو یعنی اس مقام تک پہنچو، تم امت تک پہنچو، پھر اس کے بعد ہے کہ

"وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"

تمہیں اس وقت ترقی یافتہ سوسائٹی شمار کیا جائے گا جب تم خدا کی نگاہ میں اجتماعی نظام کے لحاظ سے امت بن جاؤ البتہ ساتھ دوسرے نظام بھی ہوں گے لیکن ابھی چونکہ ہمارے مدِ نظر، زیرِ بحث نظام دین کا یا قرآن کا اجتماعی نظام ہے جسے ہم امت کہتے ہیں۔

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ"

امت، اگرچہ عربی زبان میں لغت کے لحاظ سے اس لفظ کا استعمال قرآن سے پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے لیکن قرآن نے آکر اس لفظِ امت کو خاص معانی کے لئے استعمال کیا ہے اور امت سے ہی مشتق دوسرا لفظ امام وامت ہے یعنی پورا نظامِ الٰہی، امام وامت کے ذریعے سے ہی تکمیل ہوتا ہے اب امت کے بعد جو مرحلہ ہے یا امت کی تکمیل کا جو مرحلہ ہے وہ امامت ہے کہ جب انسان امت کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں یا سوسائٹی جب امت کے درجے پہ پہنچ جاتی ہے وفیض یاب ہوجاتی ہے اس وقت اس کو ایک اور حلقے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نام امامت ہے۔ امامت جب امت کے ساتھ منسلک ہوجائے، جڑ جائے تو اس وقت یہ نظامِ الٰہی مکمل طور پر تشکیل پاتا ہے اور یہاں سے پھر انسان کا سفرِ تکاملی شروع ہوتا ہے یعنی اس وقت مقصدِ خلقت، نیابت، مقامِ خلافت کی طرف وخلافتِ الٰہی کی جانب انسان کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

اب امت کے مقابلے میں بہت سارے مفاہیم ہیں کہ ایک ایک کر کے ہم ان کا جائزہ لیں گے یہ دیکھنے کے لئے کہ اس وقت ہم کس عنوان کے تحت درج ہوتے ہیں چونکہ یقیناً اس وقت ہم امت نہیں ہیں، کوئی بھی اپنے بارے میں یہ تصور نہ کرے کہ اس وقت زمین پر بسنے والے مسلمان امت ہیں، قرآن کے معنٰی میں یہ امت نہیں ہیں بلکہ امت کے علاوہ سب کچھ ہیں۔ ان مفاہیم کا مشاہدہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ موجودہ سوسائٹی پر ان میں سے کون سا عنوان فٹ آتا ہے اور اس عنوان سے نکل کر امت تک جانے کے لئے کون سا سفر طے کرنا ضروری ہے اور اس کے لئے ہمیں کیا کچھ درکار ہے؟

رسول ﷺ امت کی تلاش میں

خداوند تبارک وتعالی نے پیغمبر اکرم ﷺ کو جس سوسائٹی کے اندر مبعوث فرمایا اس میں رسول اللہ ﷺ نے جو سب سے اہم ترین ونمایاں ترین کام انجام دیا وہ یہی امت سازی تھی، امت بنائی یعنی وہ معاشرہ جو پہلے کسی اور عنوان سے درج تھا جس کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے اس جاہلیت کی سوسائٹی کو بدل کر امت میں بدل دیا اور امت کا قالب مدینے میں وجود میں

ہم قرآن کی طرف ایک مقدس اور ثواب آور کتاب کے طور پر رجوع کرتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھنے سے انسان کو تبرک و تقدس حاصل ہوتا ہے اور ہم نے تقدس اور تبرک کا معنیٰ بھی خود سے کیا ہوا ہے، ہم تقدس کو بھی ایک کرنٹ سمجھتے ہیں جو نہی اس کو ٹچ کریں تو وہ تقدس ہمارے اندر بھی منتقل ہو جاتا ہے

> قرآن مجید کے بارے میں جو سب سے زیادہ کام ہوا ہے وہ قرآن کو غیر شعوری، غیر محسوس طور پر قرآن کو اپنے معنٰی سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کا نام قرآن فہمی رکھا گیا ہے، بلکہ قرآن فہمی یہ ہے کہ قرآن جیسا ہے ویسا رہے ہم اپنے ذہن بدلیں۔

آیا، مکہ میں امت نہیں بن سکی اس لئے مکہ کو ترک کرنے کا حکم دیا گیا، مکہ کی سرزمین، مکہ کے لوگ، مکہ کی ذہنیت، مکی تصور، مکی سوچ یعنی قریش کی جو حالت تھی اس وقت وہ معاشرہ امت سازی کے لئے موزوں نہیں تھا اسی لئے فوراً حکم دیا کہ آپؐ مدینہ چلے جائیں اور حضرتؐ جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں سے ہجرت کے بعد رسمی طور پر امت کا آغاز ہوا۔ آج یہ ہر مسلمان کا ذہنی کھٹکا ہے اور اس مسئلے کو مسلمانوں کی ترقی کے لئے اٹھایا بھی جا رہا ہے کہ مسلمان دوسری قوموں کے ہم قدم ہوں، ان کے ہم پلہ بنیں، ان کی طرح ترقی کریں، ان کی سطح پہ آ جائیں، یہ کھٹکا، یہ درد تو سب کے اندر ہے لیکن اس درد کا درماں کم لوگوں کے پاس ہے عموماً مسلمانوں کی ارتقاء کا و مسلمانوں کے اس موجودہ زبوں حالی سے نکلنے کا غلط طریقہ بتاتے ہیں۔ یہ بات ہم سب کے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے کہ تنہا طریقہ مسلمانوں کی ترقی کا یہ ہے کہ یہی رائج علوم پڑھیں، انگلش پڑھیں، ٹیکنالوجی میں ترقی کریں تا کہ مغربی دنیا کے رقیب بنیں، مغربی دنیا کے ہم پلہ ہوں یا کم از کم اس کی غلامی سے باہر آئیں تو اس کا تنہا طریقہ یہ ہے کہ وہ علم حاصل کریں، علم سے مراد بھی یہ سائنسز ہیں، ٹیکنالوجی، نیچرل سائنسز، ان میں ترقی کریں۔ ان سب کے نزدیک، دیندار، عالم، غیر عالم، پڑھا لکھا، غیر پڑھا لکھا، ہر انسان، فوراً اس کا ذہن یہاں پر آ جاتا ہے چونکہ اس کو یہی سکھایا گیا ہے کہ مغرب نے ان علوم کے ذریعے سے ترقی کی ہے لہٰذا ہم بھی ان علوم کے ذریعے سے ہی ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ وہ غلط ایڈریس ہے کہ اگر مسلمان ہزاروں سال بھی اس میدان میں لگے رہیں تو یہ اس موجودہ حالت سے باہر نہیں آ سکتے۔ یقیناً باہر نہیں آ سکتے چونکہ ابھی تک نہیں آ سکے۔ مغرب کی ترقی کو دیکھیں تو مغربی ترقی کو ڈھائی سو سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اس سے پہلے ان کا یہ سفر شروع ہوا تھا لیکن اس موجودہ ترقی کا آغاز ڈھائی سو سال پہلے شروع ہوا اور آج وہ اوج پر ہیں، آج مسلمان ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، ہر چیز و ہر شئے میں ان کے رہینِ منت ہیں۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ یہ راستہ طے کر کے اس زبوں حالی سے باہر آئیں تو یہ نہ ختم ہونے والا ایک پیچیدہ راستہ ہے جو مسلمانوں کے سامنے رکھا گیا ہے جس پر صرف حیرت، سرگردانی، کنفیوژن کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ علوم مسلمانوں کی ضرورت نہیں ہیں نہ، یہ اشد ضرورت ہیں ان علوم میں ترقی ضروری ہے بات یہ نہیں ہو رہی کہ یہ ترقی ضروری ہے یا نہیں بلکہ بات یہ ہو رہی ہے کہ موجودہ حالت سے باہر لانے کے لئے یہ کافی ہیں یا کافی نہیں ہیں، ان کی ترقی ضروری ہے لیکن موجودہ حالت سے باہر لانے کے لئے یہ کافی نہیں ہے۔ مثلاً اس وقت اگر ہم ایرانی سوسائٹی کو دیکھیں جو ایک دینی معاشرہ ہے اور دینی حکومت و دینی نظام ہے وہاں پر کسی حد تک نظامِ امت و نظامِ امامت نافذ ہے۔ تمام اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ ٹیکنالوجی پر اسرار اس وقت صرف ایران کا ہے یعنی علماء کی جو حکومت ہے، جن کو کہا جاتا ہے کہ یہ ترقی کے خلاف ہیں یا علوم کے خلاف ہیں یا یہ سائنسز کے خلاف ہیں اس وقت پوری دنیا میں کوئی نظام اتنا اسرار نہیں کرتا سائنس پر جتنا ایران کا سسٹم کر رہا ہے لیکن ایران کا نظام ٹیکنالوجی کی بنیاد پر یہاں تک نہیں پہنچا۔ اجتماعی نظام اور ہوتا ہے، اجتماعی نظام کے لئے پھر جو ضروریات ہیں ان میں ٹیکنالوجی آتی ہے۔ اگر سارے مسلمان مل کر دنیا کے عظیم سائنسدان بن جائیں تو بھی اس موجودہ ذلت سے باہر نہیں آ سکتے چونکہ مسلمانوں کو ذلت و غلامی سے باہر لانا سائنسدانوں کے بس میں ہی نہیں ہے، اصلاً یہ سائنس کا موضوع ہی نہیں ہے۔ اُس وقت ٹیکنالوجی و سائنس ہمیں کام دیتی ہے کہ جب سوسائٹی اس درجے پہ پہنچ جائے جہاں قرآن اس کو چاہتا ہے یعنی وہ اجتماعی ڈھانچہ تشکیل پائے، اجتماعی ڈھانچہ جب آ جائے تو اب اس کو ان ساری چیزوں کی ضرورت ہے۔ جب یہ چیزیں اس کے پاس ہوں گی تو اس وقت یہ تقویت، طاقت و غلبے کا باعث بنیں گی لیکن جب تک وہ مطلوبہ حالت حاصل نہیں ہوتی اُس وقت یہ چیزیں اِس کے لئے کسی کام کی نہیں ہیں جیسا کہ ابھی نمونے موجود ہیں مثلاً ہم پاکستان ہی کو دیکھ لیں، اسلامی دنیا میں ایٹمی ٹیکنالوجی سب سے پہلے پاکستان نے حاصل کی، جبکہ

پاکستان اس وقت اسلامی دنیا کا ناکام ترین ملک ہے، اجتماعی نظام کے لحاظ سے بالکل فیل ملک ہے، ٹیکنالوجی کے لحاظ سے سب سے آگے ہے، وہ ٹیکنالوجی جس کے حصول کے لئے ایران ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، وہی ٹیکنالوجی مدتوں پہلے پاکستان حاصل کر چکا ہے اور اب یہ پرانی وبوسیدہ ہو چکی ہے، اس کو زنگ لگ رہا ہے، یہ ٹیکنالوجی پاکستان کے کسی کام نہیں آئی، ورنہ اب تک تو ہم پلہ ہو جانا چاہئیے تھا یا کم از کم اسلامی دنیا میں پاکستان ترقی کے میدان میں سب سے آگے ہونا چاہئیے تھا لیکن پاکستان کا اجتماعی نظام

> **ہماری ذہنیتیں قرآن کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، ہم قرآن کے معانی کو سمجھنے کے لئے یہ ذہن میں رکھیں کہ قرآن منشورِ ہدایت ہے، قرآن کو نہ بدلیں چونکہ قرآن انسان کی ہدایت کے لئے اللہ کا منشور ہے، منشور ہدایتِ بشر ہے۔ ہم قرآن کو اس طرح سے پڑھیں جس طرح منشور پڑھا جاتا ہے مثلاً ہر ملک کا اس وقت ایک منشور ہے، اس کو کس طرح پڑھا جاتا ہے اس کو پڑھنے کے لئے کس ذہنیت کی ضرورت ہے**

اتنا کھوکھلا، ناقص و اتنا خراب ہے کہ اگر تمام موجودہ زمانے کی ٹیکنالوجی سب سے عالی ترین شکل میں بھی پاکستان میں آجائے تو بھی یہ ٹیکنالوجیز اس کو موجودہ حالت سے باہر نہیں لاسکتیں بلکہ خود وہ ٹیکنالوجیز بھی اس تخمسے میں، دلدل میں گھر کے مشکل میں اضافہ کر دیں گی جس طرح ایٹمی ٹیکنالوجی ایک مشکل بن گئی ہے، ایک دردِ سر بن گیا ہے اس کو چوروں سے بچانے کے لئے ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ اس کو کیسے محفوظ کریں کہ ہمارا بم کہیں چور نہ اٹھا کر لے جائیں یا مثلاً سائنسدان کو اغواء کر کے نہ لے جائیں۔ وہ چیز جو قرآن مجید نے متعارف کروائی ہے جس سے ہم دور ہوئے ہیں اور یہ اشتباہ اسلام شناسی میں ہوا ہے، دین شناسی میں غلطی ہوئی ہے، دین غلط سمجھا گیا ہے، اشتباہ سمجھا گیا ہے، غفلت ہوئی ہے وہ غفلت پھر دوسرے عملی شعبوں کے اندر سرایت کر گئی ہے۔ البتہ اتنی غفلت بھی نہیں ہوئی بلکہ یہ کام عمداً ہوا ہے یعنی قرآنی نظام سے دوری عمداً ہوئی ہے۔

ہم سارے کام کی نسبت غفلت کی طرف نہیں دے سکتے بلکہ یہ کام عمداً ہوا ہے کہ مسلمانوں کے اوپر جو طبقات و خاندان آتے گئے وہ حاکم ہوتے گئے جو خاندان جیسے بنو امیہ و بنو امیہ کے بعد ایک ایک کر کے ڈھیرے ڈھیرے انہوں نے جان بوجھ کر قرآنی نظام سے مسلمانوں کو دور کیا چونکہ قرآنی نظام کی روشنی میں ان کا خاندان حکومت نہیں کر سکتا تھا، ملوکیت نہیں پنپ سکتی تھی اور خلافت کا وہ معنٰی جو ان کے مدنظر تھا وہ رائج نہیں ہو سکتا تھا اس لئے انہوں نے جان بوجھ کر ان کو اپنے منشور سے دور کیا یعنی ایسے مدرسے بنائے، ایسے علماء تربیت کیے، ایسی اکیڈمیاں بنائیں جو آکر اسلام کی ایسی تشریح کریں جس میں اسلامی نظام کی بات نہ ہو اور یہی ملوکیت یا جو نظام ہے اس کو اسلامی رنگ دے دیا جائے کہ اسلام بھی اسی کو تسلیم وقبول کرتا ہے لہٰذا سارا کام غفلت کا نتیجہ نہیں ہے فقط ایک گروہ غفلت کا شکار ہوا ہے۔

امت بننے کا حکم!

آج مسلمانوں کو اس عصر میں بیدار ہونے، جاگنے اور قرآن کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، قرآن کی طرف رجوع کرتے ہی انسان کا اس مقدس کتاب سے سب سے پہلا مطالبہ یہی ہو کہ اگر قرآن ہدایت کا منشور ہے تو ہدایت کے منشور میں انسان کے لئے نظامِ اجتماعی کیا ہے؟ اب قرآن خود دعوت دے رہا ہے کہ تم امت بنو و درحقیقت تمام انبیاءؑ امت سازی کے لئے آئے تا کہ انسانوں کو امت کے قالب میں ڈھالیں، ان کو امت میں تبدیل کریں اور سب سے زیادہ موفقیت و کامیابی کے ساتھ یہ عمل خاتم الانبیاء ﷺ نے انجام دیا ہے کہ انسانوں کو امت کے قالب میں تبدیل کیا ہے۔ آج اس قدر غیر اسلامی نمونے و غیر اسلامی ماڈل اسلام بن کر ہمارے ذہنوں میں راسخ ہو چکے ہیں کہ ہم امت کو خلافِ اسلام سمجھتے ہیں، امت کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں، اتنے راسخ ہو گئے ہیں، ہم غیر اسلامی شکلوں و غیر اسلامی سانچوں میں اتنے ڈھل گئے ہیں کہ ہم نے ان کو عینِ اسلام قرار دیا ہے اور جو قرآن کا واضح عنوان ہے اور قرآن خود کہہ رہا ہے کہ

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ"

اب اس طرف نہ کوئی عالم، نہ کوئی غیر عالم، نہ مذہبی، نہ متدین، نہ انقلابی اور نہ غیر انقلابی کوئی نہیں سوچتا، اصلاً امت کا نام نہیں لیتے، ہم نے غیر اسلامی مفاہیم کو اسلام بنا کے اپنے گلے میں لٹکا لیا اور اس کو بت بنا کر اسی کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ امت سازی کے لئے بت شکنی ضروری ہے، ظاہر ہے

کہ جب تک بت ختم نہ ہوں اس وقت تک امت کا قالب بنتا ہی نہیں ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو لکڑی اور پتھر کی مورتیاں تھیں جنہوں نے انسانوں کو اپنے گرد جمع کیا ہوا تھا اور انہیں امت بننے نہیں دے رہے تھے لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے وہ بت توڑے، ان لات ومنات کے چنگل سے بشریت کو آزاد کیا لیکن آج پھر انسان دوبارہ انہیں لات ومنات کا اسیر ہے، آج پھر اسی جبل کا اسیر ہے۔ یہ لات ومنات جب تک موجود ہیں، بشر جب تک ان کے چنگل سے آزاد نہیں ہوتا اس وقت تک امتِ اسلامی کی طرف رجوع نہیں کر سکتا۔ وہی عمل جو رسول اللہ ﷺ نے بعد از بعثت انجام دیا اس وقت امتِ اسلامی کو اُس بعثتِ مجدد کی ضرورت ہے لیکن پہلے ہمیں اس نظامِ امت کو سمجھنا ہوگا۔ قرآن مجید میں بہت ساری جگہوں پر امت کا تذکرہ آیا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴ میں حکم ہے کہ

"وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ"

تم امت بنو، واجب ہے، حکم ہے۔ امر، وجوب پر دلالت کرتا ہے طالب علموں کی زبان میں، اصطلاح میں، جہاں صیغہ امر استعمال ہوتا ہے قرآنِ مجید میں وہ وجوب پر دلالت کرتا ہے، تم پر یہ کام کرنا واجب ہے۔

"وَلۡتَكُنۡ"

تم بنو یعنی تمہیں امت ہونا چاہیئے!

پھر اس کے بعد آگے امت کے اعمال ہیں کہ تم نے امت بن کر کرنا کیا ہے؟

امت، جیسے اشارہ کیا کہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا اصلی مادہ "اُم" ہے۔ "اُم" قصد کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے، اُم سے مراد یعنی قصد، اس سے بہت سارے الفاظ اور بھی نکلتے ہیں، ام، امہات، آئمہ، امام، امت، امامت، یہ سب اسی ایک ہی لفظ ام سے نکلے ہیں۔ ام یعنی اصل میں یہاں دو میم ہیں، میم میم میں ادغام ہو کر ام ہے، یہ بھی البتہ اہلِ لغت میں ایک بحث ہے کہ آیا یہ لفظ جامد ہے یا مشتق ہے یعنی مصدر اس کا بنتا ہے اور اس سے دیگر صیغے مشتق ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے یہ ایک الگ بحث ہے کہ ابھی ہم اس میں نہیں پڑتے کہ یہ عام لوگوں کے فائدے کی بات نہیں ہے۔ اب جو مسلّم ہے وہ یہ کہ مشتق ہو یا جامد ہو بالآخر اصل لفظ ام ہے جس سے لفظِ امت نکلا ہے۔ ام کے اصلی معانی قصد کے ہیں۔ قصد، ارادہ کرنا، کسی چیز کا قصد کرنا، عرب اس کو ام کہتے ہیں۔ امّ یعنی قَصَدَ۔ انسان جس چیز کا قصد کر لے، مقصود واقع ہو وہ لفظ اُم کے درجے میں آتا ہے۔ اب بعض نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ام کا معنٰی اصل ہے اسی لیے عربی زبان میں ماں کو، مادر کو ام کہا جاتا ہے، اردو میں جسے ماں کہتے ہیں، عرب اس کو ام کہتے ہیں۔ اب آیا اصل ہونے کی وجہ سے اس کو قصد کہا جاتا ہے یا قصد کی وجہ سے وہ اصل ہے؟ یہ لغوی اعتبار سے ایک بحث ہے کہ ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ لفظی طور پر امت کے معانی و مفاہیم کیا ہیں؟

﴿جاری ہے......﴾

بقیہ وطن کی فکر کر ناداں

طاغوتی بھول بھلیوں سے نکلیں اور مسائل کو سمجھیں

عزیزان! ہم یہ کام کر سکتے ہیں لیکن جب اُن بھول بھلیوں سے نکلیں اور ان مسائل کو سمجھیں، توجہ کریں کہ خداوند تبارک وتعالیٰ انشاء اللہ تمام اُمت مسلمہ کو ان ظالمین کے شر سے محفوظ فرمائے انشاء اللہ اور بارگاہِ الٰہی میں دُعا ہے کہ پروردگارا! تمام اُمت اسلامیہ کے اندر اتحاد واتفاق برقرار فرما، ان ظالمین کو ظلم سمیت نیست ونابود فرما، امریکہ اور اسرائیل کا خاتمہ فرما اور تمام مظلوم ملتّوں بالخصوص ملت مظلومِ فلسطین، کشمیر اور مظلومینِ بحرین کو نجات عطا فرما، آلِ خلیفہ اور اُن کے حامیوں کو رسواء فرما اور پروردگارا! مملکت پاکستان کی حفاظت فرما، اس ملک کو دشمنوں کے شر سے محفوظ فرما۔

امت سازی (۲)

از نظر قرآن

گروہ معارف

”وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ“ (سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

خدا وند تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک اہم ترین نظام امت سازی کے لئے مقرر کیا ہے، سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ امت کیا چیز ہے؟ امت کے ارکان کیا ہیں؟ امت بننے کا راستہ وطریقہ کیا ہے؟ امت کی صفات، خصائل وعلامات کیا ہیں؟ اور انسانوں نے امت کیلئے مفاہیم، شکلیں اور تصویریں کس طرح کی بنائی ہیں۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی ہدایت دوطرح سے کی ہے اوّل انفرادی طور پر اور دوّم اجتماعی طور پر۔

انفرادی و اجتماعی ھدایت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی انفرادی ہدایت کے لئے یہ مقام مقرر کیا ہے کہ وہ مقامِ ایمان پہ فائز ہو، مومن ومتقی بنیں۔ اسی طرح سے اجتماعی ہدایت کے لئے جو مقام مقرر کیا ہے وہ امت کا ہے۔ یعنی انفرادی طور پر مومن بنیں اور اجتماعی طور پر امت بنیں۔ اگر انسان ان دو حالتوں میں نہیں پہنچ سکتا تو وہ ہدایت یافتہ اور فلاح یافتہ انسان نہیں ہے۔ انفرادی ہدایت کا موضوع بقدرِ کافی کتابوں، تفاسیر اور خطبات میں زیرِ بحث آتا ہے، انفرادی ہدایت کو کسی حد تک کھولا گیا ہے اور یہ واضح ہے لیکن اجتماعی حالت مغفول ومتروک اور فراموش شدہ ہے، اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں آج مسلمانوں کے اندر انفرادی طور پر مومنین نظر آجاتے ہیں جو درجۂ ایمان پر فائز ہوں۔ اگر دیکھا جائے تو ہمارے ہاں سب نے اپنا نام مومن رکھا ہوا ہے لیکن قرآن کی اصطلاح میں مومن سے کیا مراد ہے؟ ”مومنِ قرآنی“ کی تعریف وحدود خود قرآن مجید نے مقرر کی ہیں کہ مومن کس کو کہتے ہیں؟ اس سطح پہ اگر ہم دیکھیں تو انفرادی طور پر بعض اوقات انسان درجۂ ایمان پر فائز ہوتا ہے لیکن اجتماعی طور پر امت ہونے سے ابھی تک محروم ہے۔

امت سازی کا آغاز

امت سازی کا کام آغازِ اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا۔ جتنی توفیقات اسلام اور مسلمانوں کو نصیب ہوئیں وہ ساری امت ہونے کا نتیجہ تھیں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور وہ بھی اسی وجہ سے شروع ہوا کہ مسلمان امت نہیں رہے اور امت سے ہٹ کر دیگر شکلیں اختیار کیں اور آج بھی سوائے امت کے ہر شکل میں موجود ہیں اور یہ موضوع ہی مسلمانوں کی تعلیمات میں سرّے سے غائب ہے۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ہم اگر دینی مدارس کے اسلامی سلیبس میں ہی جستجو کریں مثلاً

امت سازی کا کام آغاز اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا۔ جتنی توفیقات اسلام اور مسلمانوں کو نصیب ہوئیں وہ ساری امت ہونے کا نتیجہ تھیں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور وہ بھی اسی وجہ سے شروع ہوا کہ مسلمان امت نہیں رہے اور امت سے ہٹ کر دیگر شکلیں اختیار کیں اور آج بھی سوائے امت کے ہر شکل میں موجود ہیں

علمِ کلام، تفسیر، فقہ اور دیگر علومِ اسلامی میں سے کسی بھی علم میں امت کا موضوع زیرِ بحث نظر نہیں آرہا۔ علومِ حدیث میں امت کی بحث آتی ہے۔

قرآن و حدیث کا ھدف

قرآن وحدیث کا بڑا حصہ امت سازی سے مربوط ہے۔ انفرادی طور پر متقی انسان بنانے کا ہدف انسان کی تربیت کرنا ہے اور اجتماعی ہدف امت بنانا ہے یعنی یہ سارے مومنین ومتقین ایک اجتماعی ڈھانچے کے اندر منسلک و مرتبط ہوجائیں جس کا نام امت ہے اور حتیٰ اس حد تک تعبیریں موجود ہیں کہ جو امت سے باہر ہے اور امت کی حالت میں نہیں ہے اسے قرآن اور بعض روایات کی تعبیرات میں دائرۂ دین سے خارج سمجھا گیا ہے۔ انفرادی طور پر مومن ومتقی ہوجانا کافی نہیں بلکہ امت کا جزو ہونا ضروری ولازمی قرار دیا گیا ہے اور جو امت سے باہر ہوا اُسے ہلاک وگمراہ قرار دیا گیا ہے۔

گمراھی کی قسمیں

گمراہی دو طرح کی ہوتی ہے، اوّل یہ کہ آشکار او بیّن گمراہی، یہ وہ گمراہی ہے جس کے بارے میں انسان کو علم ہوتا ہے کہ میں گمراہ ہوں اور گمراہی کی دوسری قسم وہ ہے کہ جس میں انسان کو خود معلوم نہیں ہوتا اور متوجہ نہیں ہوتا کہ میں گمراہ ہوں اور بدترین گمراہی وہ ہے کہ جس میں انسان گمراہ ہوا اور اسے یہ علم ہی نہ ہو کہ میں گمراہ ہوں۔ جس طرح جاہل کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں، جاہلِ بسیط یا جاہلِ مطلق اور جاہلِ مرکب۔ جاہلِ مطلق وہ انسان ہوتا ہے جو جاہل ہے لیکن وہ اپنی جہالت سے آگاہ ہے کہ میں جاہل ہوں یہ جاہلِ بسیط بھی کہلاتا ہے یہ انسان ہدایت پاسکتا ہے، علم حاصل کرسکتا ہے، روشنی حاصل کرسکتا ہے چونکہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے لیکن یہ جہالت سے آگاہ ہے اسے یہ پتہ ہے کہ میں جاہل ہوں لہٰذا یہ جلدی حقائق تک پہنچ جائے گا اور دوسرا جاہل وہ ہے جو حقیقت کو بھی نہیں جانتا اور جہالت کو بھی نہیں جانتا اور یہ گمان کرتا ہے کہ میں آگاہ ہوں درحالیکہ اسے آگاہی نہیں ہے اور انسانوں کی اکثریت اسی وجہ سے ہلاک ہوجاتی ہے کیوں کہ یہ جہلائے مرکب ہیں۔ اسی طرح ضلالتِ بسیط ہے، ضلالتِ بسیط یہ ہے کہ انسان گمراہ ہے لیکن اپنی گمراہی کا علم ہو کہ میں راستہ گم کر بیٹھا ہوں اور مرکب گمراہی وہ ہے کہ انسان گمراہ ہو، ہدایت سے دور ہوا اور اپنی گمراہی سے بھی ناآشنا ہوا اور متوجہ نہ ہو۔ اکثریت اس قسم کی گمراہی میں مبتلا ہیں اور یہ عموماً کہا جاتا ہے کہ جاہلِ مرکب کو آگاہ کرنا اور ہدایت کرنا دشوار ہے جبکہ جاہلِ بسیط وگمراہ بسیط کو ہدایت کرنا آسان ہے۔

قرآن کی نظر میں اصلی راستہ امت ھے

اگر ہم قرآن میں روایات کا مضمون دیکھیں تو امت سے دوری کو گمراہی اور ہلاکت کہا گیا ہے جبکہ آج مسلمان امت کے وجود سے دور ہیں اور متوجہ نہیں ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہماری اصل پسماندگی اور زوال کا سبب کیا ہے؟ مسلمان امت کی متبادل راہوں کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں، متبادل راستوں پر زیادہ اسرار اور تاکید کرتے ہیں اور اس طرح تمام کوششیں وتوانائیاں بے نتیجہ، بے ہدف اور بے مقصد راستوں پر صرف ہورہی ہیں جن کے بارے میں انسان بار بار تجربہ بھی کرچکا ہے اور یقین بھی ہے کہ یہ راہیں کسی نتیجے تک نہیں پہنچاتیں لیکن پھر بھی بھیڑ چال کے تحت انسان انہی راہوں پر چل رہا ہے جبکہ اصل جادہ امت ہے۔

امت سازی انبیاءؑ و اولیاءؑ کا ھدف

امت سازی انبیا کرامؑ کا اولین ہدف ومقصد ہے، انبیاء علیہم السلام امت بنانے کے لئے ہی مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید میں خداوند تبارک وتعالیٰ کا فرمانا ہے کہ

”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ....“ (سورہ بقرہ ۲۱۳)

پہلے لوگ ایک امت تھے پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا یعنی امت کی

حالت ختم ہوئی، فرقہ واریت آ گئی، تفرقے آ گئے اور انھوں نے گروہ، قبیلے، قومیں، حزبیں اور مختلف ٹولیاں بنالیں تب خداوند تبارک وتعالیٰ نے انبیاءؑ کو مبعوث فرمایا۔ سورہ یونس آیت نمبر 19 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا......"

لوگ پہلے ایک امت تھے پھر ان میں اختلاف ہوا، پھر سورہ مبارکہ بقرہ آیت نمبر 213 میں ارشاد ہوا ہے

"....فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا...."

تب خداوند تعالیٰ نے انبیاءؑ کو مبشر ومنذر بنا کر مبعوث کیا تا کہ اس پہلی حالت پر لوگوں کو واپس لے آئیں یعنی دوبارہ امت بنائیں۔ اس تفرقے اور پراکندگی سے ان کو نکالیں اور اس قبائلی نظام اور قومیتوں سے دور کریں یعنی جن بنیادوں پر تقسیم ہو چکے تھے ان کو ختم کر کے دوبارہ امتِ واحدہ بنائیں، یہ قرآن کی رُو سے تمام انبیاءؑ کی بعثت کا اصلی مقصد ہے اور بالخصوص خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی امت سازی ہے۔

بعثِ رسولِ اکرم ﷺ مقصدِ تکمیلِ امتِ سازی

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام انبیاءؑ کی کوششیں امت سازی کے سلسلے میں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں، وہ امت جس کی بشارت تمام انبیاءؑ نے دی یا وہ امت سازی کا مرحلہ یا پراسس جو انبیاءؑ نے شروع کیا تھا وہ پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے میں آ کر تکمیل ہوا لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد پھر زوال پذیر ہوا۔ چونکہ امت سازی کا ایک مرحلہ ہے، جب امت بن جائے جب انسانی معاشرہ امت کی شکل اختیار کر لے اس کے بعد اس کی بقاء ایک اور مرحلہ ہے جس کو جاری رکھنے کے لئے انسان پر بہت سارے تقاضے، واجبات اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں تا کہ امت کا یہ ڈھانچہ باقی ومحفوظ رہے۔

امت سازی کی نابودیت کے ذمہ دار

مسلمانوں نے امت سازی کے ڈھانچے کی حفاظت نہیں کی۔ نہ صرف اس کی حفاظت نہیں کی بلکہ دو طبقوں نے اس کو نابود کیا، ایک طبقے نے جان بوجھ کر اور دوسرے نے غفلت کی وجہ سے امت کے ڈھانچے کو نابود کیا اور جاہلیت کا زمانہ لوٹ آیا، آج مسلمانوں کے اندر امت کا وجود نظر نہیں آتا بلکہ جاہلیت کے ڈھانچے ہیں، جس طرح جاہلیت کے اندر قبیلے، قومیتیں اور تقسیمات تھیں آج کل اس ماڈرن زمانے میں بھی موجود ہیں لہٰذا امت سازی قرآن کا ایک اہم و اصلی موضوع ہے یعنی قرآن انسان کو تدریجاً امت کی حد تک لے جانا چاہتا ہے، ارتقاء دینا چاہتا ہے اور جب انسان امت کے درجے پر پہنچ جائیں قرآن اس معاشرے کو "مفلحون" کہتا ہے یعنی ترقی یافتہ معاشرہ۔ قرآن کی زبان واصطلاح میں جو معاشرہ امت کی شکل اختیار کر لے وہ فلاح یافتہ معاشرہ ہے۔

اس وقت اگر ہم انسانی معاشرے کو دیکھیں تو انسانی معاشرے کے اوپر بہت سارے عناوین صادق آتے ہیں مثلاً عموماً معاشرے کے لئے سوسائٹی یا کمیونٹی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دو ٹرمز سوشیالوجی میں استعمال ہوتی ہیں اور پھر دوسری زبانوں میں اسی کا ترجمہ معاشرہ، سماج یا اس کے مترادف دیگر الفاظ میں کیا جاتا ہے، عربی اور فارسی میں اس کو جامعہ کہا جاتا ہے۔ جامعہ یعنی انسانی معاشرہ یا سماج۔

امت انسانی معاشرت کا قرآنی و الٰہی ڈھانچہ

ممکن ہے آج بہت سارے انسانی اجتماعات سماج ہوں یا بہت ساری انسانی آبادیاں سوسائٹی یا کمیونٹی ہوں لیکن امت خالص قرآنی عنوان ہے۔ قرآن سے ہٹ کر کسی اور مکتب یا مذہب کے اندر امت کا تصور نہیں ہے۔ امت کو قرآن نے انسانی اجتماع کا ایک قالب وسانچہ بنایا ہے اور امت انسانی معاشرت کا قرآنی والٰہی سانچہ ہے اس کے لئے لفظِ امت انتخاب کیا گیا ہے۔ ہمیں دو مرحلے طے کرنے ہیں، ایک اس اصطلاح سے صحیح آشنا ہونا ہے کہ امت کیا چیز ہوتی ہے؟ اور دوسرا اس بات سے آگاہ ہونا ہے کہ قرآن جس

> **گمراہی دو طرح کی ہوتی ہے، اول یہ کہ آشکار او بیّن گمراہی، یہ وہ گمراہی ہے جس کے بارے میں انسان کو علم ہوتا ہے کہ میں گمراہ ہوں او رگمراہی کی دوسری قسم وہ ہے کہ جس میں انسان کو خود معلوم نہیں ہوتا اور متوجہ نہیں ہوتا کہ میں گمراہ ہوں اور بدترین گمراہی وہ ہے کہ جس میں انسان گمراہ ہو اور اسے یہ علم ہی نہ ہو کہ میں گمراہ ہوں۔**

انسانی معاشرت کی شکل کو امت کہنا چاہتا ہے اس کے اصلی خدوخال کیا ہیں؟ کن اوصاف کے ساتھ وہ انسانی معاشرہ امت کہلانے کے لائق ہوتا ہے، اس کے لئے انسانی معاشرے کے اندر کیا صفات پیدا ہوں اور کون سا راستہ طے کرے؟ تا کہ مقامِ امت پر فائز ہو، مجازاً جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان سے بحث نہیں ہے آج ہم ہر لفظ کو ہر ایک کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسے ہم اپنے لئے ارکانِ ایمان کے بغیر مومن کا لفظ استعمال کرتے ہیں، خود سے اپنے لئے ایمان کا ایک معیار بنا رکھا ہے اور اسی کے تحت ایک دوسرے کے لئے بے دریغ لفظِ مومن استعمال کرتے ہیں یعنی جس طرح لفظِ مومن کا بے جا استعمال بول چال میں ہوتا ہے اسی طرح آج امت کا لفظ بھی بے جا استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت امتِ مسلمہ کا لفظ سننے کو ملتا ہے جبکہ کہیں بھی امتِ مسلمہ نہیں ہے۔ مسلمان قوم، مسلمان کمیونٹی، مسلمان سماج اور مسلمان سوسائٹیاں ہیں لیکن امتِ مسلمہ کہیں بھی نہیں ہے۔

سوسائٹی یا سماج اور امت میں فرق

سوسائٹی، کمیونٹی، سماج اور امت میں بہت بڑا فرق ہے۔ امت چونکہ اصطلاحِ قرآن ہے اور ایک مخصوص نظام کے لئے قرآن نے اس کو بیان کیا ہے۔ اس کے لئے ایک ایسی سوشیالوجی اور معاشرتی علم کی ضرورت ہے، جس کا منبع قرآن ہو۔ ہمارے پاس جو سوشیالوجی ہے اس کا منبع مغربی علوم اور تجربات ہیں یعنی مغربی ثقافت کو منبع بنا کر سوشیالوجی کا علم تدوین کیا گیا ہے، اسی کے تحت معاشروں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور وہی ترجمہ ہو کر مسلمانوں کے اندر تعلیم دیا جاتا ہے۔ امت کو سوسائٹی یا کمیونٹی کے معنی میں لینا درست نہیں ہے کیوں کہ امت قرآن کا ایک اپنا مخصوص نظام اور مخصوص اصطلاح ہے اور قرآن ہی سے اس کی وضاحت ممکن ہے۔

لفظِ امت کا لغوی معنی

امت عربی زبان کے الفاظ اُمّ سے لیا گیا ہے یا اَمَم سے مشتق ہے (اگر متصرف ہو) چونکہ بعض لغویین کے نزدیک اُمّ اصلاً جامد ہے اور بعض لغویین نے بہت جالب نکتہ بیان کیا ہے کہ کس طرح سے یہ لفظ وجود میں آیا ہے؟ اس لفظ کی پیدائش کیسے ہوئی ہے؟ جب کسی بھی قوم یا زبان کا شیر خوار بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور جب رونا شروع کرتا ہے تو بچہ مختلف آوازیں نکالتا ہے، اگر اس کے الفاظ یا آوازوں پر غور کریں تو اس میں جو غالب لفظ ہوتا ہے وہ لفظِ اُمّ ہوتا ہے البتہ وہ اس کو بچگانہ انداز میں ادا کرتا ہے، اس طرح سے ادا نہیں کر سکتا جس طرح سے بڑے تلفظ کر رہے ہیں بلکہ بچگانہ انداز میں ''اوما، اومائے'' جیسی آوازیں نکالتا ہے اور یہیں سے لفظِ اُمّ کا استعمال شروع ہوا ہے۔ پس تحقیق کے مطابق لفظ کی پیدائش درحقیقت شیر خوار بچے کی طبعی آواز سے ہوئی ہے، اس کو کسی نے نہیں سکھایا ہے، ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ایک خاص آواز نکالتا ہے بعد میں وہ بولیاں سیکھ لیتا ہے، مختلف آوازوں کے ذریعے سے مفاہیم اپنے اندر منتقل کرتا ہے لہٰذا عربوں نے اسی سے لفظِ اُمّ ''ماں'' بنایا ہے، یہ لفظ کہہ کر بچہ گویا اپنی والدہ کو ندا دیتا ہے، صدا دیتا ہے اس وجہ سے یہ لفظِ اُمّ، ماں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

لیکن بعض دیگر لغویین کی تحقیق کے مطابق ایسا نہیں ہے بلکہ لفظِ اُمّ بنیادی طور پر جس طرح دوسرے الفاظ معانی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں اس طرح یہ بھی باقاعدہ ایک خاص معنی کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور اس لفظ کا معنی اصل اور بنیاد ہے۔ اصل یا بنیاد سے مراد ایسی چیز جس سے ساری چیزیں نکلتی ہوں اور جس کی طرف ساری چیزیں لوٹتی ہوں۔ یہ طے ہے کہ ہر چیز ایک بنیاد یا اصل سے نکلتی ہے اور آخر میں لوٹ کر اسی بنیاد کی طرف آتی ہے، مولانا رومؒ کے بقول کہ ہر چیز نہایتاً اپنی اصل کی طرف لوٹ کر چلی جائے گی، ہر شئے جو اس عالم میں موجود ہے وہ سرگردان ہے اور اپنی اصل کی تلاش میں ہے یعنی اپنی اُمّ کی تلاش میں ہے چونکہ کسی اصل سے یہ چیز نکل کر دور ہوگئی ہے اور اب حیران و پریشان ہے اس کے اندر اضطراب و تشویش پائی جاتی ہے، یہ اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی تگ و دو میں ہے۔

ہر کہ او دور شد از اصلِ خویش

وہ امت جس کی بشارت تمام انبیاءؑ نے دی یا وہ امت سازی کا مرحلہ یا پراسس جو انبیاءؑ نے شروع کیا تھا وہ پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے میں آکر تکمیل ہوا لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد پھر زوال پذیر ہوا۔

سوسائٹی، کمیونٹی، سماج اور امت میں بہت بڑا فرق ہے۔امت چونکہ اصطلاحِ قرآن ہے اور ایک مخصوص نظام کے لئے قرآن نے اس کو بیان کیا ہے۔ اس کے لئے ایک ایسی سوشیالوجی اور معاشرتی علم کی ضرورت ہے جس کا منبع قرآن ہو۔ ہمارے پاس جو سوشیالوجی ہے اس کا منبع مغربی علوم اور تجربات ہیں یعنی مغربی ثقافت کو منبع بنا کر سوشیالوجی کا علم تدوین کیا گیا ہے،

باز یابد روزگاری وصلِ خویش

جو چیز بھی اپنی اصل سے دور ہو جائے ایک دن لوٹ کر آجائے گی، وہ اپنی اصل کے ساتھ رابطہ برقرار کرے گی۔ لہٰذا اسی وجہ سے عرب لفظِ اُمّ کو ماں کے لئے استعمال کرتے ہیں اس کے علاوہ اُمّ کا لفظ بہت ساری چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مثلاً کچھ انسانی اعضاء ایسے ہیں جن کے لئے لفظ اُمّ استعمال کیا جاتا ہے اسی وجہ سے کہ ان کی طرف بہت ساری چیزیں لوٹ کر آتی ہیں۔ مثلاً اُمّ القوم، اُمّ النجوم، اُمّ الرأس، اُمّ القراء۔ اُمّ القراء مکہ کو کہتے ہیں، قرآن مجید نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے

''......أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا......'' (سورہ انعام آیت ۹۲)

......مکہ اور اس کے اردگرد......

اُمّ کا معنی اصل ہونے کے لئے مثالیں

پہلی مثال اُمّ القراء:

مکہ کو اُمّ القراء کعبہ کی موجودگی کی وجہ سے کہتے ہیں کیوں کہ یہاں ایک بنیادی آبادی تھی اور اس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے بدو قبائل تھے جو آکر موسمی طور پر آباد ہوتے تھے یہ مکہ ہی سے نکلتے تھے اور جا کر اطراف میں آباد ہو جاتے تھے اور دوسرے کسی موسم میں پھر لوٹ کر واپس مکہ میں آجاتے تھے یا اس وجہ سے کہ ان کا نسب مکہ سے پھیلا تھا اور اپنا نسب مکہ والوں سے ملاتے تھے یعنی ہر قبیلے یا نسل کی جڑ مکہ میں آکر منتہی ہوتی تھی اس وجہ سے مکہ کو اُمّ القراء کہتے ہیں۔ یعنی تمام آبادیوں کی جڑ، اساس و بنیاد جہاں سے ساری آبادیاں نکلی ہیں اور جہاں ساری آبادیاں لوٹ کر آئی ہیں۔ قدیم زمانے میں جب قبائلی اور بدوّی دور تھا، کوچہ نشین و قبیلہ نشین لوگ تھے جیسے آج کل ہمارے ہاں بعض علاقوں میں ایسے لوگ ہیں جن کو خانہ بدوش کہتے ہیں (ان کا کوئی گھر یا علاقہ نہیں ہوتا بیشک یہ کسی ایک علاقے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن وہاں رہتے نہیں ہیں، موسم کے لحاظ سے یہ جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں، سردیوں میں کہیں ہوتے ہیں جبکہ گرمیوں میں کہیں اور ہوتے ہیں، بہار میں کہیں ہوتے ہیں اور خزاں میں کہیں اور ہوتے ہیں)۔ ان کا تعلق کسی قوم و قبیلے یا علاقے سے ہوتا ہے لیکن یہ ایک جگہ ٹکتے نہیں ہیں، نکلتے بھی وہیں سے ہیں لوٹتے بھی وہی پر ہیں۔ اسی طرح مکہ سے جو قبائل اپنے ریوڑ اور خیمے لے کر خانہ بدوشی کرتے تھے گھوم پھر کر سالوں بعد لوٹ کر واپس مکہ آتے تھے اس خصوصیت کی وجہ سے مکہ کو اُمّ القراء کہا گیا ہے۔

دوسری مثال اُمّ الرأس:

عرب ایک اور اصطلاح ''اُمّ الرأس'' استعمال کرتے ہیں چونکہ جسم کے اندر جتنا بھی اعصابی نظام ہے وہ دماغ سے شروع ہو کر دماغ پر ہی ختم ہوتا ہے، گرمی، سردی، سختی اور نرمی کو انسانی جلد کے نیچے یا جلد کے اندر موجود اعصاب ہی کی وجہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ بدن کا ایک مواصلاتی نظام ہے، یہ ساری رگیں مغز سے نکلی ہیں، حرام مغز جس سے ایک بڑی رگ نکلتی ہے جو مغز کے ساتھ متصل ہے۔ حرام مغز ریڑھ کی ہڈی میں بڑے محفوظ طریقے سے ہے اور پھر اس سے چھوٹی چھوٹی رگیں نکل کر پورے بدن میں جارہی ہیں چونکہ یہ مواصلاتی نظام نکلتا بھی دماغ سے ہے اور لوٹتا بھی دماغ کی طرف ہے یعنی دماغ بدن کے مواصلاتی نظام کی اصل و اساس ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے دماغ کو اُمّ الرّاس کہتے ہیں۔

تیسری مثال امّ النجوم:

عرب ایک اور اصطلاح ''اُمّ النجوم'' استعمال کرتے ہیں۔ کہکشاں کو اُمّ النجوم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ سارے ستارے کہکشاں کی وجہ سے ہیں یعنی اصل کہکشاں ہے اسی سے یہ ستارے نکلے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں۔ کہکشاں ستاروں کا ایک بڑا مجموعہ ہوتا ہے۔ جیسے منظومہ شمسی ہے، سورج سے متعلقہ ستاروں اور سیاروں کے نظام کو منظومہِ شمسی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اور ستارے ہیں جن کا اپنا منظومہ ہے، اپنا خاندان ہے ان کے محور میں یہ سلسلہ قائم ہے اور یہ سارے منظومے مل کر ایک بڑا خاندان تشکیل دیتے ہیں جس کو کہکشاں کہتے ہیں۔ چونکہ

> اصل یا بنیاد سے مراد ایسی چیز جس سے ساری چیزیں نکلتی ہوں اور جس کی طرف ساری چیزیں لوٹتی ہوں۔ یہ طے ہے کہ ہر چیز ایک بنیاد یا اصل سے نکلتی ہے اور آخر میں لوٹ کر اسی بنیاد کی طرف آتی ہے، مولانا رومؒ کے بقول کہ ہر چیز نہایتاً اپنی اصل کی طرف لوٹ کر چلی جائے گی، ہر شئے جو اس عالم میں موجود ہے وہ سرگردان ہے اور اپنی اصل کی تلاش میں ہے

کہکشاں ستاروں کی اصل ہے، ان کی پیدائش کہکشاؤں سے ہوئی ہے اور اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے عرب ان کو اُمّ النجوم کہتے ہیں۔

الفاظ کے وجود میں آنے کے مراحل

ان اصطلاحوں کے علاوہ اُمّ کے لفظ کے ساتھ اور بھی بہت ساری اصطلاحات ہیں۔ مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ عربی لغت میں اُمّ کا معنی اصل ہے لیکن بعض اہلِ لغت نے اس کا معنی قصد بیان کیا ہے۔ اُمّ کا اصلی معنی قصد ہے اور اصل کو بھی اس وجہ سے اصل کہتے ہیں چونکہ ہر شئے اصل کا قصد کرتی ہے، مقصود اصل ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو اُمّ کہتے ہیں لہٰذا اُمّ قصد ہے، اُمّ یعنی وہ چیز جس کا قصد کیا جائے اور خودِ قصد کو بھی اُمّ کہتے ہیں، جس کا قصد کیا جائے اس کو بھی اُمّ کہتے ہیں یعنی قصد، مقصد اور مقصود کو اُمّ کہتے ہیں اور چونکہ ہر چیز اپنے اصل کا قصد کرتی ہے اس کا مقصود اصل تک پہنچنا ہوتا ہے، ان کے نزدیک اس وجہ سے اصل کو بھی اُمّ کہا جاتا ہے چونکہ یہ مقصود واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا اس توجیہ کے تحت انہوں نے کہا ہے کہ یہ اصل ہے اور یہ اس کا لغوی معنی ہے۔ الفاظ کا ایک نظام ہے، ہر لفظ لغت میں پیدا ہوتا ہے پھر ارتقاء کر کے عرفی معانی میں آتا ہے، یہاں سے ترقی کر کے اصطلاحی معانی میں آتا ہے وہاں سے پھر معمول کی بول چال میں آتا ہے، بول چال میں آ کر ذرا اس میں وسعت آجاتی ہے، جہاں پیدا ہوا تھا وہاں ایک خاص معنی کے لئے پیدا ہوا تھا لیکن جب یہ بول چال میں آتا ہے پھر جس معانی کے لئے پیدا ہوا تھا اس کا پابند نہیں رہتا اور اس کا استعمال وسیع ہو جاتا ہے پھر یہ دوسرے علوم اور اصطلاحات میں آجاتا ہے پھر جب اس کو ایک خاص اصطلاح کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے یہ لفظ کا تکامل ہے۔

ہم جتنے علوم پڑھتے ہیں ان علوم کے لغوی معانی بھی موجود ہیں مثلاً اگر کوئی علمِ صرف پڑھ رہا ہے جو عربی ادبیات میں ایک علم کا نام ہے، صَرف عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب لغت میں پھیرنا ہوتا ہے۔ یہ لفظ وہاں سے کسی خاص معنی کے لئے پیدا ہوا ہے وہاں سے اٹھ کر یہ بول چال میں آیا، بول چال سے علوم میں آیا ہے، اب جب یہ ادبیات میں آیا تو اسے الفاظ کی خاص صیغہ سازی اور شکلیں بنانے کے لئے استعمال کیا گیا۔

عربی اسلامی آئیڈیالوجی کی ترجمان

اسلامی مکتب کو سمجھنے کے لئے عربی ضروری ہے، ہم بغیر عربی کے دینِ الٰہی کو نہیں سمجھ سکتے، حالانکہ فارسی میں عظیم ذخیرہ ہے لیکن فارسی اسلامی آئیڈیالوجی کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے اسی طرح اردو بھی کافی نہیں ہے، انگریزی بالکل خالی ہے۔ چونکہ ہر زبان ایک آئیڈیالوجی کی ترجمان ہوتی ہے۔ انگلش، اردو اور فارسی الگ الگ آئیڈیالوجیز کی ترجمان ہیں اور عربی اسلامی آئیڈیالوجی کی ترجمان ہے لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ امت کا لفظ جو قرآن میں استعمال ہوا ہے قرآن میں اس کا لغوی معنی مراد نہیں ہے چونکہ قرآن نے اس کو اپنے نظام کے لئے چنا ہے، قرآن میں عام عربی بول چال کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن میں عرب ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں، عربی لوگ انہیں الفاظ کو اپنی روز مرہ زندگی کے لئے استعمال کرتے ہیں یعنی عربی زبان میں عرب انہیں الفاظ سے ہی اپنا ما فی الضمیر منتقل کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے انہیں الفاظ کی مدد سے نئے معانی کے ساتھ اپنی آئیڈیالوجی پیش کی ہے۔ اب ہمیں ان الفاظ کی مدد سے قرآنی مفاہیم کو سمجھنے کے لئے قرآنی معانی سے آشنا ہونا پڑے گا۔

لفظِ امت، اُمّ سے نکلا ہے، اُمّ کا لغوی معنی اصل یا قصد ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں، اصل ہو تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ اسی کا قصد کیا جاتا ہے، اگر قصد اس کا معنی ہو تو اصل کا ہی قصد کیا جاتا ہے لہٰذا اصل ہی ہمیشہ مقصود ہوتی ہے لیکن ظاہراً ایسے لگتا ہے کہ درست معنی اصل ہے یعنی اُمّ کا بنیادی معنی اصل ہے اور قصد کرنا اس کا لازمہ ہے۔

قرآنی الفاظ اور معانی میں مناسبت

قرآن مجید نے انسان کے اجتماعی ڈھانچے کے لئے لفظِ امت استعمال کیا ہے اور وہ اسی مناسبت کی وجہ سے جو لفظ اُمّ کے اندر موجود ہے، چونکہ لفظ بلا مناسبت نہیں چنے جاتے جس طرح ہم اپنے بچوں کے بلا مناسبت نام رکھتے ہیں اور آج کل عموماً جدید نام رکھتے ہیں ہندی، انگریزی اور انوکھے نام کی تلاش میں ہوتے ہیں جو پہلے کسی کا نہ ہو مثلاً ایک بزدل آدمی کا نام رستم رکھ دیتے ہیں۔ رستم ایک دلاور پہلوان کا نام تھا جبکہ ہمارا رستم لال بیگ اور چوہے سے بھی ڈرتا ہے یا مثلاً ہمیں شوق ہوتا ہے کہ اپنا نام علی رکھیں، علی کون شخصیت ہیں؟ کون سی ہستی ہیں؟ اور ہم یہ نام تبرکاً رکھ دیتے ہیں مناسبت نہیں ہوتی، ہم اتنا خیال نہیں رکھتے لیکن قرآن کے معانی کے لئے ان الفاظ کا انتخاب مناسبت کی بنیاد پر ہوا ہے یعنی لفظ اور معنی کے اندر مناسبت اور تناسب پایا جاتا ہے، سنخیت پائی جاتی ہے۔ امت کا لفظ اسی بنا پر چنا گیا ہے یعنی خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لئے جو نظام مقرر کیا ہے تاکہ انسان انفرادی و اجتماعی طور پر اس نکتے پر پہنچے کہ اس کے بعد انسان کو ترقی یافتہ، ہدایت یافتہ اور کمال یافتہ قرار دیا جائے گا۔

امت یعنی مفلحون یا فلاح یافتہ

اگر انسان اجتماعی طور پر اس مقرر کردہ نکتے تک پہنچے تو انہیں ''مفلحون'' یا ہدایت یافتہ کہیں گے کیونکہ اسی نکتے کا نام امت ہے۔ قرآن کی زبان میں امت اس انسانی اجتماع کو کہا جاتا ہے کہ جس کی کوئی اصل ہو، کسی اصل کے گرد قائم ہونے والا معاشرہ یا سوسائٹی امت کہلاتی ہے لیکن وہ اصل زمین نہ ہو چونکہ بعض اوقات زمین اصل قرار پاتی ہے اور زمین کے گرد جمع ہوجاتے ہیں، عام طور پر کسی زمین یا مکان کے گرد جمع ہونے والوں کو قوم کہتے ہیں۔ قوم عربی لفظ ہے یہ بھی قیام سے ہے، قیام پذیر، ایک جگہ پر رکی ہوئی قوم، رکے ہوئے لوگ، جس طرح سے پانی چلتے چلتے عموماً نشیبی زمینوں میں ایک جگہ پر جاکر رک جاتا ہے، جیسے جوہڑ ہیں اسی طرح اگر یہ انسانی نسل، اکائیاں، افراد اور انسانی سوسائٹی اگر کسی جگہ پر رک جائے اور ان کے لئے گڑھا کوئی زمین، جائیداد، جاگیر یا علاقہ ہوسکتا ہے اگر ان گڑھوں کے اندر یہ سارے انسان رک جائیں تو یہ قوم ہیں یعنی رکے ہوئے قیام پذیر لوگ قوم ہیں۔ جس طرح ہم سفر پر جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ پہلا قیام یہاں کریں گے دوسرا قیام وہاں کریں گے جہاں آپ قیام کرتے ہیں وہیں قوم بن جاتے ہیں، آپ اس وقت تک قوم ہیں جب تک قیام پذیر ہیں۔

مفہومِ قوم

قیام دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک قعود کے مقابلے میں جیسے نماز میں ہے اور ایک حرکت کے مقابلے میں ہے جیسے قیام اور سفر۔ پس قوم، قیام پذیر لوگوں کو کہتے ہیں، جن کی حرکت رک جائے وہاں پر وہ قوم بن جاتے ہیں اور عموماً جو چیزیں انسان کو روکتی ہیں وہ زمین، مکان، کھیت، شہر، آبادیاں، جاگیریں اور جائیدادیں ہیں، ان زمینوں کے گرد سارے جمع ہوکر رک جاتے ہیں، قیام پذیر ہوجاتے ہیں اور قوم بن جاتے ہیں۔

امت کی اصل زمین اور مکان نہیں

اصل کے گرد جو انسانی آبادی بنتی ہے وہ امت کہلاتی ہے لیکن وہ اصل زمین یا مکان نہیں ہونی چاہیے، اکثر جو قومیں بنی ہیں وہ اس وجہ سے کہ جہاں انسان کو پینے، نہانے دھونے اور کھیتی باڑی کے لئے پانی نظر آیا ہے وہاں اس نے آبادی قائم کرلی ہے۔ ابھی آپ مختلف سرزمینوں میں جائیں تو یوں نہیں ہوتا آج کل ٹیکنالوجی ترقی کرگئی ہے لہٰذا جہاں آبادی ہو وہاں کنواں کھود لیتے ہیں جبکہ پہلے ایسے نہیں تھا پہلے جہاں پانی ہوتا تھا وہاں آبادی بناتے تھے نہ کہ جہاں آبادی ہے وہاں پانی لے آئیں، اس وقت صورتِ حال مختلف ہے پہلے پانی کی تلاش کرتے تھے اور جہاں پانی ہوتا وہاں قیام کرلیتے تھے لہٰذا پانی کے چشمے، نہریں، دریا کے کنارے اور اس طرح کے علاقوں میں آبادیاں تھیں۔ ابھی کوہستانی پہاڑی علاقوں میں دیکھیں تو وہاں پر جہاں پینے کا پانی ہے وہیں پر آبادی ہے جہاں پانی نہیں ہے وہاں کوئی آبادی نہیں ہے چونکہ پانی بنیادی ضرورت ہے لہٰذا لوگ وہاں قیام پذیر ہوجاتے تھے نتیجتاً پانی کے گرد گاؤں بنتا تھا اسی گاؤں میں مختلف علاقوں سے لوگ آتے تھے اور قوم بن جاتے تھے، پھر

> **اسلامی مکتب کو سمجھنے کے لئے عربی ضروری ہے ہم بغیر عربی کے دینِ الٰہی کو نہیں سمجھ سکتے، حالانکہ فارسی میں عظیم ذخیرہ ہے لیکن فارسی اسلامی آئیڈیالوجی کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے اسی طرح اردو بھی کافی نہیں ہے، انگریزی بالکل خالی ہے۔**

اس قوم پر فخر بھی کرتے تھے کہ ہم اس جوہڑ کے کنارے آکر آباد ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ یہ ان کی ذات، شناخت اور پہچان بن جاتی تھی۔

قوم پرستی، بت پرستی ہے

آج کے دور میں قوم ایک بہت مقدس بت ہے، اگر کوئی دین کے بارے میں کوئی غلط بات کہے کسی کو غیرت نہیں آتی لیکن کسی کی زبان سے کسی قوم کے خلاف ایک جملہ نکل جائے تو جلوس اور ریلیاں نکالتے ہیں، یہ جتنی بھی قومیں ہیں کیسے وجود میں آئی ہیں؟ ہم سب آدم اور حوا کی اولاد ہیں، ایک ہی ماں باپ کے بعد قومیں کیسے پیدا ہوگئی ہیں؟ مثلاً فرض کریں کسی کے بارہ بیٹے ہیں بارہ قومیں ان سے پیدا ہوجائیں گی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ماں باپ کے بارہ بیٹوں سے بارہ قومیں بن جائیں؟ یہ قومیں اس قیام کی وجہ سے بنی ہیں یعنی ان کا قیام مختلف جگہوں پر ہوا ہے اور اکثر قیام پانی یا چراگاہ کے قریب ہوا ہے، چراگاہ اور پانی، مرکز اور گڑھا بنا ہے جہاں انسان رک گیا ہے، قیام پذیر ہوا ہے اور قوم وجود میں آگئی ہے۔

اصل و محورِ امت دینِ الٰہی ہے

جس اصل کے گرد اجتماع، قیام اور رابطے سے امت پیدا ہوتی ہے اس اصل کا نام دینِ الٰہی ہے، یعنی دینِ الٰہی کے گرد اکٹھے لوگوں کو امت کہتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ تجارت کی غرض سے اکٹھے ہوتے ہیں، مثلاً کچھ شہر دنیا میں تجارت کی وجہ سے قائم ہوئے ہیں خود مکہ کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ تجارتی شہر تھا اور لوگ اس میں تجارت کے عنوان سے آتے تھے یا بعض دیگر شہر ہیں جو تجارت کی وجہ سے قائم ہوئے ہیں۔ جیسے کراچی یا ممبئی ہے جو بندرگاہوں اور تجارت کی وجہ سے بنے ہیں، یہاں پر تاجر آتے تھے، مالِ تجارت خریدتے اور بیچتے تھے پھر آہستہ آہستہ آبادیاں بنتی گئیں اور پھر یہ شہر بن گئے۔

اگر ان وجوہات کی بنیاد پر ایک انسانی آبادی کسی جگہ پر اکٹھی ہوجائے اس کو امت نہیں کہتے بلکہ امت اس کو کہتے ہیں کہ دینِ الٰہی جن انسانوں کو ایک لڑی میں پروئے۔ اگر انسان نظریہ، عقیدہ، مکتب، اعتقاد اور ایک ہی آئیڈیالوجی کے گرد جمع ہو اس کو امت کہتے ہیں۔ پس قرآن مجید نے الٰہی دین کے گرد واقع انسانی اجتماعی نظام کو امت کہا ہے، کیوں کہ امت اس انسانی مجموعے کو کہتے ہیں جو کسی اصل کی بنیاد پر قائم ہوا ہو اور وہ اصل دین الٰہی، دینِ خدا اور آئینِ الٰہی ہے۔ جو منشور خدا نے انسانوں کے لئے مقرر کیا ہے اس کے گرد جو لوگ آئیں اکٹھے ہوں ان کو امت کہا گیا ہے۔

ارکانِ امت:

پہلا رکن

(دین الٰہی محورِ امت):

پہلا رکن جو امت بننے کے لئے ضروری ہے وہ دین کا محور ہونا ہے یعنی امت بننے کے لئے انسانی اجتماع کا محور دین ہونا ضروری ہے، اصل و بنیاد دین ہو اور صرف اکٹھا ہونا امت کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ دین کے گرد اور دین کے محور میں جمع ہونا، امت بننے کے لئے ضروری ہے۔ امت بننے کے اور بھی ارکان ہیں جو اس کے لغوی معنی سے ماخوذ ہیں جیسا کہ پہلے گزرا ہے کہ لغوین میں دو قول ہیں کہ اُمّ قصد کے معنی میں ہے یا اصل کے معنی میں ہے۔ یہ نزاع بے فائدہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں امت اس انسانی اجتماع کا نام ہے جس کا محور دین ہو، جہاں لوگ دین کے گرد جمع ہوئے ہوں اور جن کا ایک ہی مقصد ہو، وحدتِ مقصد رکھتے ہوں اور یہ مقصد بھی انہوں نے اسی دین سے لیا ہو اصل نے ان کے لئے مقصد معین کیا ہو، وہ امت کہلاتے ہیں۔

اگر ہم دیکھیں تو امت بننا بہت دشوار ہے، مقصد ایک کرنا بہت مشکل ہے جبکہ ہماری خواہشات، آرزوئیں اور تمنائیں الگ الگ ہیں، ہماری ہر چیز الگ ہے، اتنے پراگندہ لوگ ہیں کہ جن کے مزاج، سوچیں، فکر، ترجیحات

> **قرآن کی زبان میں امت اس انسانی اجتماع کو کہا جاتا ہے کہ جس کی کوئی اصل ہو، کسی اصل کے گرد قائم ہونے والا معاشرہ یا سوسائٹی امت کہلاتی ہے لیکن وہ اصل زمین نہ ہو چونکہ بعض اوقات زمین اصل قرار پاتی ہے اور زمین کے گرد جمع ہوجاتے ہیں، عام طور پر کسی زمین یا مکان کے گرد جمع ہونے والوں کو قوم کہتے ہیں۔**

امت کی تعریف میں وہ لوگ شامل ہی نہیں ہوتے جو بامقصد نہیں ہیں، جن کا کوئی مقصد نہ ہو اور مقصد بھی وہ جو دین نے متعارف کروایا ہے، جو دین نے ان کے سامنے رکھا ہے، جب تک یہ مقصد ان کے سامنے نہ ہو امت کہلانے کے روادار نہیں ہیں۔

اور تمایلات الغرض ہماری ہر چیز جدا ہے اگرچہ دو بھائی ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں لیکن ان دو بھائیوں کے درمیان اگر فرق تلاش کریں تو آپ کو زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔

دوسرا رکن

(مقصد کا ایک ہونا):

انسانوں کے اندر اختلاف کے فراوان پہلو ہیں اس کے باوجود مقصد کو ایک کرنا ہے اور مقصد بھی وہی ہونا چاہئے جو دین کہہ رہا ہے چونکہ مقصد کو دین نے ان کے سامنے رکھنا ہے، مقصد کا انتخاب آئیڈیالوجی کرتی ہے، آئیڈیالوجی انسان کے سامنے مقصد معین کرتی ہے، انسان خود اپنے لئے مقصد نہیں چنتا، اس کے لئے آئیڈیالوجی کی ضرورت ہوتی ہے اور آئیڈیالوجی اسی کو کہتے ہیں کہ جو انسان کے سامنے مقصد رکھے اور اس مقصد کی طرف انسان کو جہت دے، مکتب اور دین کی ضرورت اسی وجہ سے ہوتی ہے، ان کا مقصد ایک ہو، جو لوگ اہلِ مقصد نہیں ہیں وہ امت نہیں ہیں، امت کی تعریف میں وہ لوگ شامل ہی نہیں ہوتے جو بامقصد نہیں ہیں، جن کا کوئی مقصد نہ ہو اور مقصد بھی وہ جو دین نے متعارف کروایا ہے، جو دین نے ان کے سامنے رکھا ہے، جب تک یہ مقصد ان کے سامنے نہ ہو امت کہلانے کے روادار نہیں ہیں۔ پس دوسرا اہم رکن مقصد ہے۔

تیسرا رکن

(امت بننے کے لئے ایک راستے کی ضرورت):

امت اس طبقے کو کہیں گے جو اس مقصد کے حصول کے لئے راہ بھی رکھتے ہوں چونکہ صرف مقصد کا تعین ہو جانا کہ یہ مقصد ہے اس سے لوگ امت نہیں بن جاتے۔ امت کے لئے یہ ضروری ہے کہ راہ بھی ہو اور اس مقصد تک جانے کے لئے ایک راستہ ہو ایسا نہ ہو کہ مقصد ایک ہو اور راستے الگ الگ ہوں۔ ایک مقصد کی طرف کئی راستے نہیں جاتے، یہ ہماری سب سے بڑی غلطی اور اشتباہ ہے۔ بعض اوقات ہم متضاد راستوں سے ایک ہی مقصد کی طرف جا رہے ہوتے ہیں یہ غلط ہے، ایک مقصد کی طرف صرف ایک راستہ ہوتا ہے۔ راستے کو عربی زبان میں مسلک کہتے ہیں اور ہم مسلک مذہب کو کہتے ہیں اور یہ درست کہتے ہیں چونکہ مذہب بھی راستے کو ہی کہتے ہیں، اس مقصد کے حصول کے لئے راستہ ایک ہو۔

چوتھا رکن

(حرکت کی ضرورت):

امت کا رکنِ چہارم حرکت ہے، امت جامد معاشرے کو نہیں کہتے بلکہ امت مقصد کی طرف متحرک انسانی معاشرے کو کہتے ہیں۔ معاشرہ جہاں رکے گا قوم بن جائے گا امت نہیں ہوگا، جہاں قیام پذیر ہوگا، اگر کوئی معاشرہ کسی گڑھے میں گر جائے وہیں رک جائے گا جیسے چلتی گاڑی گڑھے میں گرتی ہے وہیں رک جاتی ہے۔ لہٰذا جتنے بھی انبیاء علیہم السلام آئے سب نے آکر خطاب کیا

"یاقوم اعبدو تعالوا"

یعنی اے قوم اٹھو، یعنی تم کھڈے میں گرے ہو اوپر آؤ۔

"تعال" عربی زبان کا لفظ ہے اور اردو میں اس کا معنیٰ 'ادھر آؤ' بنتا ہے۔ جبکہ یہ غلط معنی ہے چونکہ عربی فصیح زبان ہے اگر ادھر آنے کو کہے تو کہتے ہیں "الیا" الیا یعنی ادھر آؤ، "نزل" نیچے آؤ، "تعال" اوپر آؤ۔ خاص حالتوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں ہر جگہ پر تعال استعمال نہیں کرتے۔ لہٰذا انبیاءؑ نے آکر اپنی قوموں کو یوں خطاب کیا، "یاقَوم" اے قوم! تم ایک قوم ہو تم گڑھے میں گرے ہوئے ہو، تمہارا محور زمین، چراگاہ، چشمہ، پانی اور کھانا ہے، "تعالوا" اوپر آؤ، یعنی گڑھے سے باہر صراط پر آؤ، یہ تمہارا مقصد ہے، مقصد کیا ہے؟

"اعبدو الله"

خداوند تعالیٰ تمہارا مقصد ہے، اس مقصد کی طرف حرکت کرو، حرکت میں آؤ گے تو تم امت بنو گے۔

جمود باعث ہلاکت

جب بھی انسانوں میں جمود، سکوت اور ٹھہراؤ آئے گا وہیں پر قومیت آجائے

اپنارخ دین اور خدا کی طرف کرلو چونکہ پیدائشی طور پر تمہارا رخ خدا کی طرف ہے۔جس طرح پودے کارخ پیدائشی طور پر آسمان کی طرف ہوتا ہے،نور کی طرف ہوتا ہے،اسی طرح انسان کا رخ بھی پیدائشی طور پر خدا کی طرف ہے پس اندرونی تقاضوں کو بیرونی دلیلوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔جو دین کے اندر تھا اس کو ہم نہیں کھول سکے اور دین کے باہر اُسے ڈھونڈ رہے ہیں۔

گی اور قومیت وہ گڑھا ہے جس میں انسان، انسانی توانائیاں اور آئیڈیالوجی غرق ہوتی ہے، اسلام جن کنوؤں اور کھڈوں میں گرا ہے وہاں سے نکل ہی نہیں سکا اور مسلمان قومیتوں کے کھڈے میں گر گیا اور تدریجاً آج بہت ساری قومیں بن گئی ہیں پس امت کو مقصد تک پہنچنے کے لئے متحرک ہونا چاہئے۔

پانچواں رکن

(امامت کی ضرورت):

حرکتِ امت اور امت کی ذات کے اندر ایک تقاضا موجود ہے اور وہ امامت ہے، امت یعنی دین کے محور میں اکٹھے لوگ، با مقصد لوگ، ایک مقصد پر متفق لوگ، اس راہ کے اوپر متحرک لوگ۔ جب امت کی یہ اصطلاح ہے پھر اس امت کو امام یا امامت کی ضرورت ہے، ان کا مقصد کی طرف جانا بغیر امام کے ممکن ہی نہیں ہے چونکہ بغیر امام کے حرکت گمراہ کن ہے۔لہٰذا امت کی ذات کے اندر تقاضۂ امامت موجود ہے، امت کے لئے امام کی ضرورت ہے دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً ایک آدمی کو پیاس لگی ہو اس کے اندر احساسِ عطش موجود ہو پھر اس کے لئے دلائل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں کہ کہیں سے کوئی دلیل مل جائے تا کہ وہ پانی پی سکے۔

ضرورتِ امامت دلائل کی محتاج نہیں

جس طرح ہم اندرونی تقاضوں کو باہر سے تلاش کر رہے ہوتے ہیں، ثابت کر رہے ہوتے ہیں مثلاً خدا کے ہونے یا نہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تا کہ کوئی دلیل مل جائے کہ خدا ہے جبکہ فطرتِ انسان میں اندر سے خدا کی طرف رخ ہے

"فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا......" (سورہ روم آیت نمبر ۳۰)

یعنی خداوند تعالیٰ نے انسان کو اسی طرح سے بنایا ہے لہٰذا حکم دیا کہ اپنا رخ دین اور خدا کی طرف کرلو چونکہ پیدائشی طور پر تمہارا رخ خدا کی طرف ہے۔جس طرح پودے کا رخ پیدائشی طور پر آسمان کی طرف ہوتا ہے، نور کی طرف ہوتا ہے، اسی طرح انسان کا رخ بھی پیدائشی طور پر خدا کی طرف ہے پس اندرونی تقاضوں کو بیرونی دلیلوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔جو دین کے اندر تھا اس کو ہم نہیں کھول سکے اور دین کے باہر اُسے ڈھونڈ رہے ہیں۔حافظ شیرازی کے بقول کہ

سالها دل طلبِ جام از ما می کرد

کئی سال یہ دل ہم سے یہ جامِ مَے مانگ رہا تھا

آنچه خود داشت ز بیگانه تمنا می کرد

لیکن بیچارے کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جو خود اس کے اپنے پاس ہے وہی ہم سے مانگ رہا ہے۔ ہماری بھی یہی حالت ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس اسلامی معارف اور حقانیت کی صورت میں موجود ہے اس کو ہم باہر ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ہر موضوع دلیل کا محتاج نہیں ہوتا، بعض موضوعات صرف کھل کر واضح ہو جائیں تو وضاحت کے اندر ہی اثبات کا مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔امامت ان موضوعات میں سے ہے اگر مفہومِ امت کھل جاتا تو امامت کے اوپر ہمیں باہر سے دلیل کی ضرورت نہ ہوتی۔

قرآن میں حکمِ امت

قرآن کا فرمان ہے

"وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ......" (سورہ آل عمران آیت ۱۰۴)

تم امت بنو!

امت کس طرح سے بنیں؟ ہم ہر چیز کھا کے کہیں یہ امت ہے؟ اپنے مزاج کے مطابق جو جی میں آئے کر کے اس کا نام امت رکھ لیں؟ جیسے ہم سب کچھ کر کے اپنا نام مومن رکھ لیتے ہیں، اس سے تو مومن نہیں بن جاتے، مومن بھی امت کی طرح خود قرآن کا بیان شدہ ایک ضابطہ و درجہ ہے اس پر پہنچنے سے انسان مومن ہوتا ہے اسی طرح اپنا نام امت رکھنے سے امت نہیں ہوتے، جب تک قرآن کی

طے شدہ حدود، ارکان اور صفات ہمارے اندر نہ آجائیں امت نہیں بن سکتے۔

امامت و امت قرآنی نظام

اگر ہم امت کو کھولیں تو اس کے اندر تقاضۂ امامت موجود ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان کی ہدایت کے لئے جو نظام مقرر فرمایا اس کا نام ہے امت و امامت یا امامت و امت۔ ہم ابھی اس کے ایک رکن سے بحث کر رہے ہیں اور یہ اس کی لفظی تشریح ہے۔ قرآن میں لفظِ امت ساٹھ مرتبہ سے زیادہ استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ ہمارے مدِنظر معانی میں نہیں ہے۔ بعض جگہ امت اسی لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید نے جو انسانی اجتماعی نظام کے لئے لفظِ امت استعمال کیا ہے وہ الگ معنی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں جہاں بھی زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے وہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے قرآن کو سمجھنے کے لئے صرف عربی سمجھنا کافی نہیں بلکہ فقیہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں بہت سارے الفاظ اپنے خاص قرائن کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً لفظِ امت قرآن میں کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے یہاں پر امت اجتماعی نظام کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ از جملہ سورۂ مبارکہ آلِ عمران آیت نمبر ۱۰۴ میں خداوند تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے کہ

” وَلْتَكُنْ مِنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ “

فلاح کا معنی بھی اسی تناظر میں کیا ہے، قرآن کی زبان میں فلاح یعنی ترقی یافتہ معاشرہ جو امت بنیں، اس مقام پر پہنچنے کے بعد وہ ”مفلحون“ کہلاتے ہیں۔

امت کے لئے اجتماع کی شرط نہیں

قرآن مجید میں لفظِ امت فردِ واحد کے لئے بھی استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ صفات اگر چند انسانوں میں آجائیں تو وہ امت ہیں حتیٰ اگر ایک انسان میں آجائیں تو وہ بھی امت ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے امت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہاں بھی مفسرین حیران ہیں اس کے علاوہ قرآن کی اور بھی بہت ساری آیات باعثِ حیرت ہیں، ان میں ایک آیت یہ بھی ہے

” إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُنْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ “ (سورہ نحل آیت ۱۲۰)

یہاں پر مختلف ترجمے کئے گئے ہیں کہ بالآخر ابراہیمؑ کو امت کس طرح تصور کریں چونکہ ابراہیمؑ تو ایک فرد ہے، جب ہم کسی بات کو اس کی جڑ سے نہ سمجھیں پھر یہ حیرت آخر میں ظاہر ہوجاتی ہے کہ آپس میں یہ تقابل ٹکراؤ آگیا ہے اس کو کیسے حل کریں؟ چونکہ ہم نے جو لفظ امت سن رکھا تھا وہ تو سوسائٹی وکمیونٹی ہے، سماج ومعاشرہ ہے تو ابراہیمؑ کیسے امت بن گئے۔ لیکن اگر امت کا ملاک سمجھ میں آجائے تو ایک فردِ واحد پر لفظِ امت کا اطلاق ہوتا ہے جس طرح کہ قرآن مجید نے کیا ہے اور امام خمینیؒ نے یہی شہید بہشتیؒ کے بارے میں فرمایا تھا کہ بہشتیؒ اپنی ذات میں ایک تنہا لیکن مکمل امت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شہیدِ عزیز، بزرگوار جو ہمارے علمی حلقوں میں ناشناختہ ہیں صرف ان کا نام اور تصویر ہے لیکن اس بزرگوار کا اصل جو ہر ناشناختہ ہے، انقلابِ اسلامی کے نظریے کو پختہ کرنے، بنیاد بنانے، نظریے کو نظام کی شکل دینے اور نظام کے نفاذ کے لئے شہید بہشتیؒ نے بہت خدمات انجام دیے، اسی لیے امامؒ نے ان کے لئے فرمایا کہ بہشتیؒ اپنی ذات میں امت تھے۔

” إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا...... “

ابراہیمؑ امت ہیں اور وہ بھی امتِ خاضع ہیں۔

” ......وَلَمْ يَكُنْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ “

ابراہیمؑ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مشرک نہیں تھے، جس طرح

> **امت کس طرح سے بنیں؟ ہم ہر چیز کھا کے کہیں یہ امت ہے؟ اپنے مزاج کے مطابق جو جی میں آئے کر کے اس کا نام امت رکھ لیں؟ جیسے ہم سب کچھ کر کے اپنا نام مومن رکھ لیتے ہیں، اس سے تو مومن نہیں بن جاتے، مومن بھی امت کی طرح خود قرآن کا بیان شدہ ایک ضابطہ و درجہ ہے اس پر پہنچنے سے انسان مومن ہوتا ہے اسی طرح اپنا نام امت رکھنے سے امت نہیں ہوتے، جب تک قرآن کی طے شدہ حدود، ارکان اور صفات ہمارے اندر نہ آجائیں امت نہیں بن سکتے۔**

اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ہر زمانہ اپنے ابراہیمؑ کی تلاش میں ہے لیکن ابراہیمؑ بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ابراہیمؑ کی صفتِ ممتاز جو قرآن نے جگہ جگہ ذکر کی ہے وہ یہ کہ ابراہیمؑ مشرک نہیں تھے۔ ہماری سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ ہم شرک آلود راستوں پر ہیں، انسان مشرکانہ راہوں سے ابراہیم نہیں بن سکتا۔ابراہیمؑ خالص توحیدی مسلک ہے۔ابراہیمؑ کے اندر ذرہ برابر شائبہٗ شرک نہیں تھا۔ابراہیمؑ کے عقیدے میں، عمل میں، گفتگو میں، رویہ اور روش میں کسی جگہ پر شرک نہیں تھا لیکن ہم اگر اپنے امورات کو کھولیں بیشک عقیدے میں شرک نہیں ہے مگر ہماری روشوں، رویوں، ذہنوں اور تمایلات میں شرک ہے،شرک کا کوئی ایک شعبہ نہیں ہے، بلکہ شرک سرطان کی طرح ہے، اگر ہم اپنے دل کو چیک کروائیں اس میں سرطان نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہیں بھی سرطان نہیں ہے،معدہ،خون،رگ،گلہ یا خلیات میں کہیں بھی سرطان ہوسکتا ہے چونکہ کسی بھی ایک عضو میں سرطان ہوسکتا ہے۔شرک ایک سرطان ہے جو انسان کے وجود کے اندر ہر جگہ گھس جاتا ہے، نابود کر دیتا ہے۔ لہٰذا ابراہیمؑ کسی پہلو سے بھی مشرک نہیں تھے، ابراہیمؑ کی روشیں، طریقے، رویے اور انتخاب یعنی ہر چیز خالص توحیدی تھا اس میں ذرہ برابر شرک نہیں تھا اسی سورہ کی اگلی آیت میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے

”شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“

(سورہ نحل آیت ۱۲۱)

ابراہیمؑ خدا کی نعمتوں کے شاکر تھے اس وجہ سے خدا نے ابراہیمؑ کو چنا اور اسی لیے خدا نے ابراہیمؑ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کی چونکہ ابراہیمؑ اپنی ذات میں امت تھے اور صراطِ مستقیم پر تھے،اسی سورہ میں آگے جا کر خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں

”ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ“ (سورہ نحل ۱۲۳)

اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر ہم نے آپ پر بھی یہ وحی کی ہے کہ آپ بھی ملتِ ابراہیمؑ کی اتباع کریں کیوں کہ ابراہیمؑ کا طریقہ مشرکانہ نہیں تھا۔’ملت‘ عربی زبان میں مذہب، مسلک اور طریقے کو کہتے ہیں اور اردو میں ملت قوم کو کہتے ہیں۔اگر ہم اپنی عملی زندگی سے شرک ختم کر دیں تو سب ابراہیمؑ ہیں، اگر ہم اپنے اعتقادات کا معائنہ کریں تو شرک ہی شرک نکلے گا۔ ہر رگ اور ہر خلیے سے شرک کے فوارے پھوٹ پڑیں گے۔جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ”شرک اس چیونٹی کی طرح ہے جو شفاف پتھر پہ رینگ جاتی ہے اور اسے پتہ تک نہیں چلتا“۔

یعنی ہمارے اندر غیر محسوس طور پر شرک موجود ہے، جیسے صاف چٹیل پتھر کے اوپر سے اگر چیونٹی رینگ جائے تو آہٹ بھی نہیں ہوتی اور نشان بھی نہیں ہوتا اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ چیونٹی رینگ گئی ہے چونکہ چیونٹی ہلکی ہے۔اسی طرح شرک بھی انسان کے دل میں غیر محسوس طور پر سرایت کر جاتا ہے جیسے چیونٹی شفاف پتھر پر چلتی ہے مگر اپنا نشان تک نہیں چھوڑتی پس نظامِ توحیدی دشوار ہے۔

(جاری ہے............)

بقیہ: حکمت علیؑ

کہ بازار میں بالکل سناٹا چھا گیا، بی بی زینب سلام اللہ علیہا نے خطبے کا آغاز کیا اور انہیں متوجہ کیا کہ اے خاذلینِ دین! اے خاذلینِ امامؑ! اے خاذلینِ رسولؐ و حرم رسولؐ! تمہیں معلوم ہے کہ تم نے کیا گناہ کیا ہے؟ وہ قاتل نہیں تھے بلکہ تماشہ دیکھنے آئے تھے، بی بی زینب سلام اللہ علیہا نے ایسا پر جلال خطبہ کربلا میں نہیں دیا، حسینؑ نے خطبے دیئے لیکن جنابِ زینب سلام اللہ علیہا نے کوئی خطبہ کربلا میں نہیں دیا، کوفہ میں آکر خطبہ دیا۔ جب گروہ ونسلِ خاذلین دیکھی تو ان کو متوجہ کیا۔ بی بی زینب سلام اللہ علیہا نے جب خطبہ شروع کیا تو روایات میں ہے کہ خطبہ سننے والوں میں ایک نابینا بھی خطبہ سن رہا تھا، ایک بوڑھا نابینا خطبہ سن رہا تھا، خطبہ سن کے اپنے اردگرد لوگوں کو کہتا ہے کہ عجیب بات ہے میرے مولاؑ کو گزرے ہوئے بڑا وقت گزر چکا ہے، اِس دُنیا میں علیؑ موجود نہیں ہیں، یہ آج علیؑ کا خطبہ کیسے سن رہا ہوں، یہ کون ہے جو علیؑ کا خطبہ آج بازارِ کوفہ میں، اسی کوفہ میں، انہی بازاروں میں جہاں علیؑ خطبے دیتے رہے، کون خطبہ دے رہا ہے؟ کہتا ہے لوگو! مجھے بتاؤ یہ علیؑ کا کوئی بیٹا آ گیا؟ لوگوں نے بتایا علیؑ کا بیٹا نہیں بلکہ علیؑ کی بیٹی خطبہ دے رہی ہے۔ کہنے لگا سبحان اللہ! علیؑ کے تو بیٹے بھی تھے، علیؑ کے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ تھے، کیا علیؑ کے بعد امارت اُن کو نہیں ملی؟ کیا علیؑ کے بعد وہ امیر نہیں بنے جو بیٹی تخت پر بیٹھ کر آ کر بازاروں میں خطبے دے رہی ہے؟ سننے والوں نے کہا اے نابینا! علیؑ کی بیٹی امیر بن کر کوفہ نہیں آئی اسیر بن کر کوفہ آئی ہے، اسیر ہو کر خطبے دے رہی ہے۔

امت سازی ۳

از نظر قرآن



گروہ معارف

باسمہٖ تعالیٰ

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ" يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" (سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

امت سازی ایک متروک فریضہ:

امت سازی صدیوں سے فراموش شدہ اور متروک فریضہ ہے بلکہ یوں کہیں کہ عہدِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تدریجاً مسلمان اس فریضہ سے دور ہوئے اور آج بہت ہی دور ہیں۔ مسلمانوں کی اتنی کثرت اور اتنا عالی آئین رکھنے کے باوجود پسماندگی، زوال اور مشکلات کا بنیادی سبب یہی ہے کہ سب سے اہم فریضہ جو قرآن اور دین نے ان کے لئے مقرر کیا تھا اسے چھوڑ دیا ہے اور امت سازی سے دور ہو کر اس کی متبادل شکلیں اور متبادل راستے تلاش کر لیے ہیں۔ انسان کے ذمے دو اہم فریضے ہیں ایک انفرادی اور ایک اجتماعی طور پر۔ انفرادی طور پر انسان خودسازی پر مامور ہے اور اجتماعی طور پر امت سازی پر مامور ہے۔ خودسازی کا عمل انفرادی طور پر جس طرح دین اور قرآن مجید میں مذکور ہے علمی اور عملی لحاظ سے کسی حد تک مدِ نظر رہا ہے اور اس پر تھوڑا بہت عمل بھی ہوا ہے لیکن مکمل طور پر نہیں ہوا چونکہ خودسازی کا بگڑا ہوا مفہوم اور بگڑی ہوئی شکلیں بھی موجود ہیں۔

خودسازی کی بہت ساری انحرافی شکلیں موجود ہیں۔ جس طرح دین کی خانقاہی شکل ہے اسی طرح دین کی نگاہ سے قابلِ مذمت شکلیں اور بھی بہت ساری ہیں، جن کے اندر خودسازی کے دینی معیار موجود نہیں ہیں لیکن ان کے ساتھ ہمیں ایسے نمونے بھی نظر آتے ہیں جہاں پر خودسازی کا صحیح نمونہ بھی موجود ہے لیکن امت سازی مجموعی طور پر متروک عمل رہا ہے اور مسلمان عملی و علمی طور پر بھی اس سے دور ہوئے ہیں یعنی مسلمانوں کی تعلیمات میں بھی امتِ اسلامی و امت سازی نامی کوئی چیز نظر نہیں آتی اور اس کے متبادل راستے تلاش کر کے ان پر زیادہ علمی کاوشیں ہوئی ہیں، اسی طرح عملی طور پر بھی دوسرے متبادل امور یا متبادل ڈھانچے بنائے گئے ہیں جن میں آج مسلمان مشغول ہیں۔

انسان تکوینی لحاظ سے آزاد ہے:

خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہے، از نظرِ تکوینی انسان آزاد ہے، جس راہ پر بھی چلے وہ مجبور اور پابند نہیں ہے، انسانی اور ہدایت کے راستے پہ چلے یا گمراہی، تباہی اور شیطانی راستے پہ چلے، یہ راستے تکوینی طور پر انسان کے سامنے کھلے رکھے گئے ہیں، ہدایت انسان کے سامنے رکھ دی گئی ہے جس

انسان کے ذمے دواہم فریضے ہیں ایک انفرادی اور ایک اجتماعی طور پر۔ انفرادی طور پر انسان خودسازی پر مامور ہے اور اجتماعی طور پر امت سازی پر مامور ہے۔ خودسازی کا عمل انفرادی طور پر جس طرح دین اور قرآن مجید میں مذکور ہے علمی اور عملی لحاظ سے کسی حد تک مدنظر رہا ہے اور اس پر تھوڑا بہت عمل بھی ہوا ہے لیکن مکمل طور پر نہیں ہوا چونکہ خودسازی کا بگڑا ہوا مفہوم اور بگڑی ہوئی شکلیں بھی موجود ہیں۔

طرح قرآن مجید کا فرمانا ہے کہ

"إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا"

(سورہ دھر آیت نمبر ۳)

"ہم نے ہدایت اور گمراہی کے دونوں راستے اُس کے سامنے رکھ دیے ہیں اور اب اسے اختیار کرنا ہے کہ وہ کس راستے پہ چلنا چاہتا ہے۔"

دین اپنانے سے پہلے انسان آزاد ہے کہ وہ چاہے تو دین، ایمان اور انبیاء علیہم السلام کے راستے پہ چلے یا ضلالت، گمراہی، کفر اور شیاطین کے راستے پہ چلے۔ لیکن اپنے ارادے، اختیار اور اپنی معرفت کی بنیاد پر جب ایمان انتخاب کرلیتا ہے پھر اسے خدا کا مقرر کردہ راستہ اپنانا ہوگا، ہدایت کی راہ پر اس کو چلنا ہوگا، پھر اس کے بعد انسان کی آزادی محدود ہوجاتی ہے یعنی دین میں آکر پھر بھی ویسا آزاد نہیں ہے جیسا کہ دین اپنا کر آزاد تھا، دین اپنانے سے پہلے جیسے آزاد تھا یعنی دین کے بغیر ہر کام انسان کرسکتا ہے لیکن جب دین اور قانون اپنالیتا ہے پھر وہ اس قانون کی پیروی کا پابند ہے۔ لیکن ہم مسلمان کو تاریخ میں دیکھیں اور آج بھی یہی الجھن ہے کہ ان کے اندر مسلمان ہونے کے بعد بھی آزادی سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو مسلمان، مومن اور دیندار بھی کہلواتے ہیں اور خلافِ دین راستوں پر چلنے کی آزادی کے بھی قائل ہیں۔ آج اگر ہم اپنی زندگیوں پہ غور کریں، اپنے ارد گرد اپنے ماحول کو دیکھیں تو ہمیں دینداری کی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ قرآن مجید اس کی مذمت کرتا ہے، اس دینداری کو رد کرتا ہے۔

دین کے بعض امور کو لیکر بعض کو ترک کرنا:

قرآن میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے یہود کے دین اپنانے کا طریقۂ کار یوں بیان فرمایا ہے کہ

"......نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ......"

(سورہ نساء آیت ۱۵۰)

یعنی دیندار ہوکر غیر دینی راستوں پر چلنا اور خود کو دیندار بھی کہلوانا اسی طرح اپنے آپ کو دینی انجام و دینی اجر کا مستحق بھی سمجھنا، یہ یہود کا طریقہ کار ہے اور قرآن مجید نے اس طرز کی دینداری کی مذمت کی ہے۔ اب یہود سے یہ دینداری سیکھ کر مسلمانوں نے بھی یہی طریقہ کار اپنایا ہے کہ دینی فرائض میں سے بعض کو لے لیا ہے اور بعض کو چھوڑ دیا ہے اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ ہم دین پر عمل پیرا ہیں یعنی دین کے بعض حصوں میں اپنے آپ کو پابند اور بعض میں خود کو آزاد سمجھتے ہیں لیکن قرآن مجید اور دین نے اس کو مجموعی طور پر دین سے باہر قرار دیا ہے اور اس طرح کی دینداری کو سختی سے رد کیا ہے۔ دین کے اندر اس شخص کو شمار کیا گیا ہے جو مکمل طور پر دین کے اندر زندگی بسر کررہا ہو۔ جو زندگی کے بعض امور کو دین کے اندر اور بعض کو دین سے باہر گزارتا ہو اسکی مجموعی زندگی کو قرآن نے دین سے باہر ہی تصور کیا ہے، اگرچہ یہود خود مُصر ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن قرآن ان کے اس ایمان کی تصدیق نہیں کرتا۔

یہ مضمون قرآن مجید نے کئی آیات کے اندر ذکر کیا ہے از جملہ سورۂ نساء میں یہود کے اس طرزِ تدین کو اسطرح مذمت کیا ہے کہ

"إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَالِكَ سَبِيلًا" (سورہ نساء آیت نمبر ۱۵۰)

کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ اور رسول ﷺ کے درمیان بھی فرق ڈالتے ہیں کہ رسول ﷺ کو خدا سے الگ اور خدا کو رسول ﷺ سے الگ سمجھتے ہیں یعنی خدا کو مانتے ہیں لیکن رسول ﷺ کو نہیں مانتے۔ یہود اس طرح سے سوچتے تھے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتے، ہم بعض پر عمل کرتے ہیں و بعض کو قبول نہیں کرتے۔ اسی طرح کا مطلب قرآن مجید نے آغازِ سورہ بقرہ میں بیان کیا ہے کہ یہ دینداری جو تم نے اپنا رکھی ہے، یہ قابلِ مذمت ہے۔ درحقیقت مسلمانوں کو متوجہ کرنا ہے کہ اس طرح سے دین نہیں

اپنانا کہ آپ کچھ کو مان لو اور کچھ کو چھوڑ دو، اگر ماننا ہے تو مکمل دین کو ماننا ہوگا اور اگر رد کرنا ہے تو مکمل دین کو رد کرنا ہوگا اگر کچھ کو اپنایا اور کچھ کو چھوڑ دیا تو مجموعی طور پر اس کو جھٹلانا ہی تصور کیا جائے گا کہ یہ دینداری نہیں ہے۔

قبولیتِ دین کے بعد انسان پابندِ دین ہوتا ہے:

جب انسان مسلمان ہو جاتا ہے، اسلام قبول کر لیتا ہے تو پھر وہ پابند ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے اسلام نے جو نظام مقرر کیا ہے اس کے تحت آئے اور اس کو برپا کرے، ہر نظام میں رہ کر نماز پڑھ لینے کو قرآن دینداری نہیں کہتا۔ ہماری ذہنیت اور نفسیات یہ بنی ہوئی ہیں ہم کسی جگہ بیٹھ کر نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کو دینداری کہتے ہیں، ہم خود کو سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان اور متدین ہیں۔ یہود معتقد تھے کہ

''......لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَعْدُوْدَةً......''

(سورہ بقرہ آیت نمبر ۸۰)

ہمیں آگ نہیں چھوئے گی چونکہ

''......نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّاؤُهُ......''

(سورہ مائدہ آیت نمبر ۱۸)

یہ کہتے تھے معاذ اللہ، ہم خدا کے محبوب اور برگزیدہ ہیں اور ہم روئے زمین پر وہ تنہا مخلوق ہیں جنہیں خدا نے چن لیا ہے اور خدا کی تمام نعمتیں ہمارے لیے ہیں۔ آخرت، جنت اور یہ ساری نعمتیں ہمارے لیے ہیں، یہ گمان کرتے تھے کہ ہم ''احباء الله''، ''اولیاء الله'' اور ''ابناء الله'' ہیں لیکن درحقیقت یہ دین فروشی کرتے تھے اور جو کچھ خدا نے بتایا تھا اس کے برخلاف عمل کرتے تھے۔

خود سازی سے دین کامل نہیں ہوتا:

آج مسلمانوں کے اندر یہی احساس نظر آتا ہے کہ اپنے آپ کو برگزیدہ قوم سمجھتے ہیں، جبکہ مکمل طور پر خدا کے نظام سے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خدا پر ایمان ہے لیکن خدا کے بنائے ہوئے طریقۂ کار کے مطابق زندگیاں بسر نہیں کر رہے ہیں۔ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہم کسی بھی سرزمین پر رہ کر اگر انفرادی اعمال عبادات بجا لائیں تو ہم بہت بڑے مسلمان ہیں پھر ہم ''احباء الله'' و ''اولیاء الله'' ہیں اور خداوند تعالیٰ کی دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں ہماری ہیں۔ اتفاقاً یہی مسلمان جب باہر کے ممالک میں جاتے ہیں تو وہاں پر ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ جب تک آپ اس مملکت میں رہیں گے اس مملکت کے تمام قوانین پر پابندی کیساتھ عمل کریں گے، مثلاً اگر کوئی مغربی ممالک کا شہریت لینا چاہتا ہے تو وہ عدالت میں باقاعدہ مقدس کتاب کے اوپر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کرتا ہے کہ میں اس ملک کی تہذیب، ثقافت، نظام، حکومت، قوانین اور ہر چیز کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کے مطابق میں اپنی زندگی بسر کروں گا اور بڑی سختی اور پابندی سے عمل کرتے ہیں، حتیٰ اپنے گھروں کے اندر جہاں ان کی نجی زندگی ہے وہاں بھی اس نظام کو فالو کرتے ہیں مثلاً وہاں کے قانون میں ہے کہ والدین بچوں کو مار نہیں سکتے اگر ماریں گے تو مجرم ہیں، بچوں کو سات یا آٹھ سال کی عمر میں پولیس ایک ٹیلیفون نمبر دیتی ہے کہ والدین اگر تنگ کریں تو آپ فون کر دیں، اب پولیس بغیر حیل و حجت کے والدین کو اٹھا کر جیل میں ڈال دیتی ہے جب تک وہ اپنی صفائی نہ پیش کریں کیونکہ وہاں کا قانون ہے کہ آپ بچے کو کچھ نہیں کہہ سکتے، آپ صرف بچے کے خدمت گزار ہیں، اس کی ضروریات پوری کریں۔

پس آپ دیکھیں کہ یہی مسلمان سیاسی طور پر جس ملک میں جاتے ہیں اس ملک کے سیاسی نظام کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، اس کی اتباع کرتے ہیں، اس کی مکمل طور پر اطاعت کرتے ہیں، ذرہ برابر اس کی مخالفت نہیں کرتے، سختی سے پابندی کرتے ہیں حتیٰ وہاں کے مقامی لوگ بعض اوقات قانون شکن ہوتے ہیں لیکن یہاں سے گئے مشرقی مسلمان یہ قانون شکنی نہیں کرتے، یہ باقاعدہ قوانین کی پابندی کرتے ہیں مثلاً وہاں کے جو ٹریفک قوانین ہیں، ان کی سختی سے یہ لوگ پابندی کرتے ہیں، آدھی رات کو کسی تاریک گلی میں جا رہے ہوں، وہاں کوئی ٹریفک، کوئی بندہ اور بشر نہ ہو

> **دین اپنانے سے پہلے انسان آزاد ہے کہ وہ چاہے تو دین، ایمان اور انبیاء علیہم السلام کے راستے پہ چلے یا ضلالت، گمراہی، کفر اور شیاطین کے راستے پہ چلے۔ لیکن اپنے ارادے، اختیار اور اپنی معرفت کی بنیاد پر جب ایمان انتخاب کر لیتا ہے پھر اسے خدا کا مقرر کردہ راستہ اپنانا ہوگا، ہدایت کی راہ پر اس کو چلنا ہوگا، پھر اس کے بعد انسان کی آزادی محدود ہو جاتی ہے**

پھر بھی یہ وہاں کراسنگ پہ جا کر رکتے ہیں چونکہ وہاں کے قانون میں ہے۔

صرف عبادتوں سے مسلمان یا مومن نہیں بن سکتے:

جولوگ مغربی ممالک کے شہری بننا پسند کرتے ہیں تو یہ ساری چیزیں قبول کرتے ہیں، عہد بھی کرتے ہیں اور عملاً اس کو ثابت بھی کرتے ہیں لیکن یہی لوگ جب اسلام قبول کرتے ہیں اسلام کے تقاضے پورے نہیں کرتے، ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم جہاں بھی رہیں نماز پڑھیں، چند عبادتیں کریں، ماہِ رمضان میں روزے رکھیں، رسومات انجام دے دیں اور محرم میں عزاداری کرلیں تو ہم نے اسلام پر عمل کرلیا باقی نظامِ سیاسی، نظامِ اجتماعی، اسلامی عدالتی قوانین، اسلامی کلچر اور اسلامی نظامِ تعلیم وغیرہ سے کوئی غرض نہیں ہے، بچے کس سکول میں پڑھتے ہیں؟ ہم جاب کہاں کرتے ہیں؟ معیشت کہاں سے آتی ہے؟ ان سے ہمارا کوئی غرض نہیں ہوتا ہے، ہم ان چیزوں سے خود کو آزاد سمجھتے ہیں۔

کیا ہم ہر اُس معیشت کو اپنا سکتے ہیں جس سے درآمد زیادہ ہو؟ کیا ہر طرز کی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں؟ ہر سوسائٹی میں زندگی بسر کرسکتے ہیں؟ ہر طرح کا لباس پہن سکتے ہیں؟ ہر طرح کی رفت وآمد رکھ سکتے ہیں؟ ہر طرح کے روابط برقرار کر سکتے ہیں؟ ہم خود کو اس پہلو سے مکمل آزاد سمجھتے ہیں اور ذرہ برابر پریشان نہیں ہیں۔ حتیٰ علماء بھی اس طرح کی زندگی اپنانے میں اپنے لیے کوئی مشکل نہیں سمجھتے، اسی کو قرآن کہتا ہے کہ یہ یہود کا طرزِ دینداری ہے کہ آپ عبادتیں دین کی کرلیں، رسومات دینی بجالائیں لیکن نظامِ دین کی کوئی اتباع نہ کریں۔

امت سازی کا پہلا مرحلہ:

امت سازی کے لئے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان نظریاتی طور پر دین کو سمجھ لیں، جب تک انسان نظریاتی طور پر دین کو سمجھ نہیں لیتا تب تک دین کا اصلی ہدف ومقصد اور امت سازی کا عمل انجام نہیں پاسکتا۔ یہ سیکولرازم یا لبرل ازم ہے کہ دین آپ کی انفرادی زندگی کا حصہ ہے، نجی زندگی میں دین شمار ہوتا ہے لیکن اجتماعی زندگی میں دین نہیں ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے اس وقت مسلمان ممالک میں رہتے ہوئے بھی دین کو اپنی نجی زندگی کا حصہ بنایا ہوا ہے اور ان کی اجتماعی زندگی میں دین کی کوئی جھلک نہیں ہے مثلاً ہم پاکستان میں دیکھیں ہمارا نجی دین ہے، ہم اپنے گھروں میں انفرادی طور پر جو کوئی دینی عمل کرنا چاہیں کرلیں لیکن جب آپ اپنے گھر سے باہر سوسائٹی میں جاتے ہیں تو وہاں پر آپ دین پر عمل نہیں کریں گے آپ کو جو ملکی قانون بنا ہوا ہے اس کے مطابق چلنا ہوگا۔ یہ نادرست دینداری ہے یہ بھی صدیوں کی غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کو پہلے علمی اور نظریاتی طور پر تدریجاً ان چیزوں سے ہٹایا گیا پھر عملی طور پر بھی اس سے بہت دور کردیے گئے ہیں۔ یا برعکس کہ پہلے عملی طور پر دور ہوئے ہیں پھر علمی طور پر دور ہوئے ہیں۔ آج آپ مختلف فرقوں کی کتابوں میں تلاش کریں مثلاً آپ شیعہ کی مذہبی کتابوں میں دیکھیں انفرادی دین کے علاوہ آپ کو اجتماعی تعلیمات نظر نہیں آتیں۔ مثلاً ماہِ رمضان کے نجی فرائض، نجی مستحبات، واجباتِ شخصی وانفرادی ہمیں ملیں گے لیکن اجتماعی فرائض کیا عائد ہوتے ہیں، آیا دین کوئی اجتماعی سوچ بھی دیتا ہے، آیا دین کی اجتماعی زندگی کی طرف بھی توجہ ہے یا نہیں ہے؟ اس سے ہماری تعلیمات بالکل خالی ہیں جبکہ قرآن میں معاملہ برعکس ہے۔

نجی زندگی کے فرائض کے حدود:

قرآن مجید نجی زندگی کے فرائض اسی حد تک بیان کرتا ہے جتنی نجی زندگی کا دائرہ ہے۔ نجی زندگی کا دائرہ بہت چھوٹا ہے اس لئے قرآن اجتماعی زندگی کی طرف توجہ دے رہا ہے چونکہ اجتماعی زندگی کا دائرہ وسیع ہے۔ ہم اگر اپنے چوبیس گھنٹوں کو دیکھیں کہ اس میں ہمارے اجتماعی ونجی گھنٹے کتنے ہیں، نجی منٹس اور اجتماعی منٹس کتنے ہیں تو ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ ہمارا کتنا وقت

> **یعنی دیندار ہوکر غیر دینی راستوں پر چلنا اور خود کو دیندار بھی کہلوانا اسی طرح اپنے آپ کو دینی انجام ودینی اجر کا مستحق بھی سمجھنا، یہ یہود کا طریقہِ کار ہے اور قرآن مجید نے اس طرز کی دینداری کی مذمت کی ہے۔ اب یہود سے یہ دینداری سیکھ کر مسلمانوں نے بھی یہی طریقہ کار اپنایا ہے کہ دینی فرائض میں سے بعض کو لے لیا ہے اور بعض کو چھوڑ دیا ہے اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ ہم دین پر عمل پیرا ہیں**

> قرآن مجید نے آغازِ سورۂ بقرہ میں بیان کیا ہے کہ یہ دینداری جو تم نے اپنا رکھی ہے، یہ قابلِ مذمت ہے۔ درحقیقت مسلمانوں کو متوجہ کرنا ہے کہ اس طرح سے دین نہیں اپنانا کہ آپ کچھ کو مان لو اور کچھ کو چھوڑ دو، اگر ماننا ہے تو مکمل دین کو ماننا ہوگا اور اگر رد کرنا ہے تو مکمل دین کو رد کرنا ہوگا اگر کچھ کو اپنایا اور کچھ کو چھوڑ دیا تو مجموعی طور پر اس کو جھٹلانا ہی تصور کیا جائے گا

شخصی ہے اور کتنا اجتماعی ہے۔ مثلاً ہماری نجی زندگی وہی ہے جب ہم اجتماع، سوسائٹی، گھر اور دوسرے افراد سے الگ ہو کر خلوت میں جاتے ہیں، جس لمحے آپ اپنی سوچ، عمل، خواہش اور فکر میں تنہا ہیں وہ آپ کا نجی لحظہ ہے لیکن جس لمحے آپ تنہا بیٹھ کر اجتماعی سوچ کر رہے ہیں مثلاً سوسائٹی کے کسی مسئلے کے بارے میں سوچ رہے ہیں اس وقت آپ نجی زندگی میں نہیں ہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں ہیں، اکیلے بیٹھ کر اجتماعی زندگی میں کوئی رول ادا کر رہے ہیں اگر ہم مجموعی طور پر دیکھیں ذہنی اور فزیکلی طور پر چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چار گھنٹے ہمارے نجی گھنٹے شمار ہوتے ہیں بیس گھنٹے اجتماع میں بسر ہوتے ہیں۔ یہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تناسب ہے۔

قرآن ہدایت ہے اور یہ چوبیس گھنٹوں کے لئے ہدایت ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن صرف چار گھنٹوں کے لئے راہنمائی کرتا ہو۔ بیس گھنٹے کیسے بسر کرنے ہیں؟ اجتماعی امور اور اجتماعی نظام کیسے تشکیل دینا ہے؟ یہ ہدایت ہم کہاں سے لیں؟ اس میں دین نے ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے کہ خود مطالعات و تجربات کے ذریعے اپنا نظام کشف کریں، یہ اثاثی گمراہی و انحراف ہے جو مسلمانوں کی تعلیمات میں شامل ہوا ہے اور آج تک جاری ہے اور جس کے ناقابلِ تلافی نقصانات ہوئے ہیں اور اب بھی جاری ہیں لیکن جس طرح امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عصر، عصرِ احیائے دین ہے، عصرِ تجددِ دین ہے یعنی اب نشاطِ ثانیہ ہے دوبارہ دین زندہ ہو رہا ہے اور یہ حرکت انقلابِ اسلامی سے شروع ہوئی ہے البتہ کچھ سنی و شیعہ علماء پہلے بھی اس فکر میں تھے کہ اسلام کی تجدیدِ حیات کی جائے جس طرح علامہ اقبالؒ، سید جمال الدین افغانیؒ، سید قطبؒ اور اس طرح کے دیگر علماء کوشش کرتے رہے ہیں اور یہ انفرادی طور پر کوشش کرتے رہے ہیں۔

تجدّید اسلام کی ضرورت:

امام خمینیؒ نے زیادہ موافقیت کے ساتھ یہ احساس بیدار کیا ہے کہ اسلام کو دوبارہ احیاء کی ضرورت ہے، از سرِ نو اسلام کی شناخت کی ضرورت ہے وہ تقلیدی شناخت جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ ایک نسل نے کچھ پڑھا اس کے آنے والی نسل نے بغیر سوچے سمجھے وہی پڑھا، اس کے بعد آنے والی نے بھی اس کو تبرک سمجھ کر وہی پڑھا یہ غور کیے بغیر کہ جو ہم پڑھ رہے ہیں یا پڑھا رہے ہیں یہ کس کام آتا ہے، آیا یہ واقعاً دین ہے، یہ سارا دین ہے یا نہیں ہے؟ اس طرف توجہ کیے بغیر دیکھا دیکھی ہم اس کو نسل در نسل میراث قرار دے کر چلتے آئے لیکن اب جبکہ تجدیدِ حیاتِ دین ہے، دوبارہ دین زندہ ہو رہا ہے، دوبارہ زندگی کے لئے اس کو از سرِ نو شناخت کی ضرورت ہے، از سرِ نو یعنی نئی مجدد شناخت کی ضرورت ہے، مجدد شناخت میں بھولے ہوئے اور فراموش شدہ امور، اصول و فرائض کو زندہ نہ کر سکیں تو ہم ناکام ہیں۔ امت سازی کا فریضہ قرآن مجید کے ان فراموش شدہ فرائض میں سے ہے جو قرآن میں بہت واضح ہیں لیکن امت کے اندر بالکل مخفی ہیں۔ ہم قرآن پڑھیں تو ہر آیت ہمیں امت، اجتماع یا سوسائٹی کے بارے میں کوئی نہ کوئی فریضہ مقرر کر رہی ہے اور ان آیات سے ہم گزر جاتے ہیں اور سرّے سے توجہ ہی نہیں کرتے، ہم قرآن کو رمضان میں سب سے زیادہ پڑھتے ہیں لیکن ان آیات سے گزر جاتے ہیں چونکہ ہماری ذہنیت کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، ہماری ذہنیت کے مطابق ان کے اندر پیغام نہیں ہے۔

امت سازی ندائے قرآن:

"وَلۡتَكُنۡ مِنۡكُمۡ اُمَّةٌ......" (سورہ آل عمران آیت نمبر۱۰۴)

یعنی امت بنو اور امت بناؤ۔ امت سازی تمہارا فریضہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح انفرادی طور پر نماز، روزہ، حج اور دیگر واجبات تمہارے فریضے ہیں۔ یوں نہیں کہ تم پہلے امت بناؤ بلکہ پہلے تم امت بنو، تم خود امت ہو جاؤ جب تم سے امت کا آغاز ہوگا پھر دوسرے تمہارے ساتھ امت سازی

جو لوگ مغربی ممالک کے شہری بننا پسند کرتے ہیں تو یہ ساری چیزیں قبول کرتے ہیں، عہد بھی کرتے ہیں اور عملاً اس کو ثابت بھی کرتے ہیں لیکن یہی لوگ جب اسلام قبول کرتے ہیں اسلام کے تقاضے پورے نہیں کرتے، ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم جہاں بھی رہیں نماز پڑھیں، چند عبادتیں کریں، ماہِ رمضان میں روزے رکھیں، رسومات انجام دے دیں اور محرم میں عزاداری کر لیں تو ہم نے اسلام پر عمل کر لیا باقی نظامِ سیاسی، نظامِ اجتماعی، اسلامی عدالتی قوانین، اسلامی کلچر اور اسلامی نظامِ تعلیم وغیرہ سے کوئی غرض نہیں ہے

میں شریک ہوں گے لہٰذا پہلے اپنے آپ سے امت سازی کا آغاز کرنا ہے، دین میں رہ کر ہم نے جو آزادی کو اپنایا ہوا ہے اور مومن بنے ہوئے ہیں اور احباء اللہ و اولیاء اللہ کی چادریں اور لبادے اوڑھے ہوئے ہیں ہمیں اپنی ذہنیت کی اصلاح کرنی ہے۔ ہم نے دین کو جب اپنایا ہے تو پھر آزادی ختم ہے، دین میں آ کر اب آزادی نہیں ہے کہ ہم جس نظام کے تحت مرضی آئے زندگی بسر کریں ہمارے لیے ایک ہی معین راستہ ہے اس کے علاوہ کوئی بھی متبادل راستہ ہمارے پاس نہیں ہے اور وہ یہ کہ تم امت بنو، امت بن کر جیو، امت کی شکل اپناؤ اور امت کے ساتھ زندگی بسر کرو، امت سے باہر نہیں رہ سکتے یعنی تمہاری زندگی دو حصوں میں تقسیم ہونی چاہیے کہ ایک حصہ امت سازی میں یعنی امت بننے اور بنانے میں صرف ہو اور دوسرا حصہ امت بننے کے بعد فرائض کی انجام دہی کے لئے ہو، پہلے ہم پر امت بننے کے فرائض عائد ہوتے ہیں امت بننے کے بعد کے فرائض ایک اگلا مرحلہ ہے۔

زمانۂ غیبت زمانۂ امت سازی:

اگر ہم زمانۂ انتظار، زمانۂ غیبتِ کبریٰ کی دقیق تشریح کریں اور تفسیر و عنوان دیں تو یہ زمانہ امت سازی کا ہی زمانہ ہے، زمانۂ انتظار یعنی زمانۂ امت سازی۔ چونکہ ایک امام امت سے دور ہیں و امت امام سے محروم ہے، امام زندہ ہیں، موجود ہیں لیکن وہ امت کی دسترس میں نہیں ہیں، کیوں نہیں ہیں؟ چونکہ اس قوم نے امت بننے کا اہم فریضہ ابھی تک انجام نہیں دیا یعنی دوسرے لفظوں میں یہ قوم، فرقے، قبیلے، گروہ، دھڑے اور حزبیں ہیں ابھی امت بننا باقی ہے اس لیے امامت کا جزء ابھی تک اس نظام کے ساتھ ملحق نہیں ہو رہا چونکہ پہلا امت بننا ہے اور وہ تشکیل نہیں پایا۔ امت سازی کے لئے وہی نظریاتی ذہنیت بنانا ضروری ہے کہ ہم اس بات پر ایمان لے آئیں کہ جب دین اپنایا ہے تو مکمل طور پر نظامِ دین بھی ہونا چاہیے اور یہ اہم فریضہ اجتماعی مدِ نظر ہو، جب عملی مراحل میں ہم آتے ہیں امت سازی کے عملی مراحل میں قرآن آتا ہے چونکہ رسول اللہ ﷺ نے انفرادی فرائض بعد میں بتائے، پہلے اجتماعی فرائض لوگوں کے اوپر لاگو کئے یعنی پہلے مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے، مکہ میں نمازیں پڑھی جاسکتی تھیں لیکن نظام نہیں بنایا جا سکتا تھا مکہ چھوڑنے کی بڑی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں نماز پڑھنے کی گنجائش نہیں تھی، پڑھ سکتے تھے، رسول اللہ ﷺ خود پڑھتے تھے لیکن ابھی امت کے لئے نماز فرض نہیں ہوئی تھی دوسروں کو نہیں کہا تھا کہ آپ نماز پڑھو، فقط رسول اللہؐ خود نماز پڑھتے تھے لیکن دوسرے فرائض مدینہ میں آ کر مسلمانوں پر ایک ایک کر کے عائد ہونا شروع ہوئے، جب امت سازی کا کام شروع ہوا و امت بن گئی اس کے بعد اب انفرادی زندگی کو منظم کرنا شروع کیا پہلے مکہ میں اجتماعی زندگی منظم ہوئی ہے، مکہ میں انفرادی اسلام مکمل طور پر لاگو ہو سکتا تھا، اس پر عمل ہو سکتا تھا لیکن اجتماعی اسلام کے لئے زمین ہموار نہیں تھی لہٰذا ہجرت کا حکم دے دیا گیا کہ یہ زمین چھوڑ دو، جہاں پر آپ اجتماعی دین برقرار نہیں کر سکتے، امت نہیں تشکیل دے سکتے، اس زمین میں رہنے کا کیا فائدہ، اس زمین میں حج، عبادتوں، نمازوں اور روزوں کا کیا فائدہ جس زمین پر آپ امت سازی کا کام انجام نہیں دے سکتے۔

امت سازی کے لئے دین کا جاری کردہ نظام:

امت سازی کے لئے دین نے ایک پورا نظام مقرر کیا ہے کہ امت بننے تک کیا مراحل طے کرنے ہیں؟ مراحلِ امت سازی، وارکانِ امت سازی کیا ہیں اور کن اسباب و ذریعوں سے ہم نے امت تک پہنچنا ہے یا کس طرح ترقی کر کے ہم امت کے درجے پر فائز ہو سکتے ہیں جہاں پر ہمیں قرآن مجید کا یہ خطاب ملے گا کہ

"......اُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (سورہ بقرہ آیت نمبر۵)

ابھی ہم مفلسون ومفلکون ہیں مفلحون نہیں ہیں۔اس وقت افلاک و افلاس ہمارادامن گیر ہے،ہمیں اس سے نکلنے کے لئے ،مفلحون بننے کے لئے امت سازی کا سفر شروع کرنا ہے۔اگر ہم امت کے معنی میں غور کریں تو وہیں سے بہت سارے مراحل امت سازی کے روشن ہوجاتے ہیں، وظائف معلوم ہوجاتے ہیں کہ کیا کیا فریضے اوراعمال ہمیں انجام دینے ہیں تا کہ مسلمان امت کی شکل اختیار کرلیں۔

امت بننے کے لئے سب سے پہلا رکن:

امت کی تشکیل یاامت سازی کے لئے سب سے پہلا رکن اجتماع ہے۔ یعنی دین کے محور میں انسانی اجتماع کوامت کہتے ہیں۔اجتماع یعنی آپس میں متحد ہوں تا کہ انفرادی حالت سے باہر آئیں اور اجتماع کی لڑی میں پروئے جائیں۔امت کی طرف سفر کرنے کے لئے پہلا رکن دین بیان کرتا ہے البتہ نظریاتی مرحلے کے بعد عملی مرحلے کی طرف پہلا رکن وحدت ہے جیسا کہ قرآن میں خداوندتعالی کا ارشاد ہے

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا......"

(سورہ آل عمران آیت نمبر۱۰۳)

"حبل اللہ کوسب مل کرتھامواورتفرقے میں مت پڑو۔۔۔۔"

قرآن مجید کا یہ حکم اسلام کے اہم ترین فریضے کا پہلا رکن ہے اور وہ فریضہ امت سازی ہے۔خودسازی ایک انفرادی فریضہ ہےاورامت سازی اجتماعی فریضہ ہےاور یہ دونوں ہی اہم فریضے ہیں۔امت سازی کے لئے ہمیں پہلا رکن امت ایجاد کرنا ہے یعنی پراکندگی وانتشار سے نکل کر اجتماع بنانا ہےاور آپس میں جمع ہونا ہےاس کے لئے دینی تعبیر جماعت ہے۔جماعت کا لفظ جو روایات میں استعمال ہوا ہے وہ ایک خاص معنی کے لئے استعمال ہوا ہےاور اس کا مترادف بھی امت ہے، آج کل جماعت حزب کے لئے استعمال کرتے ہیں، جماعت کا معنی امت ہے جودین کا آئیڈیالوجیکل معنی ہے۔ دین نے جس مفہوم میں لفظ جماعت استعمال کیا ہے اس سے مرادحزب یا پارٹی نہیں ہے۔آج جماعت اردو زبان میں پارٹی اور حزب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔بعض پارٹیوں نے اپنے لئے لفظ جماعت استعمال کیا ہے، عربی زبان،قرآن اور دین کی اصطلاح میں جماعت حزب یا پارٹی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ امت کے معنی میں ہے، جماعت اسی جمع سے ہے۔یعنی قرآنی تعبیر کے مطابق سب مل کرحبل اللہ کوتھامنے،حبل اللہ کے محور میں جمع ہونے کو جماعت کہتے ہیں۔

دین بلا ھدف وحدت کا حکم نھیں دیتا:

دین کہیں بھی ہدف کے بغیر متحد ہونے کا حکم نہیں دیتا،جس طرح آج کل ہرآدمی یہ کہتا ہے کہ علماء،عوام، جماعتیں اورفرقے آپس میں متحد نہیں ہوتے، انھیں متحد ہونا چاہئے۔اس سے آگے کچھ بھی نہیں جانتے،صرف اتنا تقاضا کرتے ہیں کہ بس انہیں متحد ہونا چاہئے۔اگر یہ امت بلاجہت، بلاہدف اور بلامقصد ایک ہوجائیں تو یہ وحدت تفرقے سے زیادہ نقصان دہ ہے۔سب کی فطرت کے اندر یہ موجود ہے کہ جو برکات وحدت کے اندر ہیں وہ تفرقہ، جدائی اورعلیحدگی کے اندر نہیں ہیں۔ ہرایک اپنی عقل اورشعور سے بخوبی سمجھتا ہے کہ وحدت کے ذریعے سے ہی دین،اسلام اورمسلمان ترقی کرسکتے ہیں یا طاقت ور بن سکتے ہیں اور یہ بغیر وحدت کے ممکن نہیں ہے۔

لیکن اگر بغیر ہدف کے اندھی وحدت ہوتو یہ نقصان دہ وحدت ہے۔بغیر ہدف کے وحدت کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے ہم نعرے لگائیں اور جلسے کرائیں کہ گندم اور گھن میں وحدت ہونی چاہئے کیوں کہ یہ الگ الگ رہ رہے ہیں اور جب اکٹھے کربھی دیتے ہیں تو یہ سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ ان میں تفرقہ پربرکت تر ہے یعنی گندم اگرگھن سے دور رہے،تھوڑی ہوگی لیکن بہتر اورمحفوظ ہوگی اوراگرآپ نے معیار کے بغیر گھن کوگندم کے ساتھ متحد کردیا

مثلاً آپ شیعہ کی مذہبی کتابوں میں دیکھیں انفرادی دین کےعلاوہ آپ کواجتماعی تعلیمات نظر نہیں آتیں۔مثلاً ماہِ رمضان کے نجی فرائض، نجی مستحبات، واجباتِ شخصی وانفرادی ہمیں ملیں گے لیکن اجتماعی فرائض کیا عائد ہوتے ہیں، آیا دین کوئی اجتماعی سوچ بھی دیتا ہے، آیا دین کی اجتماعی زندگی کی طرف بھی توجہ ہے یا نہیں ہے؟اس سے ہماری تعلیمات بالکل خالی ہیں جبکہ قرآن میں معاملہ برعکس ہے۔

> **امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عصر، عصرِ احیائے دین ہے، عصرِ تجددِ دین ہے یعنی اب نشاطِ ثانیہ ہے دوبارہ دین زندہ ہو رہا ہے اور یہ حرکت انقلابِ اسلامی سے شروع ہوئی ہے البتہ کچھ سنی وشیعہ علماء پہلے بھی اس فکر میں تھے کہ اسلام کی تجدیدِ حیات کی جائے جس طرح علامہ اقبال، سید جمال الدین افغانی، سید قطب اور اس طرح کے دیگر علماء کوشش کرتے رہے ہیں اور یہ انفرادی طور پر کوشش کرتے رہے ہیں۔**

تو یہ گندم کی نابودی ہے، ممکن ہی نہیں ہے کہ ان میں وحدت ہو۔ جس طرح کفار آ کر رسول اللہؐ سے کہتے تھے کہ ہم سب قریش اور عربی ہیں، ہمارا خاندان ایک ہے اور ایک ہی سرزمین کے رہنے والے ہیں، ہمارا سب کچھ ایک ہے، فقط دین کی وجہ سے آپس میں جدائی درست نہیں ہے، بیشک آپ کا اپنا دین ہے اور ہمارا اپنا دین ہے لیکن ہمیں متحد ہونا چاہیے اس وقت قرآن مجید کی یہ سورہ اُتری کہ

"قُلْ یَاأَیُّهَا الْکَافِرُوْن. لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ" (سورہ کافرون آیت ۱،۲)

کفر او رایمان کی وحدت نہیں ہوسکتی کہ ہمارا نکتۂ اشتراک کوئی بھی نہیں ہے بلکہ خطرناک ہے شرک وکفر اگر ایمان کے ساتھ جمع ہوجائیں تو شرک ایمان کو کھا جاتا ہے، مشرک مومن پر غالب آجاتا ہے، کافر ہمیشہ مومن پر غالب آجاتا ہے لہٰذا سریع اعلان کیا کہ یہ وحدت نہیں ہوسکتی۔

"لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ" (سورہ کافرون آیت ۶)

تمہارا راستہ تمہارے لئے اور ہمارا راستہ ہمارے لئے ہے لیکن دوسری طرف سے آ کر وہ طبقہ جو ایمان کے سائے میں الگ ہوا ان کو حکم دیا کہ

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا......"

(سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۰۳)

"سب مل کر حبل اللہ کو تھام لو......"

امت سازی کے لئے مرکز و محور کی ضرورت:

امت کے لئے وحدت کا حکم ہے لیکن وحدت سے پہلے اس کا محور معین ہونا چاہیے کہ کس محور میں ایک ہوں؟ وحدت کا شعار دینے سے پہلے وحدت کا معیار ومحور فراہم کرنا ضروری ہے یعنی حبل اللہ موجود ہو اور حبل اللہ لے کر جائیں اور کہیں کہ اس کے گرد ہمیں جمع ہونا ہے صرف جمع ہونا نہیں ہے چونکہ کہ صرف جمع ہونا یہ کوئی وحدت کا معیار نہیں ہے قرآن نے معین کر دیا ہے کہ حبل اللہ کے گرد جمع ہونا ہے، حبل اللہ یعنی دین، حبل اللہ یعنی آئینِ خدا ہے۔

وحدت کے لئے پہلے حبل اللہ اور آئیڈیالوجی چاہیے، آئیڈیالوجی کے اوپر لوگوں کو دعوت دی جاسکتی، بغیر محور کے وحدت بہت نقصان دہ ہے مثلاً اگر کسی کی شادی ہو تو کارڈ بھیجے جاتے ہیں، ایک دفعہ ایسا ہو کہ شادی نہ ہو لیکن لوگوں کو کارڈ بھیج دیں کہ فلاں دن جمع ہوجائیں، لوگ آ کر پوچھیں کہ کیوں جمع کیا ہے؟ کہیں چونکہ جمع ہونے میں برکت ہے اس لئے آپ کو جمع کیا ہے، اس اجتماع کا کیا نتیجہ ہوگا؟ شادی میں بلائیں تو سب کو پتہ ہوتا ہے کہ ولیمہ کھانا ہے، مبارکباد دینی ہے اور رسومات میں شرکت کرنی ہے لیکن اگر شادی، ولیمہ وغیرہ کچھ بھی نہ ہو اور ایسے ہی لوگوں کو بلایا جائے یہ اجتماع خطرناک ترین اجتماع ہوگا کیوں کہ اس کا کوئی محور و مرکز نہیں ہے۔ لہٰذا وحدت سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ آئیڈیالوجی ہے یعنی وحدت کا دعوت نامہ آئیڈیالوجی ہے۔

مصادیقِ حبل اللہ:

قرآنِ مجید، دین اور رسول اللہ ﷺ کی ذات حبل اللہ کے مصادیق ہیں جیسے قرآن مجید کی ایک اور اصطلاح ہے عروۃ الوثقیٰ سے تمسک کرو اور روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ کے متعدد مصادیق ہیں اسی طرح حبل اللہ کے بھی متعدد مصادیق ہیں کہ سب ایک ہی مصداق کے مختلف پہلو ہیں نہ یہ کہ کئی حبل اللہ ہیں، ایک ہی رسی ہے اس ایک رسی کے کئی پہلو ہیں، جس پہلو سے ہم تمسک کریں گویا کہ ہم نے حبل اللہ سے تمسک کیا ہے اور جامع ترین مصداق حبل اللہ کا خود دینِ خدا ہے یعنی دین کے محور میں اکٹھے ہوں۔ پس وحدت دین کے محور میں ہونی چاہئے، تنہا وحدت جو امت سازی کی طرف انسان کو لے جاتی ہے وہ دین کے محور میں وحدت ہے ورنہ قومیت، لسانیت، علاقیت، رنگ ونسل، قبیلے، نسب، مفادات اور اقتدار کی بنیاد پر جو وحدتیں ہے یہ امت کی طرف نہیں

لے جاتیں بلکہ ان کا رخ کسی اور طرف ہے ممکن ہے ان وحدتوں کے اندر بھی فوائد ہوں لیکن ان وحدتوں کے ذریعے سے انسان ہرگز امت نہیں بن سکتا، امت بننے کے لئے پہلا رکن حبل اللہ کے محور میں وحدت کا ہونا ہے۔

حبل اللّٰہ کا جامع ترین مصداق دین الٰھی:

دین الٰہی یعنی وہی الٰہی آئیڈیالوجی اور نظریہ ہے، اس نظریے کے گرد جمع ہونے کے لئے سب کچھ چھوڑنا پڑے گا جو حبل اللہ سے ہٹ کر اپنایا ہوا ہے، حبل اللہ یعنی دین کے محور میں آنا ہونا ہوگا۔ ہم اپنی پارٹی کا نام جماعت رکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ دینی جماعت ہے، اسی طرح کسی بھی میٹنگ کی بسم اللہ سے ابتداء اور دعائیہ جملات سے اختتام کر کے سمجھتے ہیں یہ دینی میٹنگ ہے اور سمجھتے ہیں کہ حبل اللہ اس چیز کا نام نہیں ہے۔ یہ حبل اللہ نہیں ہے، حبل سے مراد یعنی مکمل طور پر دین کے علاوہ جو نظریات اور معیارات ہیں ان کو ترک کرنا، سب کچھ چھوڑ کر ہر چیز کو دین کے محور میں اپنا لینا، اپنے تمام نظریات اور افکار دینی بنا لینا اس کو حبل اللہ کہتے ہیں۔

ابھی ہم جماعتیں بناتے ہیں پھر ان میں سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے الگ الگ کوٹے ہوتے ہیں، سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب یہ بیچ میں کہاں سے آیا یہ تو حبل اللہ کے گرد جمع ہونے کے لئے بنائی گئی تھیں، حبل اللہ میں یہ جغرافیائی تقسیم کہاں سے آ گئی؟ پس اندھی اور بے جہت وحدت کا نعرہ انسان کو نقصان دیتا ہے جبکہ نظریاتی، مکتبی اور قرآنی وحدت انسانوں کو امت بناتا ہے۔

امت سازی کے لئے طرزِ رسول اللّٰہ ﷺ:

رسول اللہ ﷺ نے جو امت بنائی اس امت کو سب سے پہلے ہی ایک ہونے کو نہیں کہا بلکہ پہلے ان سارے تشخصات اور معیارات کو ختم کیا جن سے وہ جانے پہچانے جاتے تھے وہ قریشی، مکی، مدنی اور عرب و عجم جیسے تشخصات میں بٹے ہوئے تھے، آپؐ نے سب سے پہلے ان کی اس قسم کے تشخصات کو ختم کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے امت بنانے کے لئے یہ طریقہ کار بھی نہیں اپنایا کہ امت بننے کے لئے فلاں صوبے سے اتنے لوگ آؤ، فلاں علاقے اور قبیلے سے اتنے آؤ، ایسا بھی نہیں کیا یہ بھی امت بنانے کا درست معیار نہیں ہے بلکہ امت بننے کا درست معیار حبل اللہ ہے اور حبل اللہ وہی دین الٰہی ہے۔

عہدِ رسول اللہ ﷺ کے بعد آہستہ آہستہ جاہلیت کا زمانہ دوبارہ زندہ ہوا تدریجاً اسلام سے پہلے کے جو معیارات تھے وہی دوبارہ آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگے اور اس طرح امت کا جو اصلی شیرازہ اور مرکزی چیز تھی جس کے گرد امت نے رہنا تھا وہ آرام سے نکال لی گئی اور اس کی جگہ پر نیا دھاگہ ڈال دیا گیا مثلاً تسبیح کے دانوں کے اندر جو دھاگہ تھا وہ حبل اللہ ہے بڑی خاموشی سے وہ حبل اللہ کھینچ کے نکال لیں اور اس کی جگہ پر قومیت، علاقائیت لسانیت، قبائلیت جیسی چیزیں ڈال دی گئی۔

جیسے کہا جاتا ہے یہ فلاں علاقے کا بہت بڑا مومن ہے۔ آخر علاقہ اور مومن یہ کس طرح سے آپس میں امت کے ساتھ سازگار ہوسکتی ہیں، یہ چیزیں جو ہمارے خون میں دھنس گئی ہیں، راسخ ہوگئی ہیں، آج دنیا میں اگر سب سے زیادہ متعصب ترین قوم دیکھیں تو وہ مسلمان ہیں۔ ان کے اندر جتنا علاقائی، لسانی، ، قبائلی اور نسبی تعصب ہے اتنا کسی اور مذہب یا قوم میں نہیں ہے۔ یہ امتِ رسول ﷺ نہیں بلکہ ریوڑ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح سے انھیں امت بنایا ان کے سارے تشخصات ختم کیے، حتیٰ آقا و غلام کا جو تصور تھا وہ بھی ختم کیا۔

وحدت کے لئے خالص اسلامی آئیڈیالوجی کی ضرورت:

وحدت کے محور طور پر خالصتاً سو فیصد اسلامی آئیڈیالوجی چاہیئے چونکہ ہم مسلمان ہیں، اسلام کو ماننے کے بعد آگے کی بات کر رہے ہیں، اسلام کی پناہ میں آ کر بات کر رہے ہیں کہ اسلام ہم سے کیا مانگتا ہے، اسلام کہتا ہے کہ امت بن جاؤ۔ ہم سمجھتے

تم امت بنو، امت بن کر جیو، امت کی شکل اپناؤ اور امت کے ساتھ زندگی بسر کرو، امت سے باہر نہیں رہ سکتے یعنی تمہاری زندگی دو حصوں میں تقسیم ہونی چاہیئے کہ ایک حصہ امت سازی میں یعنی امت بننے اور بنانے میں صرف ہو اور دوسرا حصہ امت بننے کے بعد فرائض کی انجام دہی کے لئے ہو، پہلے ہم پر امت بننے کے فرائض عائد ہوتے ہیں امت بننے کے بعد کے فرائض ایک اگلا مرحلہ ہے۔

ہیں کہ ایک میٹنگ رکھ کر اُس میں ایک قرارداد پاس کرنے سے ہم امت بن گئے، اگر اتنی سی بات ہوتی تو خدا کو اتنے انبیاءؑ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ امت بننے کے لئے پہلے ایک واضح اور روشن آئیڈیالوجی چاہئے لہٰذا امت سازی کا محور درحقیقت آئیڈیالوجی ہے۔ امت اس انسانی مجموعے کو کہتے ہیں جو آئیڈیالوجی کے گرد جمع ہوئے ہوں، جن کو آئیڈیالوجی نے اکٹھا کیا ہو لیکن جن کو قومیت نے اکٹھا کیا ہو وہ امت نہیں ہیں۔ ہم آج قومیتوں میں کس قدر راسخ ہیں مثلاً شیعہ پاکستان میں کہتے ہیں ہم شیعہ قوم ہیں جبکہ درحقیقت شیعہ ایک مکتب اور ایک نظریئے کا نام ہے، شیعہ اسلام کا ایک چہرہ، عنوان اور شناخت کا نام ہے لیکن پاکستان میں آکر شیعہ قوم بن گیا۔ جب قوم محور بن جائے، قوم کے گرد اکٹھے ہونے سے امت تشکیل نہیں پاتی بلکہ آئیڈیالوجی کے گرد جمع ہونے سے امت تشکیل پاتی ہے۔

مفہوم دین و آئیڈیالوجی:

ابھی ہمارے پاس جو دین کی تفسیر، اعتقادات، اعمال اور فرائض موجود ہیں یہ آئیڈیالوجی نہیں ہے یہ چند پراکندہ احکام ہیں یہ دین کے چند شعبے ہیں، یعنی ہمارے پاس ایک کشکولی دین موجود ہے، جس میں تھوڑے سے اخلاقیات، آداب، رسوم، اعتقادات، اعمال، احکام اور عبادات موجود ہیں ان کو جمع کر کے ہم نے دین بنایا ہوا ہے اور اب اس کے گرد جمع ہیں مثلاً اس وقت شیعہ رسومات کے گرد جمع ہیں۔ پاکستان میں رسومات محورِ وحدت ہیں۔ پاکستان کے شیعوں کے لئے آئیڈیالوجی محور نہیں ہے بلکہ دینی رسومات محور ہیں لہٰذا رسومات کے لئے انجمنیں بھی بناتے ہیں مثلاً محرم، رمضان اور عید وغیرہ کے لئے انجمنوں کو تشکیل دیتے ہیں یعنی رسومات کو بجالانے کے لئے ہم چند آدمی جمع ہو کر ایک انجمن بناتے ہیں اور خود اس انجمن کے پاس آئیڈیالوجی نہیں ہوتی ہے، چونکہ آئیڈیالوجی بیان کرنے والے نظریہ ساز نہیں ہیں۔

آئیڈیالوجی سے مراد یہ ہے کہ ہمارے پاس دینی نکتہ نگاہ اور دینی تفسیر کے مطابق اس پورے جہان اور سارے عالم و کائنات کے لئے ایک پوری تفسیر موجود ہو۔ اس کائنات کا ہدف، فلسفہ، مقصد اور نظام سب کچھ واضح طور پر ہمارے سامنے موجود ہو، ہمیں معلوم ہو کہ دین کی نگاہ میں یہ جہان اور یہ کائنات کیا ہے، اس کے کتنے مرتبے ہیں، دین کے مطابق یہ کائنات کیسے، کیوں اور کس مقصد کے لئے وجود میں آئی، ان سارے سوالات کے واضح جوابات کو آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔

مقصدِ قرآن آئیڈیالوجی کی تعلیم دینا:

اس کائنات کے بارے میں دین کا نکتۂ نگاہ کیا ہے؟ کائنات کی وسعت کتنی ہیں؟ کائنات کے مرتبے کتنے ہیں؟ یہ کائنات کیسے اور کیوں وجود میں آئی ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ کائنات کا نظام کیا ہے؟ کائنات کا خالق کون ہے؟ اس کائنات کا اس خالق کے ساتھ رابطہ کیا ہے؟ یہ آئیڈیالوجی کا پہلا سبق ہے۔ اس کے بعد انسان کیا ہے؟ انسان کیسے وجود میں آیا؟ انسان کیوں پیدا ہوا؟ انسان کا مقصد و حقیقت کیا ہے اور انسان کی رسالت و ذمہ داری کیا ہے؟ یہ آئیڈیالوجی کا دوسرا سبق ہے۔ تیسرا سبق آئیڈیالوجی کا یہ ہے کہ اب انسان کا مقصد جب واضح ہو گیا ہے تو اس مقصد تک پہنچنے کے لئے انسان کو جو سفر درپیش ہے وہ کیا ہے؟ اس کے مراحل کیا ہیں؟ یہ سفر طے کر کے مقصدِ خلقت تک پہنچنے کے لئے انسان کے لئے کون سے امور درکار ہیں؟ اور اس کی زندگی کے پہلو کتنے ہیں؟

اگر ہم قرآن میں دیکھیں تو ہر دوسری تیسری آیت یہی بتا رہی ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کو پیدا کس نے کیا ہے؟ یہ کس کے لئے ہے؟ قرآن ہمیں آئیڈیالوجی پڑھانے کے لئے آیا ہے کہ یہ پہلی چیز ہمارے لئے حل ہو سکے۔ اگر ہم غور کریں تو سارا قرآن یہی چیزیں بیان کر رہا ہے، یہ جن آیات سے ہم استخارے نکالتے ہیں وہ درحقیقت ہمیں یہ راہنمائی کر رہی ہیں کہ اے انسان تو جو آنکھیں بند کر کے قرآن بند کرتا ہے اور کھولتا ہے ان پر غور کر کہ یہ تمہیں یہ بتانے کے لئے ہیں کہ تو کیوں پیدا ہوا

اگر ہم زمانہ انتظار، زمانۂ غیبتِ کبریٰ کی دقیق تشریح کریں اور تفسیر و عنوان دیں تو یہ زمانہ امت سازی کا ہی زمانہ ہے، زمانۂ انتظار یعنی زمانۂ امت سازی۔ چونکہ ایک امام امت سے دور ہیں و امت امام سے محروم ہے، امام زندہ ہیں، موجود ہیں لیکن وہ امت کی دسترس میں نہیں ہیں، کیوں نہیں ہیں؟ چونکہ اس قوم نے امت بننے کا اہم فریضہ ابھی تک انجام نہیں دیا

قرآن مجید کا یہ حکم اسلام کے اہم ترین فریضے کا پہلا رکن ہے اور وہ فریضہ امت سازی ہے۔خود سازی ایک انفرادی فریضہ ہے اور امت سازی اجتماعی فریضہ ہے اور یہ دونوں ہی اہم فریضے ہیں۔ امت سازی کے لئے ہمیں پہلا رکنِ امت ایجاد کرنا ہے یعنی پراکندگی وانتشار سے نکل کر اجتماع بنانا ہے اور آپس میں جمع ہونا ہے اس کے لئے دینی تعبیر جماعت ہے۔

ہے؟ تیرا مقصد اور ہدف کیا ہے؟ اس بھری کائنات میں خدا نے تجھے عقل و شعور کے ساتھ کیوں پیدا کیا؟ کیوں تجھے دوسروں سے منفرد بنایا، یہ جانور اور چراگاہیں سب کچھ خداوند تعالیٰ نے تیرے لیے کیوں بنائیں؟ قرآن ہمیں سب یہی بتا رہا ہے لیکن ہم یہ سارے مفاہیم قرآن سے لینے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پس پہلا مرحلہ امت سازی کا یہ ہے کہ ایک واضح، شفاف اور روشن آئیڈیالوجی کا ہونا ضروری ہے تاکہ اس آئیڈیالوجی کو محور بنا کر لوگ متحد ہوں۔

وحدت یعنی اپنی نئی شناخت بنانا:

سب سے پہلے آئیڈیالوجی اور نظریے کا ہونا ضروری ہے تاکہ لوگوں کو یہ بتایا جاسکے کہ انھوں نے کس محور کے گرد جمع ہونا ہے۔ وحدت یعنی کچھ چیزوں کو چھوڑنا ہے اور کچھ نئی چیزوں کو اپنانا ہے، کچھ ذہنی خمار ختم کرنے ہیں اور کچھ نئے نظریات اپنانے ہیں، کچھ معیاروں کو چھوڑنا ہے اور کچھ معیاروں کو اپنانا ہے، پرانی شناخت کو ختم کر کے کچھ نئی شناخت بنانی ہے۔ یہ سب ہمیں آئیڈیالوجی بتاتی ہے۔لہٰذا امت سازی کا پہلا مطلب یا پہلا قدم آئیڈیالوجی یعنی حبل اللہ ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینے میں آئے سب سے پہلے اوس وخزرج کو کہا کہ حبل اللہ تھام لو، انھوں نے پوچھا حبل اللہ کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے قرآن اور دین کو متعارف کروایا کہ یہ تمہارے لئے حبل اللہ ہیں اور فرمایا کہ تمہیں اوسیت اور خزرجیت سے نکلنا ہے اور تمہیں انصار الاسلام بننا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے ان کی شناخت کو تبدیل کیا۔ اُسی وقت منافقت کھل کے سامنے آئی، عبداللہ ابن ابی کا گروہ آیا اور کہا کہ آپؐ تو ہماری جڑ کاٹ رہے ہیں، آپؐ تو وطنیت اور قومیت کے دشمن ہیں، ہمیں ختم کر رہے ہیں، مہاجروں یعنی مکیوں کو لا کر مدینے کے اوپر ٹھونس رہے ہیں، ہمارے وسائل پہ قبضہ کرنا چاہتے ہیں، ہم پہ حکومت کرنا چاہتے ہیں، یہ کون ہیں اور ہم کون ہیں؟ فوراً یہ باتیں کرنا شروع کردیں۔ ہمیشہ منافقت یہیں سے پہچانی جاتی ہے۔انھوں نے کہا کہ آپؐ تو مکی ہیں پھر کیسے آ کر مدینے والوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔ جیسے ابھی کہتے ہیں کہ ولی فقیہ ہر ملک کا اپنا ہونا چاہئے، جب بھی حکومتِ اسلامی کی بات آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ حکومتِ اسلامی ہے لیکن ہر قوم کا ولی فقیہ اسی قوم سے ہی ہونا چاہیے۔ابھی پاکستان کے نئے صوبے بننے والے ہیں پھر ہر صوبے کا الگ ولی فقیہ ہونا چاہیے، یہ منافقت مدینے میں بھی ظاہر ہوئی تھی۔

اسلامِ ناب سے تمسک وحدت کی علامت:

آج کے دور میں دیکھیں ہم دین کے کچھ امور پر عمل کرتے ہیں اور کچھ کو بالکل دیکھتے ہی نہیں ہیں یعنی اپنے لئے ظاہری فائدہ دینے والے امور پر عمل کرتے ہیں اور اصل روح پر عمل نہیں کرتے پھر اپنا نام دیندار بھی رکھتے ہیں اس قدر دین، تقویٰ، قرآن اور دینی معیارات سے دوری یہ تعجب کی بات ہے۔عبداللہ ابن ابی نے لوگوں کے احساسات بھڑکائے کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری قومی شناخت مٹا رہے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ تم مکہ کے ہو یا مدینہ کے، یمن کے ہو یا افریقہ کے، رومی ہو یا زنگی، یورپی ہو یا افریقی، مشرقی ہو یا مغربی، کسی علاقے یا کسی قوم سے تعلق تمہاری پہچان نہ بنے بلکہ تمہاری پہچان اسلام خالص ہو۔

قوم اور امت میں بنیادی فرق یہی ہے کہ علاقہ، زبان اور نسل قوم کی شناختی علامت ہے اور اسلامِ ناب امت کے لئے شناختی علامت ہے۔قوم جغرافیائی حدود میں بنتی ہے اور امت اعتقادی حدود میں بنتی ہے۔امت کی جو حدود ہیں وہ اعتقادی حدود اربعہ ہے۔امت کا دائرہ وہاں تک پھیلتا ہے جہاں تک اس اعتقاد کے پیروکار موجود ہیں وہ ایک امت کے تابع ہیں، وہ ایک امت کا حصہ ہیں، خواہ ایک فرد اس کا پاکستان میں رہتا ہو اور دوسرا فرد افریقہ میں رہتا ہو، یہ دونوں امتِ واحدہ ہیں چونکہ ان کو آپس میں ملانے والی چیز اعتقاد اور آئیڈیالوجی ہے۔پس اگر آئیڈیالوجی کے بغیر وحدت ہوگئی تو اس وحدت کا محور غیر دینی چیز

پس وحدت دین کے محور میں ہونی چاہئے، تنہا وحدت جو امت سازی کی طرف انسان کو لے جاتی ہے وہ دین کے محور میں وحدت ہے ورنہ قومیت، لسانیت، علاقیت، رنگ ونسل، قبیلے، نسب، مفادات اور اقتدار کی بنیاد پر جو وحدتیں ہے یہ امت کی طرف نہیں لے جاتیں بلکہ ان کا رخ کسی اور طرف ہے

بنے گی جو خود تباہ کن ہے۔ جس طرح سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر وحدت ہے مثلاً عرب لیگ اور گلف لیگ مسلمانوں کے اجتماعات ہیں، ایک مسلمانوں کا ٹولہ عرب لیگ بنا ہوا ہے اور دوسرا گلف لیگ بنا ہوا ہے ان کے علاوہ مسلمانوں کے اور بہت سارے گروہ بنے ہوئے ہیں لیکن یہ سب کے سب اسلامی آئیڈیالوجی کے باہر جمع ہو گئے ہیں۔ اسلامی آئیڈیالوجی کے گرد جمع نہ ہونے کی وجوہات یہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ اسلام شناس نہیں ہیں، دوئم یہ کہ اسلامی آئیڈیالوجی ان کے پاس نہیں ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو علمی کام ہوا ہے وہ زیادہ احکام کے استنباط پر ہوا ہے، آئیڈیالوجی کے استنباط پر اجتہادی کام نہیں ہوا۔

آئیڈیالوجی کے استنباط پر اجتھادی کام کی ضرورت:

آئیڈیالوجی کے استنباط پر اجتہادی کام کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ملائکہ نے نہیں کرنا خود ہم نے کرنا ہے۔ اسلام کی نظریاتی تفسیر کر کے اس پر لوگوں کو اکٹھا کرنا ہے، دین کے علاوہ کسی بھی پرچم کے نیچے جمع ہوں امت نہیں بن سکتے بلکہ گروہ، فرقہ، پارٹی، تنظیم، قبیلہ یا قوم بن جائیں گے لیکن امت نہیں بن سکتے، امت کے لیے ضروری ہے پہلا رکن قرآن نے بیان کیا ہے کہ

''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا......''

(سورہ آل عمران آیت ۱۰۳)

''سب مل کر اللہ کی رسی تھامو اور تفرقے میں نہ پڑو......''

گروہ نہ بنو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ جھگڑا نہ کرو، ''تفرقوا'' اور ''تنازعوا'' بہت فرق ہے، قرآن نے دونوں سے منع کیا ہے

''لَا تَفَرَّقُوْا'' ''وَلَا تَنَازَعُوْا''

''لا تفرقوا'' یعنی گروہ نہ بناؤ اور ''ولا تنازعوا'' یعنی جھگڑا مت کرو۔ اگر ہم ''تفرقوا'' کا معنی ''جھگڑا'' کریں تو جملہ یہ بنے گا کہ اللہ کی رسی پر جھگڑا نہ کرو یہ درست نہیں ہے پس اس کا معنی ہوگا کہ گروہ مت بناؤ۔ فرق کاٹنے کو کہتے ہیں، دوشق یا دو حصے کرنے کو کہتے ہیں، کوئی ایسی بات، اقدام یا کام ایسا مت کرو کہ جس سے امت کی دوشقیں ہو جائیں، جس سے امت تقسیم ہو جائے۔ ''تفرقوا'' یعنی گروہ، فرقہ اور ٹولہ مت بنو۔ تفرقہ وحدت یا جمع کے مقابلے میں گروہ بننے کو کہتے ہیں۔ اجتماع اور جماعت ملنے کو کہتے ہیں اور ان کا متضاد تفرق ہے۔ ایک لفظ تفردہ ہے کہ یہ اصطلاح کم استعمال ہوتی ہے۔ تفردہ فرد سے ہے، تفردہ یعنی فرد فرد بننا۔ پس امت سازی کے لئے ضروری ہے کہ گروہ بھی نہیں بنیں اور تفردہ بھی نہیں کرنا، اپنی فردیت بھی قائم نہیں رکھنی۔ پس تفردے اور تفرقے سے باہر آ کر خود کو امت کے قالب میں تبدیل کرنا ہے لیکن امت کے لئے پہلا مرحلہ آئیڈیالوجی ہے۔

آئیڈیالوجی کی چند خصوصیات:

آئیڈیالوجی کے کچھ علائم یا خصوصیات یہ ہیں، ان علائم کے معلوم ہونے کے بعد مطالعات کے لیے ہمیں فکری میدان مل جائے گا چونکہ خود لفظِ آئیڈیالوجی مبہم ہے، یہ لفظ ہم استعمال کرتے ہیں لیکن ذہن میں کوئی تصویر نہیں بیٹھتی ہے یا اگر بیٹھتی بھی ہے تو قوی امکان ہے کہ غلط تصویر بیٹھتی ہے یعنی جو چیز آئیڈیالوجی نہیں ہے وہ آئیڈیالوجی بن کر ذہن میں آ جاتی ہے جیسے رسومات آئیڈیالوجی بن کر ذہن میں آ جاتی ہیں مثلاً جب کہتے ہیں کہ آئیڈیالوجی ہونا چاہیے تو ممکن ہے کسی کے ذہن میں آئے کہ ہمارے پاس تو آئیڈیالوجی ہے لیکن اس سے مراد یہی رسومات ہماری آئیڈیالوجی ہوتے ہیں یا سرے سے آئیڈیالوجی سن کر کوئی بھی مفہوم ذہن میں نہیں آتا ہے۔ پس یہاں پر آئیڈیالوجی کے علائم اور خصوصیات بیان کرتے ہیں تاکہ ہم اس کے گرد جمع ہو جائیں، آئیڈیالوجی کے اندر اجتماع کی شرائط لکھی ہوئی ہیں اگر ان شرائط کے تحت کوئی اجتماع وجود میں آئے گا اس کو قرآن امت کہتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر ۴۶ پر ملاحظہ کریں......

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا اس وقت میرا دین سالم ہوگا یا نہیں؟ اس وقت میرا کیا بنے گا؟ میرے یتیموں کا کیا بنے گا؟ میری بیوہ کا کیا بنے گا؟ بلکہ یہ تشویش تھی کہ کیا اس وقت میرا دین سالم ہوگا؟ حضرتؐ نے فرمایا کہ اے علی علیہ السلام ہاں اس وقت تیرا دین سالم ہوگا تو دینِ حق پر ہوگا۔ حضرتؑ نے فرمایا پھر پرواہ نہیں ہے اگر میرا دین سالم ہوگا تو میں اس شہادت کے لئے آمادہ ہوں۔

ماہِ رمضان انسان کیلئے بہترین فرصت:

یہ خطبہِ شعبانیہ ہے جس میں حضرتؐ نے ماہِ مبارکِ رمضان کے بارے میں بتایا کہ اے لوگو یہ فرصت ہے جو ان نعمتوں، ہدیوں اور برکتوں کے ساتھ تمہاری طرف آرہی ہے، اس موسم نے تمہاری طرف اقبال کیا ہے، اپنے دلوں اور نفوس کو اس مہینے کی برکتوں کو لینے کے لئے آمادہ کرو اور ارادتاً رسومات کو چھوڑ کر معمولاتِ زندگی سے باہر آجاؤ، ایک ارادے کے تحت اس مہینے کی طرف آؤ اور اس کی برکتوں سے بہرہ مند ہوجاؤ۔ اور روحِ مطلب یہی ہے کہ یہ مہینہ ضیافۃ اللہ ہے، خدا کی مہمانی کا مہینہ ہے، جس میں خدا میزبان اور ہم مہمان ہیں اور میزبان نے جو دسترخوان بچھایا ہے وہ قرآن ہے۔

"القرآن مادبة الله"

قرآن دسترخوانِ خدا ہے، میزبان خود کنارِ دسترخوان اپنے مہمان کو لقمے دینے کے لئے تیار بیٹھا ہے اور ہمیں اس دسترخوانِ الٰہی پر بیٹھنے کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔

بقیہ: امت سازی از نظر قرآن

" وَلْتَكُنْ مِنكُمْ أُمَّةٌ......" (سورہ آل عمران آیت ۱۰۴)

اس سے پہلی آیت میں ہے

"......وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً......"

(سورہ آل عمران آیت ۱۰۳)

یاد کرو اس نعمت کو جب تم دشمن تھے

"......فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ......"

خدا نے تمہارے دلوں کے اندر الفت ڈال دی۔ امت بننے کے لئے الفتِ قلوب محور ہونا چاہیے۔ ابدان کے جوڑ کو وحدت نہیں کہتے، وحدت سے مراد جسم اکٹھے کرنا نہیں ہے، جسمانی اجتماع کو امت نہیں کہتے۔ جس کو امیر المومنینؑ فرماتے ہیں

"ایها الناس المجتمعة ابدانهم"

اے جسمانی طور پر قریب لوگو!۔ لوگ علی علیہ السلام کے پیچھے جمعہ پڑھتے تھے، مسجد کوفہ بھری ہوتی تھی، ہزاروں افراد علی علیہ السلام کا لشکر تھا۔ ایک دفعہ بھی علی علیہ السلام نے ان کو امت کہہ کے نہیں پکارا، اکثر ان کو کہتے تھے کہ

"ایهاالناس المجتمعة ابدانهم، المختلفة قلوبهم"

اے وہ لوگو! جن کے جسم قریب قریب ہیں لیکن دل ایک دوسرے سے دور ہیں، پس امت ابدان کے اجتماع کو یا جسمانی اجتماع کو نہیں کہتے بلکہ امت الفتِ قلبی پیدا ہونے سے ہوتی ہے۔ الفتِ قلوب کے لئے کوئی چیز ایسی ہونی چاہیئے جو دل سے تعلق رکھتی ہو، اس لیے کہا کہ وہ حبل اللہ اور وہ مکتب ہوتا کہ اس دل میں بھی ہو اور اُس دل میں بھی وہی ہو اور وہ ان دونوں دلوں کو ملا کر ایک کردے۔

"......فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورہ آل عمران آیت ۱۰۳)

اور تم خدا کی نعمت سے بھائی بن گئے جبکہ تم اس سے پہلے نارِ جہنم کے دہانے پہ جا پہنچے تھے (یعنی مدینے میں اوس وخزرج کے ناموں سے تقسیم تھے) وہاں سے تمہیں نکالا، امت بنایا اور خدا نے تمہیں نجات دی ہے۔ اس طرح خدا اپنی نشانیاں اور اپنی ہدایت بیان کرتا ہے تا کہ شاید تم بھی سمجھ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس طرح آنے والی نسلوں کو اپنی باتیں واضح کرتا ہے اور اپنے راز کھولتا ہے تا کہ شاید ہدایت پانے والوں میں سے ہوجائے۔ پس ہمیں بھی یہی کام کرنا ہے، یہ اکائیاں ہمارے اندر بھی جمع ہونی ہیں۔

٤

امت سازی

از نظر قرآن

گروہ معارف

"وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ" يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ‌ ؕ وَاُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ" عَظِيۡمٌ" " (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴)

امت سازی بنیادِ دین:

امت سازی دین کے متروک اور فراموش شدہ فرائض میں سے ہے اگر ہم فرائضِ دینیہ کی درجہ بندی کریں کہ کس درجے کے فرائض ہیں تو سرِ فہرست وسب سے اہم ترین فریضہ امت سازی ہے۔ قرآنی تعلیمات اور سیرتِ رسول اللہ ﷺ میں یہ ایک مرکزی و بنیادی فریضہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے باقی تمام فرائض سے پہلے اس فریضے کو عملی کیا ہے چونکہ اس فریضے کے قیام سے سارا دین برپا و قائم ہو جاتا ہے اور یہ فریضہ اگر انجام نہ پائے تو دین کا اکثر حصہ متروک و مہجور رہتا ہے جیسا کہ اس وقت مسلمان اتنی اکثریت میں ہونے کے باوجود دین کے اکثر حصے سے عملی طور پر محروم ہیں اور تارکِ دین ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دین پر عمل کرنے کے لئے جس میدان کی ضرورت تھی وہ میدان ان کے پاس آمادہ و فراہم نہیں ہے اور وہ وجودِ امت ہے اس لیے اس فریضے کی طرف توجہ ہر دوسرے عمل سے پہلے ضروری ہے چونکہ دوسرے تمام فرائض اس فریضے کے اوپر بنیاد رکھتے ہیں اور اس کے اوپر موقوف ہیں۔

امت سازی قرآن کی روشنی میں:

امت سازی کے لئے قرآن مجید نے باقاعدہ اصول ذکر کیے ہیں اور تعلیمات بیان کیے ہیں۔ ہم نماز کے جزئیات کی باریکیوں کو دیکھیں کہ کس باریکی کے ساتھ نماز کے احکام بیان ہوئے ہیں، مثلاً سب سے بڑی نماز چار رکعت فرض ہے۔ چار رکعت کی نماز اگر انسان بہت ہی خشوع وخضوع کے ساتھ بھی پڑھے تو دس منٹ میں پڑھ لیتا ہے، انسان کو دس منٹ کے فریضہ کے احکام کو پڑھنے کے لئے دس سال لگ جاتے ہیں، اس مختصر فریضے کو انجام دینے کے لئے احکام اتنی باریکی اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور مجتہدین وفقہاء نے اپنی طرف سے یہ احکام بیان نہیں کیے بلکہ یہ سارے احکام خود شریعتِ مقدسہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ علیہم السلام نے بیان کیے ہیں، یعنی یہ دین میں موجود ہیں فقہاء نے صرف کوشش، زحمت، محنت اور علمی مہارت کے ذریعے قرآن، احادیث اور سنت سے یہ سارے احکام نکالے ہیں۔ یہ ایک بہترین نمونہ ہے یہ سمجھنے کے لئے کہ انسان کی ہدایت سے مربوط خداوند تبارک وتعالیٰ نے جو تعلیمات مقرر کی ہیں ان کو پوری وضاحت اور شفافیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر کوئی عام آدمی قرآن میں نماز کے احکام ڈھونڈے تو اُسے دو چار آیتیں ملیں گی جن میں لکھا ہوا ہے

اس وقت مسلمان اتنی اکثریت میں ہونے کے باوجود دین کے اکثر حصے سے عملی طور پر محروم ہیں اور تارکِ دین ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دین پر عمل کرنے کے لئے جس میدان کی ضرورت تھی وہ میدان ان کے پاس آمادہ وفراہم نہیں ہے اور وہ وجودِ امت ہے اس لیے اس فریضے کی طرف توجہ ہر دوسرے عمل سے پہلے ضروری ہے چونکہ دوسرے تمام فرائض اس فریضے کے اوپر بنیاد رکھتے ہیں

"اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ......" (سورہ البقرہ، آیت ۴۳)

جبکہ دین نے بیان کیا ہے کہ ہر نماز کی کتنی رکعتیں پڑھنی ہیں، نیت، تکبیرۃ الاحرام، قیام، رکوع، سجود اور ان ارکان کو ادا کرنے کی حالتیں کیا ہیں اور ان کے احکام کیا ہیں یہ سب دین نے بیان کیا ہے، پھر نماز کی مختلف شکلیں بیان کیا ہے کہ حاضر کی نماز، مسافر کی نماز، مریض کی نماز، اضطراری نماز اور نماز کے یہ سارے مسائل قرآن سے ہمیں نظر نہیں آتے درحالیکہ موجود ہیں۔ ایک فقیہ اور دین شناس انسان قرآن سے یہ سارے مسائل استنباط کرسکتا ہے۔

امت سازی اہم ترین فریضہ:

اہم ترین فریضہ امت سازی کا ہے اور امت سازی کو بھی اسی تفصیل کے ساتھ دین نے بیان کیا ہے لیکن کسی فقیہ نے کوشش نہیں کی کہ امت سازی کی جزئیات و تفاصیل کو قرآن سے اس طرح سے دریافت کرے جس طرح عبادات کی تفاصیل وجزئیات کو استنباط کیا ہے یعنی ایک مختصر فریضہ دس منٹ کا جو انسان انجام دیتا ہے اس کے احکام اتنے استنباط کیے ہیں کہ آج صرف انسان کو نماز کے احکام سیکھنے کے لئے کئی سال چاہئیں، اسی طرح سے امت سازی کا فریضہ ہے جو پورے قرآن، روایات اور سنت کے اندر تفصیل کے ساتھ موجود ہے جس کے لئے فقیہ ومجتہد کی ضرورت ہے جو اس سے استنباط کرے اور اس سے مسائل کو استخراج کرے۔ قرآن مجید میں امت سازی کا پورا نقشہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح امت بنانا ہے، کس طرح تمہیں امت بنانا ہے اور کن راہوں سے اس ہدف تک تمہیں پہنچنا ہے۔

امت کا رکنِ اول اجتماع:

امت کا پہلا رکن اجتماع ہے چونکہ امت انسانی اجتماع سے وجود میں آئے گی، اس اجتماع کا محور حبل اللہ یعنی دین ہے۔ امت بننے کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ آپس میں مل جاؤ، اپنے امتیازات وتشخصات کو ختم کرو اور اکٹھے ہو جاؤ لیکن قرآن اندھی وحدت کی طرف نہیں بلاتا بلکہ ایک شفاف وواضح وحدت کی طرف اور وہ وحدت جو حبل اللہ کے محور میں ہو ایسی وحدت کی طرف بلاتا ہے۔

"وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ......" (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳)

حبلِ خدا سے سب تمسک کرلو

حبل اللہ سے مراد دینِ خدا اور دین کے منابع جیسے قرآن، سیرت، روایات اور معصومین علیہم السلام ہیں، یہ سب حبل اللہ کے مصادیق ہیں۔ جب ہمیں حبل اللہ معلوم ہو جائے پھر اس کے گرد جمع ہوں گے پہلے حبل اللہ کی تفسیر کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دین بھی مکتبی شکل میں جو امت کے لئے ضروری ہے جس کے لئے آئیڈیالوجی رائج اصطلاح ہے لیکن اس کے لیے مناسب لفظ مکتب ہے، مکتب کے بھی کئی معانی ہیں۔ لائبریری، سکول اور مدرسے وغیرہ مکتب کی اصطلاحات ہیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح آئیڈیالوجی ہے یعنی دین کی تفسیر بصورتِ آئیڈیالوجی۔

آئیڈیالوجی سے مراد:

دین کے عملی نقشے کو آئیڈیالوجی کہتے ہیں، دین کو ایک نقشے کے تحت دستوری شکل میں تدوین کرنا یا دستوری شکل میں اس کو منظم کرکے پیش کرنا دین کی مکتبی یا آئیڈیالوجیکل شکل ہے۔ اس وقت ہمارے پاس جو دین ہے جس کو ہم مدرسوں اور کتابوں میں پڑھتے پڑھاتے ہیں یہ مکتبی صورت نہیں ہے اس لئے دین کی موجودہ شکل قابلِ عمل بھی نہیں ہے، اس کے اکثر حصے پر ہم عمل نہیں کرسکتے۔ صرف عبادتیں ہیں جنھیں ہم انجام دے دیتے ہیں لیکن دین کے باقی شعبے آج قابلِ عمل نہیں ہیں مثلاً ہم دین کے عدالتی نظام اور عدالتی احکام پر عمل نہیں کرسکتے۔ کسی بھی ملک میں آج مسلمان سیاسی نظام اور سیاسی احکامات پر عمل نہیں کرسکتے۔ اسی طرح سے دین کا جو حقوقی نظام اور دستورات دین ہیں ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔

آج دین پر عمل نہ ہونے کی وجوہات:

آج کے دور میں دین پر عمل نہ ہونے کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ اس

کا میدان ہموار نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ اسکے حقوق کی جو تدوین ہے یا جو دین کی تعلیمات ہیں وہ عملی اور دستوری شکل میں نہیں بنائی گئی۔ دستوری شکل یعنی کسی چیز کی آئینی شکل اور منشوری شکل کے تحت کسی چیز کو مرتب کرنا۔ یعنی کسی چیز کو مختلف شعبوں میں مناسب ترتیب میں تقسیم کر کے ہر شعبے کی جزئیات اس کے اندر بیان کی گئی ہوں اور ان کا عملی راہ حل بھی ان کے سامنے بیان کیا گیا ہو کہ اس پر کس طرح سے عمل کرنا ہے۔ جس طرح ہر ملک کا اپنا ایک دستوری ڈھانچہ ہوتا ہے جیسے پاکستان کا ایک دستور اور آئین ہے اس آئین کو اگر ہم دیکھیں تو یہ سائنسی، فلسفی یا علمی زبان میں نہیں لکھا ہوا بلکہ دستوری زبان میں لکھا ہوا ہے۔ اگر دستوری زبان میں ہو پھر ہم عمل کر سکتے ہیں لیکن اگر یہ غیر دستوری زبان میں ہو، مثلاً پاکستان کا دستور نصیحتوں کی شکل میں لکھا جائے کہ مسلمانوں کا ایک ملک ہو، اس کا نام پاکستان ہو، اس کے اندر چار صوبے ہوں، یہ نصیحتی زبان ہے، کوئی بھی اس پر عمل نہیں کرے گا، ٹھیک ہے ہونا چاہیئے لیکن کون کرے اور کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ معین و مشخص نہیں ہے جیسے ہم عموماً دینی باتیں کرتے ہیں تو مجہول کے صیغے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہونا چاہئے وہ ہونا چاہئے، چونکہ فاعل مشخص نہیں کرتے کہ کون کرے اور کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ جان بوجھ کر نہیں لکھتے ہیں چونکہ پھر یہ دستور بن جاتا ہے اس کے اندر ذمہ داری معین و مشخص ہو جاتی ہے جسے ہم نہیں چاہتے۔ لہٰذا مکتب یا آئیڈیالوجی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دینی تعلیمات کا عملی اور دستوری نقشہ ہونا چاہئے۔

مکتب کے بغیر اجتماع نا ممکن ہے:

جب تک آئیڈیالوجی اور مکتب نہ ہو اس کے بغیر جو بھی اجتماع ہو گا خواہ وہ دین کے نام پر ہی کیوں نہ ہو وہ امت نہیں بن سکتا۔ مثلاً ہم دینی انجمنیں، دینی پارٹیاں، دینی حزبیں، دینی گروہ اور دینی فرقے بنائیں یہ سب بن جائیں گے، دین کے نام پر فرقہ، گروہ، حزب، جماعت، قبیلہ اور قوم بن سکتے ہیں، ہر چیز دین کے نام پر بنائی جاسکتی ہے اور ان میں سے کسی کے لئے ہمیں مکتب یا آئیڈیالوجی کی ضرورت نہیں ہے مثلاً اعتقاداتِ دینی کی بنیاد پر ایک فرقہ بنالیں، تعصّباتِ دینی کی وجہ سے پارٹی بنالیں، اس قسم کے گروہ بنانے کے لئے یہ چیزیں کافی ہیں لیکن جب ہم امت بنانے کی طرف آئیں گے تو امت کے لئے ہمیں دینی دستور، دینی منشور اور دینی آئین کی ضرورت ہوگی۔

ملکی اور مکتبی دستور میں فرق:

ملکی دستورات فقط عملی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن آئیڈیالوجی کا دستور اعتقادی بھی ہوتا ہے یعنی اس کے اندر پہلے اعتقاد کو دستوری شکل ملتی ہے پھر عملی نظام کو دستوری شکل ملتی ہے اس کے بعد قوانین کو دستوری شکل ملتی ہے اس ترتیب کے ساتھ ایک دستور تشکیل پاتا ہے جو آئیڈیالوجی کہلاتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض اہلِ علم نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ آئیڈیالوجی یعنی دین کو ایک عملی نقشۂ زندگی بنانا، دستور العمل اس طرح سے بنانا کہ دین زندگی کا عملی نقشہ نظر آئے کہ اس کے تحت زندگی بسر کی جاسکے۔ اس وقت ہمارے پاس جو تفسیر شدہ دین موجود ہے اس میں یہ نقشہ نظر نہیں آتا بلکہ وہ مقدس ورد، مقدس ذکر اور مقدس چیزیں ہیں کہ جن کے پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے لیکن وہ نقشہ نظر نہیں آتا کہ جس کے تحت ہم عمل کریں۔ مثلاً امامت ہے، امامت جس طرح سے ہم پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں عملی زندگی کے نقشے میں کہیں پر بھی امامت نظر نہیں آتی، عملی امامت نہیں لگتی کہ اس امامت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ یہ امامت جو ہمیں سکھائی جاتی ہے یہ ذہنیت ہے، اپنے ذہن میں یہ تصور رکھو کہ آئمہ علیہم السلام ہیں، خداوند تبارک وتعالیٰ نے انہیں درجۂ امامت دیا ہوا ہے اور ہمارا کام ان کو امامؑ ماننا ہے اس سے آگے نہ ان کا کوئی کام ہے اور نہ ہی ہمارا کوئی کام ہے اور ان کے ذہن میں بھی یہ ہونا چاہئے کہ ہم امامؑ ہیں باقی وہ اپنی زندگی بسر کریں اور ہم اپنی زندگی بسر کریں۔ ہم عملاً کسی بھی حکومت اور کسی بھی نظام کے تحت زندگی بسر کریں، کوئی کاروباری ہو، کوئی تعلیم حاصل کر رہے ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بس ذہن میں یہ تصور ہونا چاہئے کہ ہم امامؑ کو مانتے ہیں پس اس سے امامت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ امیر المومنینؑ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا اور پاکستان میں سے

مجتہدین وفقہاء نے اپنی طرف سے یہ احکام بیان نہیں کیے بلکہ یہ سارے احکام خود شریعتِ مقدسہ میں خداوند تبارک وتعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء اللہ علیہم السلام نے بیان کیے ہیں، یعنی یہ دین میں موجود ہیں فقہاء نے صرف کوشش، زحمت، محنت اور علمی مہارت کے ذریعے قرآن، احادیث اور سنت سے یہ سارے احکام نکالے ہیں

جس سرزمین پر رہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، فقط ذہن میں یہ ہونا چاہئے کہ علیؑ پہلے امام ہیں پس امامت کا تقاضا پورا ہوجاتا ہے اور علیؑ بھی اسی پر خوش ہیں کہ میرے ماننے والے زمین پر ہر جگہ موجود ہیں۔

مکتبی امامت:

جسے ہم نے پڑھا ہے یا پڑھایا ہے یہ مکتبی، دینی اور الٰہی امامت نہیں ہے بلکہ ایک ذہنیت اور تصور ہے۔ الٰہی امامت اور مکتبی امامت ایک نظام ہے ذہنیت یا تصور کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے تحت انسان کو اپنی زندگی گزارنی ہے، امامت انسان کی زندگی کے لئے عملی نقشہ، رہبری اور قیادت کا نام ہے پس امت کے لئے پہلی چیز ہمیں دین کی مکتبی تفسیر کی ضرورت ہے، دینی آئیڈیالوجی چاہئے، دینی آئیڈیالوجی سے مراد دین کی نصیحتیں نہیں جو ابھی ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں، ہمارے پاس ابھی نصیحتیں موجود ہیں۔ دینی باتیں اور نصیحتیں کرتے ہیں کہ یوں ہونا چاہئے اور سمجھتے ہیں کہ دین کی بات ہوگئی، یہ کافی نہیں ہے بلکہ دین دستوری شکل میں موجود ہو۔ البتہ موجودہ رائج ڈھانچہ فقط عملی قوانین پر مشتمل ہوتا ہے درحالیکہ آئیڈیالوجی کے اندر پہلا مرحلہ اعتقادی ہوتا ہے یعنی پہلے ایک اعتقادی نقشہ ہوتا ہے اس اعتقادی نقشے کے مطابق اس میں نظام ہوتے ہیں اس نظام کے مطابق قوانین ہوتے ہیں۔

آئیڈیالوجی کی اہمیت:

پاکستان میں آئیڈیالوجیکل یا مکتبی مطالعہ ضروری نہیں سمجھا جاتا، نہ کرتے ہیں اور نہ ہی کسی نے کیا ہے لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ ابھی ہم دینی اور قرآنی آئیڈیالوجی کی بات کر رہے ہیں لیکن اور بھی بہت ساری آئیڈیالوجیز موجود ہیں، اسی وجہ سے بعض لوگ آئیڈیالوجی کی مخالفت بھی کرتے ہیں کہ دین کو آئیڈیالوجی نہ بنائیں، دین کو اس طرح رہنے دیں کہ جس طرح سے ہے اس کو آئیڈیالوجی کی شکل دینا درست نہیں ہے، کیوں درست نہیں ہے؟ وہ مثالیں لاتے ہیں کہ ہمارے پاس آئیڈیالوجیز اور بھی بہت ہیں اور اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے دینی آئیڈیالوجی کے ساتھ بھی وہی پیش آسکتا ہے۔ توجہ فرمائیں کہ انہیں کس بات کا خطرہ ہے؟ خطرہ اس بات کا ہے کہ آئیڈیالوجی کے بارے میں ان کا یہ کہنا ہے کہ بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ بعض پارٹیاں یا حزبیں اپنے پیروکاروں کے اندر ایک کاذب اور غیر واقعی آگاہی ایجاد کر دیتے ہیں اور وہ لوگ اس جھوٹی اور کاذب آگاہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں مثلاً جس طرح گمراہ فرقے ہیں ان کے اندر ایک کاذب احساس بنا دیا جاتا ہے کہ آپ یہ کام کرو گے تو آپ خدا سے مربوط ہوجاؤ گے یا آپ بہشت میں چلے جاؤ گے یا آپ کے اندر یہ طاقت آجائے گی، بعض لوگ اس قسم کے کاذب احساس اپنے پیروکاروں کے اندر پیدا کر دیتے ہیں اور یہ کام ہوا ہے مثلاً سوشلزم، کمیونزم اور دیگر ازم جو پیدا ہوئے ہیں انہوں نے یہ کاذب احساس اپنے پیروکاروں کے اندر ایجاد کیے ہیں اور ضعیف اور کمزور انسان جلدی کاذب احساسات کے تابع ہوجاتے ہیں اور فوراً اس کاذب آگہی کو قبول کر لیتے ہیں مثلاً کسی شخص کی بھی معنویت اور کسی بھی غلط راہ کی حقانیت کے قائل ہوجاتے ہیں اور جو سکھا دیا جائے آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لے آتے ہیں اور حقیقت کی طرف کبھی بھی توجہ نہیں کرتے۔

سیاسی جماعتوں کا اصل ہدف:

عموماً سیاسی جماعتیں عام لوگوں کے اندر کاذب احساسات پیدا کرتی ہیں چونکہ سیاسی جماعتیں اقتدار ہی کی وجہ سے بنتی ہیں ان کا اصلی ہدف اقتدار ہوتا ہے بلکہ حزب کی اپنی ایک تاریخِ پیدائش ہے کہ حزب کیسے وجود میں آئی ہے؟ البتہ قرآن نے لفظِ حزب استعمال کیا ہے لیکن آج شرق و غرب میں حزب یا پارٹی ایک الگ تصور کے ساتھ رائج ہے، ساری دنیا کے اندر حزب

> کسی فقیہ نے کوشش نہیں کی کہ امت سازی کی جزئیات وتفاصیل کو قرآن سے اس طرح سے دریافت کرے جس طرح عبادات کی تفاصیل وجزئیات کو استنباط کیا ہے یعنی ایک مختصر فریضہ دس منٹ کا جو انسان انجام دیتا ہے اس کے احکام اتنے استنباط کیے ہیں کہ آج صرف انسان کو نماز کے احکام سیکھنے کے لئے کئی سال چاہئیں، اسی طرح سے امت سازی کا فریضہ ہے جو پورے قرآن، روایات اور سنت کے اندر تفصیل کے ساتھ موجود ہے جس کے لئے فقیہ ومجتہد کی ضرورت ہے

امت انسانی اجتماع سے وجود میں آئے گی،اس اجتماع کا محور حبل اللہ یعنی دین ہے۔امت بننے کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ آپس میں مل جاؤ،اپنے امتیازات وتشخصات کو ختم کرو اور اکٹھے ہو جاؤ لیکن قرآن اندھی وحدت کی طرف نہیں بلاتا بلکہ ایک شفاف وواضح وحدت کی طرف اور وہ وحدت جو حبل اللہ کے محور میں ہو ایسی وحدت کی طرف بلاتا ہے۔

کا ایک تصور پایا جاتا ہے قرآن نے حزب کو اس معنی میں ذکر نہیں کیا، قرآن میں حزب یعنی گروہ ہے، اسی معنی میں حزب الشیطان بھی استعمال کیا ہے اور حزب اللہ بھی، قرآن نے دو حزبیں ذکر کی ہیں بعض جگہ بغیر لاحقے کے لفظِ حزب استعمال ہوا ہے جیسے قرآن کی اس آیت میں ہے

"کُلُّ حِزۡبٍ بِمَا لَدَیۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ" (سورہ روم، آیت ۳۲)

یہاں پر ہر گروہ مراد ہے اور بعض اوقات ایک گروہ کو کہا گیا ہے کہ یہ حزب الشیطان ہے جبکہ دوسرے گروہ کو کہا ہے کہ یہ حزب اللہ ہے۔ لفظِ حزب جو آج رائج ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے، یہ حزب جو سیاست کے اندر آج اصطلاح ہے، جب سے جمہوریت کے نام سے نظام سامنے آیا ہے اس وقت سے حزب پیدا ہوئی ہے یعنی حزب درحقیقت جمہوریت کی پیداوار ہے، احزاب جمہوریت کی اولاد ہیں چونکہ جمہوریت میں جمہور کو اقتدار میں آنا ہے، جمہور کو حکومت تشکیل دینی ہے اور اقتدار میں آنے کے لئے جمہور حزب کی شکل اختیار کرتی ہے تاکہ یہ اقتدار میں آسکیں لہٰذا آج کی حزبوں کا محور اقتدار ہے، اقتدار میں آنا ہدفِ اصلی ہے۔ ممکن ہے یہ اقتدار سیاسی ہو، دینی ہو یا اجتماعی ہو، بہرکیف حزب کا اصلی مقصد اقتدار ہے یعنی قدرت، طاقت اور تسلط حاصل کرنا ہے اور اپنا اثر اور پیروکار بڑھانا یہ حزب کا بنیادی فلسفہ ہے۔

اپنی حالیہ زندگی پر غور کی ضرورت:

ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت ہم جن شکلوں میں منسلک ہیں یہ کون سے ڈھانچے ہیں، ہمیں ہر چیز کے بارے میں غور کرنا چاہئے کہ ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں یہ دین کے ساتھ کتنی مربوط ہے اور کتنی غیر دینی ہے یعنی اس زندگی کے اندر آبائی حصہ کتنا ہے اور الٰہی حصہ کتنا ہے؟ اگر ہم غور کریں تو متدین ترین انسان ومتقی ترین انسانوں کی زندگیوں میں دین آٹے میں نمک کے برابر ہے، یہ تعبیر ہمیشہ استعمال کی ہے، یعنی ہماری زندگیاں آٹے کی طرح ہیں جس طرح آٹا گوندھتے ہیں، کلو دو کلو آٹا گوندھا جاتا ہے اس کو نمکین بنانے کے لئے تھوڑا سا چٹکی بھر نمک ڈال دیتے ہیں، ہماری زندگیوں میں دین کا تناسب اتنا ہی ہے ہم فقط چٹکی بھر نمک کی حد تک دیندار ہیں۔ یہ تناسب سیکولر لوگوں میں نہیں بلکہ دینداروں اور مذہبی لوگوں میں ہے کہ دینداروں کی زندگیوں میں دین کا حصہ فقط آٹے میں نمک کے برابر ہے، یعنی اصل زندگی دینی نہیں ہے۔ ہم جو اپنی اجتماعی شکلیں بناتے ہیں ان ڈھانچوں کا دین سے کتنا تعلق ہے؟ ان کا دین سے کتنا ربط ہے؟ مثلاً فرض کرلیں کہ مسجد چلانے کے لئے ہم نے جو طریقۂ کار بنایا ہوا ہے، انجمن بنائی ہوتی ہے جس میں صدر، سیکرٹری، چیئرمین، خزانچی وفلاں فلاں ہوتے ہیں مسجد چلانے کے لئے یہ ڈھانچہ ہے، مسجد دینی مرکز ہے، خانۂ خدا، عبادت گاہ اور مرکزِ دین ہے، دین کے مرکز کو چلانے کے لئے جو ڈھانچہ ہے وہ غیر دینی ہے۔ حتیٰ اب تو مدرسوں، مسجدوں اور امام بارگاہوں کے اندر جو خالص دینی مراکز ہیں ان کی جو مدیریت ہے، ان دینی مراکز کو چلانے کے ڈھانچے کا دین سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے قیام کے لئے ہر چیز این جی اوز سے لاتے ہیں، این جی اوز بھی اسی طرح چلتی ہیں جس طرح ہم مساجد چلا رہے ہیں، این جی اوز کے ڈھانچے سے مسجدیں، امام بارگاہیں، عزاداری اور سب کچھ چلا رہے ہیں۔

غیر دینی نظام و ڈھانچہ:

اگر دین نے ہمیں ایک ہدف دیا ہے تو ساتھ ڈھانچہ بھی دیا گیا ہے ہمیں دین سے ہی پوچھنا چاہئے کہ اگر دین کا حکم ہے کہ ہم عزاداری کریں تو عزاداری کے لئے ڈھانچہ بھی بتایا ہوا ہے۔ جبکہ ہم سنگت کے ذریعے سے عزاداری کرتے ہیں اور مسجدوں کو انجمنوں کے ذریعے سے چلاتے ہیں، یہ چیزیں مساجد کے اندر کہاں سے آگئیں، ہمارا دین کن آفات ومشکلات کا شکار ہے؟ ہم نے کبھی ان چیزوں کی طرف غور ودقت نہیں کی کہ یہ چیزیں تدریجاً ہمارے اندر کہاں سے گھس آئیں؟ ان کے اپنے منابع، تاریخِ پیدائش اور

> قرآن، سیرت، روایات
> اور معصومین علیہم السلام ہیں، یہ سب حبل اللہ کے
> مصادیق ہیں۔ جب ہمیں حبل اللہ معلوم ہو جائے پھر
> اس کے گرد جمع ہوں گے پہلے حبل اللہ کی تفسیر کی
> ضرورت ہے۔ اسی طرح دین بھی مکتبی شکل میں جو
> امت کے لئے ضروری ہے جس کے لئے آئیڈیالوجی
> رائج اصطلاح ہے لیکن اس کے لیے مناسب لفظ
> مکتب ہے، مکتب کے بھی کئی معانی ہیں۔ لائبریری،
> سکول اور مدرسے وغیرہ مکتب
> کی اصطلاحات ہیں۔

جائے پیدائش ہے۔ یہ حزبیں کہاں پیدا ہوئی ہیں؟ مطالعہ کریں کہ حزب کا پہلا جنم کہاں ہوا ہے، پھر وہاں سے اس کے بچے نکلے ہیں اس کے بعد وہ ساری دنیا میں پھیل گئی ہیں اور آج ہم اسلامی احزاب بناتے ہیں۔ اسلامی احزاب کا لقب یا بینر لگا کر ہم نے اسلامی بنالیا ہے۔ یہ دیکھیں کہ یہ چیزیں ذات میں کیا تھیں؟ آیا ان کو اسلامی بنایا جا سکتا ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہندوستان سے ایک مورتی لے کر آئیں اور اس کے اوپر اسلام کا جھنڈا لگا دیں اور کہیں کہ اسلام کی مورتی ہے۔ یہ ڈھانچے جو ہمارے اندر بنے ہوئے ہیں، یہ کہاں سے داخل ہوئے، اسلام میں تھے تو بھی مطالعہ کی ضرورت ہے، اگر اسلامی ہیں تو بھی مطالعے کی ضرورت ہے، دلیل کی ضرورت ہے کہ یہ ڈھانچے کہاں سے داخل ہوئے اور کس دورِ اسلامی سے تعلق رکھتی ہیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں؟ باہر سے آئی ہیں تو بھی غور کریں کہ کہاں سے یہ چیزیں ہمارے اندر آئی ہیں اور آیا اس کے ذریعے سے ہم اسلام چلا سکتے ہیں؟ ہم نے اسلام کا متبادل بہت بنالیا ہے، ہر شعبے میں اسلام کا متبادل ہمارے پاس موجود ہے اور اس پر خوش ہیں کہ اسلام پر عمل کر رہے ہیں۔

فرعون کے پیروکار:

احزاب بھی اپنے لئے آئیڈیالوجی بناتی ہیں لیکن احزاب ہمیشہ اپنے پیروکاروں کے اندر کاذب احساس و کاذب آگاہی دیتی ہیں تاکہ ان کو اپنے ساتھ منسلک رکھیں، اپنے ساتھ منسلک رکھنے کے لئے یہ کاذب آگاہی ایجاد کرنا ضروری ہے۔ مثلاً فرعون نے اپنے پیروکاروں کے اندر ایک کاذب احساس پیدا کیا ہوا تھا، وہ فرعون کی خدائی کے قائل تھے، وہ انہیں کہتا تھا کہ

”اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى“ (سورہ وَالنّٰزِعٰتِ، آیت ۲۴)

یہ فرعون کا اپنے پیروکاروں کو دیا ہوا احساس تھا۔ ابھی بھی ہم دیکھیں کہ یہ جو پیر قسم کے لوگ ہوتے ہیں یہ اپنے مریدوں کے اندر کاذب احساس ایجاد کرتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ بارش، برکت اور بیٹا ہماری وجہ سے ہوئے جبکہ بیٹی کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔ ہر وہ چیز جسے عوام پسند کرتے ہیں پیر کہتے ہیں کہ یہ ہماری وجہ سے ہوئی ہے اور مرید بھی ان کی بات کو مان لیتے ہیں کہ یہ انہیں کی وجہ سے ہی ہوئی ہے۔ یہ کاذب احساسات کی وجہ سے ہے۔ مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص کا روزگار نہیں تھا اور بے روزگاری کے دنوں میں جو بچے پیدا ہوئے ہیں وہ انہیں کہتا ہے کہ یہ بچے نحس ہیں جب یہ پیدا ہوئے تھے تو کھانے پینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا بعد میں ایک بچہ پیدا ہو گیا اور ساتھ ہی روزگار بھی مل گیا اب یہ کہتا ہے کہ یہ بچہ بہت ہی خوش قدم ہے کیوں کہ جب یہ پیدا ہوا روزگار مل گیا، تنخواہ بڑھ گئی اور گاڑی بھی مل گئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس بچے کی وجہ سے سارا کچھ ہوا ہے۔ بعض تو انگوٹھی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ انگوٹھی جب سے پہنی ہے اس وقت سے رزق میں وسعت آگئی ہے، یہ سب کاذب احساسات ہیں کہ انگوٹھیوں، پتھروں اور انسانوں کو مؤثر سمجھا جائے۔

دینی و اسلامی آئیڈیالوجی کا منبع:

اس وقت ملک کے اندر سیاسی پارٹیاں اپنے پیروکاروں اور ممبرز کے اندر کاذب احساسات ایجاد کرنے کے لئے کوشاں ہیں کیوں کہ جتنا زیادہ کاذب احساس پیدا کر سکیں اتنے موافق تر ہیں اور بدترین قوم وہ ہے کہ جو غلط، کاذب اور جھوٹے احساسات کو فوراً قبول کر لے، یہ سب سے ضعیف قوم ہوتی ہے اور ہدایت سے بہت دور ہوتی ہے۔ اس قوم کو ہدایت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جس کے اندر کاذب آگاہی زیادہ پھیلتی ہو۔ احزاب بعض اوقات اپنے لئے خاص آئیڈیالوجی اور دستوری نظریہ بنالیتی ہیں لیکن ہم اسکو دستوری نظریہ نہیں کہہ سکتے کہ دین کی آئیڈیالوجی بھی ان احزاب کی آئیڈیالوجی کی طرح ہے بلکہ دین کی آئیڈیالوجی ایک صحیح منبع سے نکلی ہوئی ہے۔ چونکہ آئیڈیالوجی کو منبع چاہئے، آئیڈیالوجی کھوپڑی سے

نہیں نکلتی، دینی واسلامی آئیڈیالوجی کا منبع انسان کی کھوپڑی، ذہن اور عقل نہیں ہے بلکہ اسلامی آئیڈیالوجی کا منبع وحی، قرآن، دین، سنت ِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور سیرتِ آئمہ اطہار علیہم السلام ہیں۔ اسلامی آئیڈیالوجی ان منابع سے نکلتی ہے نہ کہ جس شخص کے منہ میں جو آئے وہ دین کی آئیڈیالوجی بنتی جائے، جس چیز کا منبع ہوا سے دوسری آئیڈیالوجیز پر قیاس نہیں کرسکتے جن کا کوئی منبع نہیں ہے۔

اسلامی آئیڈیالوجی اور دیگر عام حزبوں کی بنائی ہوئی آئیڈیالوجیز کا کوئی مقایسہ یا موازنہ نہیں کرسکتے چونکہ ان آئیڈیالوجیز کا کوئی منبع نہیں ہے لہٰذا جو جی میں آیا وہ اس کے اندر داخل کرتے گئے۔ یہی مشکل اسلامی آئیڈیالوجی میں پیش آسکتی ہے۔

امت بننے کیلئے حبل اللہ سے تمسک:

امت کے لئے ہمیں پہلے حبل اللہ چاہئے قرآن کا فرمانا ہے کہ

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا" (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳)

تم سب حبلِ خدا سے تمسک کرو، حبل اللہ سے مراد دینِ خدا ہے، دینِ خدا سے اس وقت تمسک کرسکتے ہیں جب قابلِ تمسک ہو، تمسک یعنی اس پر عمل کرو اس کو اپنالو، اگر دین اپنانے کی حالت میں ہو تو اعتصام کرسکتے ہو، یہ ساری باتیں آیت خود بتا رہی ہے۔

"وَاعْتَصِمُوْا"

آپ حبلِ خدا سے اعتصام و تمسک کرو۔ اب حبلِ خدا اس قابل ہو کہ اس سے تمسک کرسکیں ورنہ حبل اس شکل میں ہے کہ قابلِ تمسک ہی نہیں ہے مثلاً فرض کریں کہ حبلِ خدا لوحِ محفوظ پر ہے اور ہم زمین پر رہتے ہیں اور خدا کہہ رہا ہے کہ حبل اللہ سے تمسک کرو، اب ہم کیسے کریں؟ ہم میں تو اتنی جمپ کی صلاحیت نہیں ہے کہ اچھل کر لوحِ محفوظ تک چلے جائیں۔ ہم معمولی، ناقص اور جاہل انسان ہیں، حبل اللہ کو ادھر ہمارے پاس لائیں، ہم غرق ہو رہے ہیں، غریق کے پاس حبل اللہ آئے تا کہ ہم اس سے تمسک کریں، حبل اللہ آپ نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے جبکہ تمسک کا ہمیں حکم دے رہے ہیں پس حبل اللہ ہمارے پاس ہوتا کہ ہم اس سے تمسک کریں۔ دوم یہ کہ یہ حبل، یہ اللہ کی رسی، اس قابل ہو کہ اس سے سارے تمسک کرسکیں۔ اگر ایک فٹ رسی ہو اور ایک فٹ رسی کو دو آدمی پکڑ سکتے ہیں۔ باقی کیا کریں؟ پس رسی اتنی ہونی چاہئے کہ سب کے لئے قابلِ تمسک ہو۔

حبل اللہ سے تمسک کی دوسری شرط:

اللہ کی رسی کو تھام لو اعتصام کرو، تمسک کرو۔ پس یہ رسی تھامنے کے قابل ہونی چاہئے تا کہ ہم اس کو تھام سکیں۔ خداوند تعالیٰ کا فرمانا ہے کہ زندگی کے ہر مسئلے اور ہر مشکل میں اللہ کی رسی کو تھامو۔ پس معلوم ہوا کہ زندگی کے ہر مسئلے میں اللہ کی رسی کا عمل دخل ہونا چاہئے۔ اگر ہمیں انفرادی، اجتماعی، معیشتی، تعلیمی، سیاسی، انتظامی، اخلاقی، دنیوی اور اخروی زندگی میں سے کوئی بھی مشکل پیش آتی ہے جو انسانی ضرورت ہے اس میں وہ رسی موجود ہو، تا کہ ہم اس رسی کو تھام سکیں، پس قابلِ تمسک ہو، قابلِ تمسک ہونے کے لئے اس کو مکتبی اور آئیڈیالوجیکل شکل یعنی اس کی دستوری شکل ہونا ضروری ہے چونکہ اگر یہ دستوری شکل میں نہ ہو، قابلِ تمسک و قابلِ اعتصام نہ ہو جبکہ خدا نے حکم دیا ہے کہ اس سے تمسک اور اعتصام کرو یہ ممکن نہیں ہے۔ اعتصام کے قابل اس وقت ہوگی جب اس کی شکل اور ڈھانچہ دستوری ہو جائے، پس اس کا دستوری ڈھانچہ ہونا ضروری ہے اور دستوری ڈھانچہ ہی مکتب ہے۔

آئیڈیالوجی تعلیماتِ دین کا اصلی نقشہ:

آئیڈیالوجی کی کیا خصوصیات ہوں؟ چونکہ جو جس کے پاس ہے وہ کہتا ہے کہ یہی ہماری آئیڈیالوجی ہے مثلاً پاکستان میں رسومات کو بھی آئیڈیالوجی کہتے ہیں اور کچھ بعید نہیں ہے کہ ہر آدمی اپنے آپ کو صاحبِ آئیڈیالوجی سمجھ لے لہٰذا آئیڈیالوجی کے خطوطِ اصلی ہمیں معلوم ہونے چاہئیں کہ آئیڈیالوجی کے خدوخال کیا ہیں؟ اس کی شناختی علامتیں کیا ہیں اور کس طرح سے ہم دین کی دستوری شکل کی طرف آئیں اور کس طرح سے ہم دین کو دستور کی شکل میں

شہید مطہریؒ کے بقول

مکتب یا آئیڈیالوجی حرکت آفرین ہے، مکتب حرکت اور تحریک پیدا کرتی ہے اور یہیں سے مکتبی تعلیمات غیر مکتبی تعلیمات سے جدا ہو جاتی ہیں یعنی جتنا نشہ آور منشیات ہیں وہ مکتب سے خود بخود باہر چلی جاتی ہیں چونکہ مکتب کے اندر وہ چیزیں آسکتی ہیں جو حرکت ایجاد کریں جبکہ نشہ حرکت کو ختم کرتا ہے

سمجھیں۔ پہلی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ آئیڈیالوجی تعلیماتِ دین کا عملی نقشہ ہو، اس کو آئیڈیالوجی کہیں گے۔ آئیڈیالوجی کی تعریف میں ہے کہ عقائد، افکار، نظریات، تعلیمات، دستورات اور قوانین شعبہ ھای زندگی سے متعلق راہنمائی کا عملی نقشہ آئیڈیالوجی کہلاتا ہے اگر ہمیں یہ عملی نقشہ مل جائے پھر ہم اس کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ مکتب ہے اور یہ دین کا دستور ہے۔

> **سوشل ازم، کمیونزم اور دیگر ازم جو پیدا ہوئے ہیں انہوں نے یہ کاذب احساس اپنے پیروکاروں کے اندر ایجاد کیے ہیں اور ضعیف اور کمزور انسان جلدی کاذب احساسات کے تابع ہو جاتے ہیں اور فوراً اس کاذب آگہی کو قبول کر لیتے ہیں مثلاً کسی شخص کی بھی معنویت اور کسی بھی غلط راہ کی حقانیت کے قائل ہو جاتے ہیں اور جو سکھا دیا جائے آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لے آتے ہیں اور حقیقت کی طرف کبھی بھی توجہ نہیں کرتے۔**

آئیڈیالوجی میں یقین کی اہمیت:

دوسری خصوصیت اس کے لئے یہ ہے کہ یہ دین آئیڈیالوجی یا دستوری شکل میں اس وقت آئے گا جب ہم دین کے متعلق کچھ چیزوں پر یقین رکھتے ہوں اور ہمارا ایمان ہو۔ ہم عموماً ولایت فقیہ کے نعرے بہت لگاتے ہیں لیکن جب بات کرنی ہو تو اس وقت اُس مسلمان کی طرح ہو جاتے ہیں جس نے سکھ کو پکڑ کے مسلمان کرنا چاہا تھا۔ ایک جذباتی مسلمان نے بندوق کی نال پر ایک سکھ کو پکڑ لیا اور نیچے لٹا دیا پھر اسے کہا کہ تم کلمہ پڑھو، مسلمان ہو جاؤ، اس نے کہا کہ میں تو سکھ ہوں میں کلمہ نہیں پڑھوں گا اور دھمکی دی کہ اگر میں کلمہ نہ پڑھوں تو کیا کرو گے؟ مسلمان نے کہا گولی ماردوں گا، اُس نے جان بچانے کے لئے کہا کہ چلیں ٹھیک ہے آپ مجھے چھوڑیں، کلمہ بتائیں میں مسلمان ہوتا ہوں، اس وقت مسلمان نے سر پہ ہاتھ مارا اور افسوس کیا کہ اے کاش کلمہ یاد ہوتا تو آج ایک شخص مسلمان ہو جاتا۔ ہماری اکثریت کی یہ حالت ہے ولایت فقیہ کا شعار تو دیتے ہیں لیکن اگر کوئی ولایتِ فقیہ کے بارے میں پوچھے پھر کچھ بھی نہیں بتا سکتے اصلاً ذہن میں کچھ بھی نہیں آتا نعرے سے آگے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

ولایتِ فقیہ:

ولایت فقیہ کی بحث کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ ہماری ابھی توقع یہ ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ اور بدھ مت سب ولایت فقیہ کے قائل ہو جائیں۔ ولایت فقیہ ہر اسلام اور ہر تشیع کے اندر نہیں ہے، ایک خاص مرحلۂ دین شناسی طے ہو تو بات ولایت فقیہ تک پہنچتی ہے ورنہ بائی پاس سے گزر جاتے ہیں، دین کی بہت ساری شکلیں اور تفسیریں ایسی ہیں۔ جس طرح روڈ بنے ہوتے ہیں ان کے اوپر لکھا ہوتا ہے کہ شہر کے اندر جانے والا یہ راستہ جاتا ہے اور بائی پاس یہ راستہ ہے تو ہم شہر کے مشکلات اور رش سے بچنے کے لئے بائی پاس سے گزر جاتے ہیں۔ لہٰذا عموماً لوگ ترجیح دیتے ہیں شہر کے اندر جائے بغیر باہر سے گزر جائیں پہلے اس کو باہر وباہر کہتے تھے آج کل اس کو بائی پاس کہتے ہیں۔ اسی طرح اسلام اور تشیع کے اندر بہت سارے نظریے باہر وباہر ہیں، سارے باہر وباہر جنت جاتے ہیں اصلاً ولایت فقیہ کا سٹیشن بیچ میں آتا ہی نہیں ہے، کیوں نہیں آتا؟ اس لیے کہ جو جادہ ولایت فقیہ کی طرف جارہا ہے یہ اس جادے پر ہی نہیں ہے، یہ ابجدِ ولایتِ فقیہ ہے کہ ہم پہلے یہ طے کرلیں کہ آیا دین آخرت کے لیے آیا ہے یا فقط دنیا کے لئے آیا ہے یا آخرت و دنیا دونوں کے لئے آیا ہے؟ یہ ولایت فقیہ کا پہلا ابجد ہے، اب جس شخص کا یہ اعتقاد ہے کہ دین فقط آخرت کے لئے آیا ہے یا جس دین میں یہ نظریہ ہو اس دین میں ولایتِ فقیہ تک بات ہی نہیں آتی اور اس وقت اکثریت شیعہ وسنی کا نظریہ دیکھ لیں کہ دین فقط آخرت کے لئے ہے اور ہمیں جنت پہنچانے کے لئے ہے اس کے علاوہ دین کا کوئی ہدف، رسالت اور ذمہ داری نہیں ہے، یہیں پر ہی کہانی ختم ہوگئی، اب ولایت فقیہ اور حکومتِ اسلامی کس لیے ہے؟ ساری چیزیں یہیں پر ختم ہوگئیں، یہ باہر وباہر ہو گیا۔

دین، دنیا اور آخرت کی یکساں ضرورت:

اگر دین دنیا و آخرت دونوں کے لئے ہے تو پھر دین دنیا کے کون سے

شعبے کے لئے ہے، آیا دین فقط انسان کے اخلاقیات سنوارنے کے لئے ہے یا مکمل زندگی کا ضابطہ ہے۔ علماء وغیر علماء کی ایک بڑی اکثریت یہی کہتے ہیں کہ دین آخرت کے لئے ہے اگر دنیا کے لئے ہے تو وہ فقط اخلاقیات کے لئے ہے کہ دنیا میں ہمارا اخلاق ٹھیک ہوجائے۔ پس یہ راستہ بھی ولایت فقیہ تک نہیں جاتا۔ اگر دین اخلاقیات سے زیادہ بیان کرنے کے لئے آیا ہے، اخلاقیات و دیگر شعبے بھی لایا ہے، پھر اس صورت میں دین جامع ہے اور اس کے اندر جامعیت ہے اور اگر فقط احکام وقوانین اور نصیحتیں لے کر آیا ہے تو یہ جامع نہیں ہے۔ اگر جامع ہے تو ولایت فقیہ تک بات پہنچے گی ورنہ یہیں سے بائی پاس ہوکر کسی اور جادے پر نکل جائیں گے۔ پہلے جامعیتِ دین کو درک کریں پھر اس کے بعد امامؒ کا نظریۂ ولایتِ فقیہ پڑھیں۔

امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے ولایت فقیہ کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل واستدلال کی ضرورت نہیں ہے فقط اسلام کو صحیح تصور کرلو اور درست پڑھ لو یہی کافی ہے دین خود آپ کو بتائے گا، اسلام کے اندر جامعیت ہے، جب اسلام کے اندر جامعیت ہے اس جامعیت کا ایک اہم پہلو ربطِ دین و سیاست ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سیاست زندگی کا شعبہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کا دین سے ربط ہے یا نہیں؟ اگر دین سے اس کا ربط ہے اور دین کے اندر سیاست کی گنجائش ہے پھر اگلی بات آتی ہے کہ اب جبکہ سیاست ہے تو دین کا سیاسی نظام کیا ہے؟ اس کے بعد پھر بات نظامِ ولایتِ فقیہ کی طرف نکلتی ہے، یہ ابجدِ ولایتِ فقیہ ہے۔

رابطۂ دین و سیاست ابجدِ امّت:

امت سازی کے لئے ہم بائی پاس راستوں پہ جارہے ہیں، امت بننے کے لئے رش ہے، مسئلہ ہے اور پریشانیاں ہیں۔ اگر امت کی طرف آئیں

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ"

(سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴)

تم امت بنو! اس کے لئے ہمیں پہلے جن چیزوں کی تصدیق کی ضرورت ہے یعنی امت بننے کے لئے جو ابجد ہیں اس ابجدِ امت میں پہلا مطلب یہ ہے کہ دین انسان کی دنیا آباد کرنے کے لئے آیا ہے و آخرت، دنیا کی آبادی سے بنانے کے لئے آیا ہے، باقاعدہ ترتیب ہے، یعنی دین کا پہلا ہدف انسان کی دنیا یعنی موت سے پہلے کی زندگی ہے۔ دین موت سے پہلے کی زندگی سنوارنے کے لئے آیا ہے تمام دین کا ہدف انسان کی اس زندگی کو سنوارنا ہے، سعادت مند اور بامقصد بنانا ہے، یہ دین کا اصلی ہدف ہے۔ اگر ہم دین کی تعلیمات کو پڑھیں اور اس پر غور کریں تو قرآن ان چیزوں کی تشریح زیادہ کررہا ہے، قبل از موت کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے چونکہ بعد از موت قبل از موت کا نتیجہ ہے، قبل از موت بنے گا تو بعد از موت کے لئے میدان ہموار ہوگا اگر قبل از موت کی زندگی تباہ، ویران اور ضائع ہوگئی تو پھر انسان مطمئن ہوجائے کہ بعد از موت ویرانی ہی ویرانی ہے۔

"الدنیامزرعة الآخرة"

دین دنیا کو بائی پاس کرکے آخرت میں نہیں لے جاتا یہ چور راستہ ہے جو کہ ممنوع ہے ہمیں اس راستے سے جانے نہیں دیں گے۔ لہٰذا آپ دیکھیں کہ اقبالؒ نے خانقاہی طریقہ کو غلط کہا ہے یا امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بائی پاس راستے ہیں یعنی دنیا کو چھوڑ کر آخرت میں جانے کا نظریہ خانقاہیت ہے۔ دنیا آباد کیے بغیر، دنیا سنوارے بغیر، دنیا کی کھیتی کو سبز کیے بغیر، پرواز کرکے آخرت میں جانے کا نظریہ غلط نظریہ ہے، دینی نظریہ نہیں ہے، کسی نبی نے یہ کام نہیں کیا، کسی نبی نے خانقاہیت اختیار نہیں کی، قرآن نے انبیاءؑ کا ذکر کیا ہے کہ انبیاء نے زندگیاں کیسے بسر کی ہیں کہ اسی زندگی کے اوپر آخرت کو بنایا ہے بائی پاس نہیں کیا ورنہ انبیاءؑ کے پاس معرفت کافی تھی، ذکروفکر انہیں سب سے اچھے معلوم تھے، دعائیں سب سے زیادہ بہتر یاد تھیں انہیں کافی تھا کہ ایک غار ڈھونڈ لیتے اور اس میں بیٹھے رہتے، وہیں پر ذکروفکر کرتے رہتے لیکن انبیاءؑ واولیاء اللہؑ غاروں میں نہیں گئے۔ اس لیے کہ انہیں خدا نے جو ماموریت دی تھی وہ اس حیاتِ قبل از موت کو آباد کرنے اور سنوارنے کے

جب سے جمہوریت کے نام سے نظام سامنے آیا ہے اس وقت سے حزب پیدا ہوئی ہے یعنی حزب درحقیقت جمہوریت کی پیداوار ہے، احزاب جمہوریت کی اولاد ہیں چونکہ جمہوریت میں جمہور کو اقتدار میں آنا ہے، جمہور کو حکومت تشکیل دینی ہے اور اقتدار میں آنے کے لئے جمہور حزب کی شکل اختیار کرتی ہے تاکہ یہ اقتدار میں آسکیں لہٰذا آج کی حزبوں کا محور اقتدار ہے، اقتدار میں آنا ہدفِ اصلی ہے۔

لئے تھی۔ اگر یہ ماموریت تھی تو کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک نبی سب کچھ چھوڑ کے کسی دوسری طرف چلے جائیں یہ کھیت آباد کریں تا کہ اس کے اوپر آخرت اگے، یہ الف امت سازی ہے، اگر ہمارا یہ نظریہ نہ ہو کہ دین کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر امت بننے کی ضرورت نہیں ہے، امت کے بجائے آپ دوسرے سلسلے بن جائیں، آپ معنوی لوگ بنیں، آپ عرفاء، صوفیاء، خانقاہ نشین اور خانہ نشین بنیں، آپ کو جو کچھ بننا ہے وہ بنیں اور امت کو چھوڑ دیں چونکہ امت کا سیدھا تعلق اس نظامِ حیاتِ دنیوی کو آباد کرنا ہے۔

پس آئیڈیالوجی کیا ہے؟ آئیڈیالوجی درحقیقت دینی تعلیمات کا عملی نقشہ ہے اصلاحِ دنیا و سعادتِ دنیا کے لئے آئیڈیالوجی ہے اور آئیڈیالوجی دنیا کو سعادت مند بنانے کا عملی نقشہ ہے یا دنیوی زندگی کے لئے دین کی تعلیمات کو دستوری شکل دینا یہ آئیڈیالوجی یا مکتب ہے۔

مکتب عقیدتی اسلحہ:

بعض علماء و بزرگان نے تعبیر کیا ہے کہ مکتب درحقیقت انسان کے پاس ایک عقیدتی اسلحہ ہے، امت ایک مسلح انسانی جمعیت کا نام ہے، جو عقیدے کے اسلحے سے مسلح ہو، آئیڈیالوجی ایک عقیدتی اسلحہ ہوتا ہے۔ لہٰذا آئیڈیالوجی کے اندر بہت شفاف طور پر عنصرِ دشمن ستیزی موجود ہوتا ہے، آئیڈیالوجی دشمن ستیز و دشمن شناس ہوتی ہے، ہر آئیڈیالوجی کے دشمن ہیں، خصوصاً دینی آئیڈیالوجی کے اندرونی و بیرونی دشمن ہوتے ہیں۔ ہر سوسائٹی کے دشمن دو طرح کے ہیں جس طرح اخلاقیات میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے دو دشمن ہیں ایک ہمارا دشمن نفسِ امارہ ہے اور ایک بیرونی دشمن ہے اور اندرونی دشمن زیادہ خطرناک ہے اس کے ساتھ مبارزے کو جہادِ اکبر کہا گیا ہے، باہر والے دشمن کے ساتھ مبارزے کو جہادِ اصغر کہا گیا ہے، اسی انسان کی طرح امت ایک ترکیب نہیں ہے جیسے ایک انجمن بناتے ہیں، امت میٹنگوں، قراردادوں اور معاہدوں سے نہیں بنتی، امت اس طرح بنتی ہے کہ جس طرح سے مختلف اعضاء و اجزاء مل کر بدن بنتا ہے

"اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ" (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳)

الفتِ بینِ قلوب یعنی دلوں کی الفت سے امت بنتی ہے، ابدان کے جوڑنے سے امت نہیں بنتی، جسم بے شک قریب قریب ہو جائیں، اس سے امت کبھی بھی تشکیل نہیں پاتی، دلوں کی الفت سے امت بنتی ہے اور اس طرح سے بنتی ہے کہ سب مل کر پیکرِ واحد بنیں، یہ پیکرِ واحد عیناً بدن کی طرح ہے، جس طرح انسان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ تیرا اندرونی دشمن ہے اور بیرونی دشمن ہیں اسی طرح امت و پیکر کے اندر بھی اندرونی و بیرونی دشمن ہیں۔ نفسِ امارہ کی طرح امت کا اندرونی دشمن بیرونی دشمن سے خطرناک تر ہے۔

"ان النفس لامارة بسوء واعداء عدوااعداء عدوك نفسك التي بين جنبيك"

تیرا سب سے بڑا دشمن تیرے پہلو میں ہے اور وہ تیرا نفس ہے۔

امت کے اندرونی و بیرونی دشمن:

امت کا سب سے بڑا دشمن امت کے اندر رہتا ہے، جس طرح نفسِ امارہ ہے۔ امت کے بیرونی دشمن بھی ہیں۔ لہٰذا امت ایک حساس پیکر کا نام ہے اس وقت جو مسلمان قوم کی صورت میں ہیں اور قوم بے حس پیکر کا نام ہوتا ہے، ابھی ہم قوم ہیں، شیعہ قوم ہیں اس لئے بے حس ہیں، دشمن شناس نہیں ہیں اس کو نہ ہی اندرونی دشمن کا پتہ ہے اور نہ ہی بیرونی دشمن کا پتہ ہے اس کو کسی پر حساسیت نہیں ہے، پس اندرونی طور پر دشمن سب شیعہ ہیں، بیرونی طور پر بھی ہر ایک کے ساتھ سازگار ہیں، اگر دشمن ڈھونڈتے بھی ہیں تو فرقہ واریت کے چینل سے جا کر اپنا دشمن تشخیص دیتے ہیں جس میں اصلی دشمن چھپ جاتا ہے یعنی کسی فرقے کو اپنا دشمن مان لیتے ہیں جبکہ ایک نظریے اور ایک پیکر کا دشمن وہ چیزیں نہیں ہوتیں جس طرح جسم کا دشمن ہوتا ہے، جسم کا دشمن جسم قرار نہیں دیا گیا، جسم کے دشمن آفات و بیماریاں ہیں، کوئی انسان دوسرے انسان کے لئے جراثیم فرض نہیں کیا گیا، بیماری کا ذریعہ نہیں کہا گیا بلکہ غیر انسانوں کو یہ

اب تو مدرسوں، مسجدوں اور امام بارگاہوں کے اندر جو خالص دینی مراکز ہیں ان کی جو مدیریت ہے، ان دینی مراکز کو چلانے کے ڈھانچے کا دین سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے قیام کے لئے ہر چیز این جی اوز سے لاتے ہیں، این جی اوز بھی اسی طرح چلتی ہیں جس طرح ہم مساجد چلا رہے ہیں، این جی اوز کے ڈھانچے سے مسجدیں، امام بارگاہیں، عزاداری اور سب کچھ چلا رہے ہیں۔

> یہ جو پیر قسم کے لوگ ہوتے ہیں یہ اپنے مریدوں کے اندر کاذب احساس ایجاد کرتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ بارش، برکت اور بیٹا ہماری وجہ سے ہوئے جبکہ بیٹی کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔ ہر وہ چیز جسے عوام پسند کرتے ہیں پیر کہتے ہیں کہ یہ ہماری وجہ سے ہوئی ہے اور مرید بھی ان کی بات کو مان لیتے ہیں کہ یہ انہیں کی وجہ سے ہی ہوئی ہے۔ یہ کاذب احساسات کی وجہ سے ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ بیماریاں ہیں۔ اسی طرح امت کے اندر بھی فرقے ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں، امت اور آئیڈیالوجی کے لئے دشمن خطرناک نظریے ہیں، لہٰذا آئیڈیالوجی کے اندر حساسیت ہے جس طرح جسم کے اندر مدافعت ومقاومت ہے مثلاً انسان کی آنکھ خدا نے اس طرح سے بنائی ہے کہ اگر مچھر اڑ کر آپ کے آنکھوں کی طرف آ رہا ہو اور آپ کو پتہ بھی نہ ہو اور یہ مچھر آنکھ میں جانا چاہے تو خودکار طریقے سے آنکھ بند ہو جاتی ہے اور آنکھ میں خدا نے فوق العادۃ نظام رکھا ہوا ہے اور وہ دفاعی نظام بھی تہہ در تہہ ہے، ایک دفاعی لائن ہے پھر اس کے پیچھے دوسری، پھر تیسری اور پھر چوتھی دفاعی لائن ہے لہٰذا یہ دشمن اگر ایک لائن عبور کرے تو دوسری یا تیسری میں پھنس جاتا ہے۔

امت کا مدافعاتی نظام:

جس طرح جسم کے اندر مدافعاتی نظام ہے اسی طرح امت کے اندر بھی مدافعاتی نظام ہے البتہ قوم کے اندر نہیں ہوتا امت کے اندر مدافعاتی نظام ہوتا ہے کہ اس کو دشمن کی پہچان ہوتی ہے، امت دشمن ستیز ہوتی ہے، کیوں دشمن ستیز ہوتی ہے؟ چونکہ آئیڈیالوجی دشمن ستیز ہوتی ہے یعنی دشمن کے ساتھ سازگاری نہیں ہوتی بلکہ دشمن تلاش کرتی ہے اور دشمن کو دھتکارتی ہے، رد کرتی ہے۔ وہ طبقہ انسانوں کا دشمنوں میں گر جاتا ہے جس کے اندر یہ حساسیت نہ ہو اور یہ حساسیت آئیڈیالوجی ومکتب سے پیدا ہوتی ہے۔ آئیڈیالوجی انسان کو تمام اجتماعی امور میں موقفِ واحد بنا کے دیتی ہے، ایک موقف آئیڈیالوجی بنا کے دیتی ہے لہٰذا امت اس وقت کہتے ہیں کہ جب وہ اس سلسلے میں منسلک ہیں جو امت بنیں ان کا تمام اجتماعی امور میں ایک موقف ہو، ہر ایک اپنی بولی نہ بول رہا ہو، ہر ایک اپنی راہ نہ چل رہا ہو، اگر ایسا ہو وہ امت نہیں ریوڑ ہوتا ہے، مثلاً قوال جب بولتے ہیں تو مل کے ہاہا کرتے ہیں، طبلہ، تالی، ہارمونیم اور ہا ہو سب آپس میں ہم آہنگ ہوتا ہے لیکن جب مینڈک بولتے ہیں تو اس وقت کوئی چیز ہم آہنگ نہیں ہوتی، ایک کی آواز میں دوسرا بول رہا ہوتا ہے اور دوسرے کی آواز میں تیسرا بول پڑتا ہے اور اس طرح ان آوازوں میں ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب امت نہ ہو صرف ایک اجتماعی ڈھانچہ ہو پھر ہر منہ سے الگ آواز نکل رہی ہوتی ہے، ہر ایک سے الگ تبصرہ نکل رہا ہوتا ہے، ہر ایک صاحبِ نظر ہوتا ہے، یہ مینڈ کی حالت ہے اگر آئیڈیالوجی نہ ہو اور مینڈ کی حالت میں ہو تو ہر کوئی بول رہا ہوتا ہے، ان کا ایک موقف نہیں ہوتا۔ ایک موقف صرف آئیڈیالوجی سے آتا ہے اور ہمارے پاس آئیڈیالوجی نہیں ہے بلکہ ہم نے آئیڈیالوجی کے متبادل چیزیں اپنائی ہوئی ہیں۔

موقفِ واحد امت کی بنیادی ضرورت:

پس مکتب درحقیقت امت کو ہر اجتماعی مسئلے میں ایک موقفِ واحد عطا کرتا ہے۔ مکتب کے اندر ہر چیز دقیق، شفاف وصریح ہوتی ہے، کسی کے اوپر غبار و پردہ نہیں ہوتا، ابہام نہیں ہوتا گول مول بات نہیں ہوتی۔ مکتب کی تعلیمات دستور نہیں بن سکتیں جب تک شفاف اور واضح نہ ہوں۔ مکتب کی تعلیمات تب دستور بن سکتی ہیں جب ان کے اوپر کوئی ابہام، تاریکی اور غبار نہ ہو۔ مکتب میں یہ نہیں کہا جاتا کہ اس سلسلے میں علماء میں اختلاف ہے، جیسے ہوتا ہے کچھ علماء کہتے ہیں کہ چاند نظر آئے تو عید کرو، کچھ کہتے ہیں کہ سورج نکلے تو عید کرو اور کچھ کہتے ہیں ستارہ نکلے تو عید کرو، آئیڈیالوجی کا یہ موقف نہیں ہوتا، آئیڈیالوجی اپنے پیروکاروں کو اس طرح سے حیران و سرگردان نہیں رکھتی، مکتب کے پیروکار بالکل واضح موقف اور شفاف راہ رکھتے ہیں، ان کے موقف اقدام کے اندر ابہام وغبار نہیں ہوتا۔ مکتب میں چونکہ ایک ترتیب ہوتی ہے لہٰذا اصول وفروع ایک ترتیب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اصول یعنی بنیادی امور، اصول کی ایک دینی اصطلاح پہلے سے ہمارے ذہن میں ہے، اصولِ دین اور فروعِ دین وہ اور ہے، ان کو ہم بنیادی اور ثانوی مسائل کہہ سکتے ہیں۔ آئیڈیالوجی میں ہمیشہ بنیادی مسائل اور ثانوی مسائل میں واضح فرق موجود ہوتا ہے اور آئیڈیالوجی میں بنیادی مسائل میں ذرہ برابر لچک نہیں ہوتی لہٰذا بعض جو کہتے ہیں کہ

سیاسی پارٹیاں اپنے پیروکاروں اور ممبرز کے اندر کاذب احساسات ایجاد کرنے کے لئے کوشاں ہیں کیوں کہ جتنا زیادہ کاذب احساس پیدا کرسکیں اتنے موفق تر ہیں اور بدترین قوم وہ ہے کہ جو غلط، کاذب اور جھوٹے احساسات کو فوراً قبول کرلے، یہ سب سے ضعیف قوم ہوتی ہے اور ہدایت سے بہت دور ہوتی ہے۔ اس قوم کو ہدایت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے

آئیڈیالوجی نہیں ہونی چاہیئے، آئیڈیالوجی مناسب نہیں ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ آئیڈیالوجی کے اندر لچک نہیں ہوتی، اس کے اندر صلابت ہوتی ہے۔ لچک آئیڈیالوجی میں ہے لیکن اصول اور بنیادی مسائل میں ذرہ برابر لچک نہیں ہوتی لیکن اگر انسان کا مسلک آئیڈیالوجیکل اور مکتبی تفکر نہ ہو اس کی ہر چیز میں لچک ہے، اس کے بنیادی ترین مسائل میں بھی لچک ہے۔

مکتب اور مکتب کا جانشین:

اس وقت ہم مکتب کے جانشینوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، مکتب کے ہوتے ہوئے ہم ولی عہد کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ بھی وہ ولی عہد جو غلط ہیں اور غیر قانونی ہیں، مکتب کا ولی عہد کوئی بھی نہیں ہے لیکن ہم نے بنائے ہوئے ہیں، مکتب کا ایک جانشین مصلحت ہے، مکتب کا دوسرا جانشین مفاد ہے، سب سے بڑا جانشین جو مکتب کا بن جاتا ہے وہ مصلحت ہے اور وہ مصلحتِ دین بن جاتا ہے، مکتبی دین اس کے مقابلے میں ہوتا ہے، مصلحتی دین میں لچک ہی لچک ہے۔ مصلحت یعنی ایک شخصی، ایک ایسی حقیقت جو ہمارے شخصی مفاد سے مربوط ہو، یوں کہہ لیں چھوٹی حقیقت اور معمولی حقیقت جس سے ہمارا شخصی، گروہی، ذاتی اور خاندانی مفاد وابستہ ہو، یعنی وہ چھوٹی حقیقت جس سے ہمارا مفاد وابستہ ہو اور اس کے لئے اس حقیقت کو قربان کردینا جس میں ہمارا مفاد نہ ہو اس کو مصلحت اندیشی کہتے ہیں۔ مصلحت پسندی ایک اور اصطلاح ہے۔ مصلحت پسند انسان وہ ہوتے ہیں جو ہمیشہ ان حقائق کو چنتے اور ترجیح دیتے ہیں جن سے ان کے مفاد وابستہ ہیں، مثلاً فرض کرلیں کہ ایک مومن، متقی، پارسا اور پرہیزگار انسان ہے، یعنی ہر لحاظ سے بہت عالی انسان ہے لیکن اس سے میرا کوئی مفاد نہیں ہے، وہ میرے کسی کام میں نہیں آتا اور اس کی بجائے ایک فاسق انسان ہے میں فاسق انسان پر اس مومن کو قربان کرتا ہوں، مومن کو چھوڑ دیتا ہوں، فاسق کو اہمیت دیتا ہوں یہی مصلحت پسندی ہے۔ اس کے لئے پھر انسان ہزار دلائل بھی گھڑ لیتا ہے۔

مصلحت پسندوں کا ظلم:

دین اور دین داروں کی قربانیاں دیکھیں کہ دین اور دیندار کہاں کہاں قربان ہوئے ہیں مثلاً آپ کربلا کو دیکھ لیں اور کربلا جیسے واقعات اور میدان کہ جہاں پر حق واہلِ حق کا سر کٹا ہے اگر ہم اس پر غور کریں اور تاریخ بھر میں تلاش کریں تو سب سے زیادہ حق واہلِ حق کا سر اہلِ مصلحت نے کاٹا ہے۔ ظالموں نے اتنا نہیں کاٹا جتنا اہلِ مصلحت نے کاٹا ہے، حق سب سے زیادہ یہاں قربان ہوا ہے، حق کا مقتل مصلحت ہے مصلحت کے مقتل میں حقیقت ساری قربان ہوجاتی ہے۔ آئیڈیالوجی میں لچک نہیں ہوتی چونکہ مصلحت آئیڈیالوجی کی جانشین ہے، آئیڈیالوجی کو اس لیے نہیں اپناتے کہ اس کے بنیادی مسائل میں لچک نہیں ہے۔ لہٰذا آپ دیکھیں کہ امام خمینیؒ میں ذرہ برابر لچک نہیں تھی بعض اوقات یہ لچک پیدا کرنے کے لئے قریبی ترین ساتھی ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے کہ امامؒ میں لچک پیدا ہوجائے لیکن نہیں ہوتی تھی، امامؒ میں لچک پیدا کرنے کے لئے بہت قریبی ساتھی دباؤ ڈالتے تھے لیکن نہیں ڈال سکتے تھے۔

"قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ . لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ"

(سورہ الکافرون، آیت ۲،۱)

یعنی بنیادی مسائل میں لچک نہیں ہونی چاہیئے۔ آئیڈیالوجی جس طرح سے دشمن ستیز ہے اس طرح سے اس کے اندر ایک اور خصوصیت بھی ہے وہ یہ کہ آئیڈیالوجی خود دشمن تراش بھی ہے، چونکہ آئیڈیالوجی ایک ایسا مکتب، لائن اور راہ ہے کہ ممکن ہے بعض لوگ لاتعلق رہ سکیں لیکن چونکہ آپ نے مکتبی راستہ اختیار کرنا ہے آپ ان کو دشمنی پر مجبور کردیتے ہیں لیکن غیر مکتبی دین میں بڑے بڑے دشمنوں کے ساتھ سمجھوتہ ہوسکتا ہے۔ غیر مکتبی دین سمجھوتے کا دین ہے اس میں سمجھوتہ ہی سمجھوتہ ہے، قرآن مجید نے بہت ساری ستیز کا ذکر کیا ہے کہ یہ اکٹھے نہیں ہوسکتے

"اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا" (سورہ السجدۃ، آیت ۱۸)

یہ مکتبی دین میں اکٹھے نہیں ہوسکتے لیکن غیر مکتبی دین میں مومن و فاسق دونوں دوست اور پارٹنر ہوتے ہیں، ہر چیز میں رشتہ ہوتا ہے، ہم متدین ترین لوگ بھی اپنے گھروں کو دیکھیں فاسقوں کے ساتھ کتنے گہرے روابط ہیں، فاسق ہمارے کن کن شعبوں میں پارٹنر ہیں جبکہ آئیڈیالوجی میں بھائی بھی اگر فاسق ہو اس سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئیے، آئیڈیالوجی میں اس شعبے میں لچک نہیں ہے۔

کیا آئیڈیالوجی دشمن تراش ہے؟

آئیڈیالوجی دشمن تراش بھی ہے۔دوسرے لفظوں میں مکتب دشمن کو طیش دلاتا ہے۔مثلاً غیر مکتبی لوگ جن کا ذہن آئیڈیالوجیکل نہیں ہے جنہوں نے باہر و باہر سے جنت جانا ہے ایک اعتراض انقلاب اسلامی پر کرتے ہیں کہ انقلابِ اسلامی نے عرب، عجم، امریکہ اور یورپ ہر ایک کو اپنا دشمن بنا لیا ہے، مثلاً صدر خاتمی صاحب نے آتے ہی یہ کوشش کی کہ انقلاب کے دشمنوں کو کم کریں، اس نے دشمن سے دوستی شروع کردی تھی، اس نے سب سے پہلا خطاب ملتِ ایران کو نہیں کیا بلکہ امریکہ کو کیا اور مؤدب ہوکر ان کے سامنے بیٹھے اور خطاب کیا کہ اے ملتِ بزرگِ امریکہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، درود وسلام ہو آپ ملتِ عظیم الشان پر اور آزادی کا وہ مجسمہ جو امریکہ میں لگا ہوا ہے اس مجسمے پہ درود پڑھا، جب وہ کولمبس گیا تھا تو اس نے ساحل پر ایک امریکہ کو کشف کرنے کی نشانی ایک پتھر رکھا تھا، خاتمی صاحب نے اس پتھر پہ درود پڑھا، یہ اپنے تئیں بہت ہی زبردست کام کررہے تھے کہ انقلاب کے مقابلے میں دشمنوں کی کمی لا رہے تھے، دشمنوں سے سمجھوتہ کررہے تھے۔بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ وہ رات ہمارے لیے عذاب کی رات تھی، ساری رات انھوں نے روتے ہوئے گزاری تھی، جب ملت کا نمائندہ اٹھ کر اتنا ذلیل ہوجائے، اٹھ کے اپنے دشمن پر درود وسلام پڑھنا شروع کردے اور اس کے سامنے حقیر ہوکر بات کرے، وہ قوم وملت جو اتنی باعظمت ہوچکی تھی، امامؒ نے جس کو اتنا اعلیٰ بتایا تھا۔غرض یہ کہ اہلِ سیاست ان پر ایک بڑا اعتراض کیا کرتے ہیں کہ انقلاب نے دشمن بہت بنائے ہیں، یہ ایک آئیڈیالوجی کی ذات میں ہے۔

دشمن تراشی پر غیر مکتبی لوگوں کا اعتراض:

آپ دیکھیں کہ امیر المومنین علیہ السلام پر یہ اعتراض انقلاب اسلامی سے پہلے ہوا ہے اور وہ اس لئے کہ آپؑ بھی دشمن تراش تھے۔اب دیکھیں کہ جنہوں نے آپؑ کو لیڈر بنایا تھا دوسرے لفظوں میں خود ان کے بقول بیعت کروائی، مدینے میں لوگوں کو پکڑ کر لاتے تھے اور بیعت کراتے تھے، یہی بعد میں مکہ میں چلے گئے اور لشکر بنا کے آپؑ کے مقابلے میں آئے، بڑی بڑی شخصیات ان میں شامل تھیں، بہت سارے لوگ آپؑ کا ساتھ چھوڑ کر شام چلے گئے اور امیر شام کے ساتھ مل گئے۔بعض آپؑ پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ آپؑ دشمن تراش ہیں، اپنے دشمن زیادہ بناتے ہیں۔آئیڈیالوجی کے اندر یہ خصلت موجود ہے کہ آئیڈیالوجی دشمن ستیز ہے، دشمن ستیز ہونے کے ساتھ دشمن تراش ہے چونکہ آئیڈیالوجی واضح وشفاف راہ کا نام ہے لہٰذا اندر بھی دشمن ہیں باہر بھی دشمن ہیں اور اندر کا دشمن زیادہ خطرناک ہے۔امتوں کو جو خطرات درپیش ہیں وہ بہت ہی عظیم خطرات ہیں جبکہ قوموں کو اندرونی کوئی خطرہ نہیں ہے چونکہ منافق، کافر، مشرک اور مومن سب مل کے قوم یا برادری بناتے ہیں۔آج کل یہ معیارات ہیں کہ ہم برادری سے باہر رشتہ نہیں دیتے اور نہ برادری کے باہر سے رشتہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں برادری کے اندر جو بھی ہو ٹھیک ہے بیشک باہر مومن ہو وہ درست نہیں ہے۔

مکتب کی حرکت آفرینی:

غیر مکتبی دین وغیر مکتبی اسلام میں تحقیق بہت بڑی فضیلت ہے لیکن مکتبی اسلام میں فضیلت تحریک اور حرکت ہے یعنی جو اپنے پیروکاروں کے اندر حرکت ایجاد کرے، مکتبی اسلام کے اندر بھی تحقیق ہے لیکن مکتب کی جو طاقت ہے وہ یہ کہ پیروکاروں کو حرکت میں رکھیں، شہید مطہریؒ کے بقول مکتب یا آئیڈیالوجی حرکت آفرین ہے، مکتب حرکت اور تحریک پیدا کرتی ہے اور

> آئیڈیالوجی تعلیماتِ دین کا عملی نقشہ ہو، اس کو آئیڈیالوجی کہیں گے۔آئیڈیالوجی کی تعریف میں ہے کہ عقائد، افکار، نظریات، تعلیمات، دستورات اور قوانین شعبہ ھای زندگی سے متعلق راہنمائی کا عملی نقشہ آئیڈیالوجی کہلاتا ہے اگر ہمیں یہ عملی نقشہ مل جائے پھر ہم اس کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ مکتب ہے اور یہ دین کا دستور ہے۔

یہیں سے مکتبی تعلیمات غیر مکتبی تعلیمات سے جدا ہو جاتی ہیں یعنی جتنا نشہ آور منشیات ہیں وہ مکتب سے خود بخود باہر چلی جاتی ہیں چونکہ مکتب کے اندر وہ چیزیں آسکتی ہیں جو حرکت ایجاد کریں جبکہ نشہ حرکت کو ختم کرتا ہے، سلاتا ہے، وہ تمام چیزیں جو انسانی اجتماعی حرکت کو روکتی ہیں مکتب کے اندر وہ جزءِ دین نہیں ہیں یا ان کی شکل میں تحریف ہوئی ہے چونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی شکل، بنیاد اور اساس تحریکی ہے یعنی حرکت ایجاد کرنے والی ہیں لیکن ان کے اندر تصرف کر کے ان کو بنا دیا گیا ہے اس طرح سے کہ حرکت ایجاد کرنے کے بجائے وہ سکوت و جمود پیدا کر رہی ہیں، دین کے اندر بہت سارے شعبوں میں تحریف ہوئی ہے جن میں سے ایک تحریف یہ ہوئی ہے کہ حرکت پیدا کرنے والا مواد جمود کے مواد میں تبدیل کر دیا گیا ہے، چونکہ انسان پڑھ لکھ گیا ہے، انڈسٹری زیادہ پھیل گئی ہے، صنعتی دنیا نے اوزار کو اقدار بنا دیا ہے مثلاً ابھی ٹی وی میں عورتیں اوزار ہیں، ٹائر بیچنا ہو، نسوار بیچنی ہو، پیپسی بیچنی ہو، زہر بیچنا ہو ساتھ عورت ہوتی ہے، وہ چیز عورت سے مربوط ہو یا نہ ہو ساتھ عورت کی تصویر موجود ہوتی ہے، اگر کوئی چابی، پانا یا تالا بھی بیچنا ہو اس کے ساتھ عورت کی تصویر ضرورت ہوگی، عورت کو ٹول اور اوزار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، یہ موجودہ سرمایہ داری دور نے انسانوں کو ٹول بنا کے استعمال کیا ہے، صنعتی دنیا میں جب رہتے ہیں تو ہمارے نزدیک ہر چیز ٹول ہے، انسان بھی ٹول ہے، ہم سب ایک دوسرے کو ذریعہ و اوزار و ابزار سمجھتے ہیں، سیاستدان انسانوں کو ووٹر سمجھتے ہیں کہ یہ بھی فقط ٹول ہیں، قومیں لیڈروں کے ہاتھوں میں ٹول اور اوزار ہیں، ہم ہر چیز کا اوزار بنا رہے ہیں، ہمیں یہ تحفہ صنعتی دنیا نے دیا ہے کہ اقدار و ویلیوز کو ہم نے ٹول اور اوزار بنا دیا ہے اور مقدس ترین چیزوں کو کسی شرم و حیاء کے بغیر بطورِ ٹول استعمال کر رہے ہیں، مثلاً علماء، دین، مقدسات اور ہر چیز ٹول ہے۔

> **یہ ابجدِ ولایتِ فقیہ ہے کہ ہم پہلے یہ طے کرلیں کہ آیا دین آخرت کے لیے آیا ہے یا فقط دنیا کے لئے آیا ہے یا آخرت و دنیا کے لئے آیا ہے؟**
>
> **یہ ولایت فقیہ کا پہلا ابجد ہے، الفِ ولایت فقیہ یہ ہے کہ پہلے یہ تعین کرو کہ دین کس کے لئے ہے؟ اب جس شخص کا یہ اعتقاد ہے کہ دین فقط آخرت کے لئے آیا ہے یا جس دین میں یہ نظریہ ہو اس دین میں ولایتِ فقیہ تک بات ہی نہیں آتی**

حرکت کو جمود میں بدلنے کی کوشش:

اس زمانے میں ایک چیز میں زیادہ شدت آگئی ہے وہ یہ کہ جو چیزیں حرکت ایجاد کرنے کے لئے ہیں ان کو جمود کے لئے استعمال کیا جائے، ان کی ترکیب ایسی بدلیں کہ جمود ان کے اندر آجائے۔ مثلاً اخلاقیات ہیں۔ شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام خمینیؒ کے درسِ اخلاق میں شریک ہوتے تھے تو اس درسِ اخلاق سے ہمیں حرکت، جوش اور جذبہ ملتا تھا، اتنا جذبہ ملتا تھا کہ ہم بیٹھتے نہیں تھے آرام نہیں کرتے تھے اور بے چین رہتے تھے، یہ امامؒ کا درسِ اخلاق تھا اور ابھی درسِ اخلاق کیا ہوتا ہے کہ ایک متحرک اور فعال جوان کندھے اور منہ لٹکائے ہوئے ہوتا ہے اور اس سے جب پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا؟ تو کہتا ہے کہ فلاں آغا صاحب کے درسِ اخلاق میں گیا تھا اس لئے ایسا ہوں، یہ کیسا اخلاق ہے جو ایک متحرک جوان سے اس کی توانائی ہی چھین لے، یہ کیا اخلاق ہے؟ امام خمینیؒ نے عرفان پڑھا، عرفان پڑھ کے ساری دنیا کو للکارنا شروع کر دیا اور امامؒ کی نظروں میں امریکہ سے نیچے کوئی دشمن ہی نہیں بچا کہ کس کو للکاریں، سیدھا امریکہ کو جا کر للکارا یہ عرفان کا نتیجہ تھا۔ امامؒ کا عرفان حرکت آور تھا یعنی اس عرفان کے اندر بھی حماسہ تھا، اس اخلاق کے اندر بھی حماسہ، حرکت، جوش اور جذبہ تھا۔ آئیڈیالوجی یا مکتب کہتے ہی اس کو ہیں کہ جو اپنے پیروکار کے اندر حرکت ایجاد کرے نہ کہ جمود ایجاد کرے لہٰذا جمودی تعلیمات تحریف شدہ ہیں، وہ دین کا حصہ نہیں ہیں جن کے اندر جمود ہے، ان میں یا معنوی تحریف ہوئی ہے یا اس کے شعبے میں یا کسی شکل میں اس میں تحریف کر کے پیروکاروں کے اندر ٹھونسا گیا ہے اور ان کے اندر جمود پیدا کر دیا گیا ہے۔ مکتب کا ایک خاصہ یا مکتب کی ایک اعلیٰ صفت وہ ایجادِ حرکت ہے۔

امت سازی
از نظر قرآن

گروہ معارف

”وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ“ يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ“ عَظِيمٌ“ “ (سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

دین کا اساسی فریضہ:

دین کا اہم ترین اور بنیادی فریضہ امت سازی ہے جبکہ دیگر تمام فرائض درجے میں امت سازی کے بعد آتے ہیں۔قرآن مجید کی متعدد آیات، سنتِ معصومینؑ وانبیاء اور بالخصوص سنتِ رسول اللہ ﷺ اس بات کی گواہ ہیں کہ امت سازی فرائضِ دینی کا بنیادی رکن ہے۔امت کی اپنی خاص تعریف اور مفہوم ہے۔ ہر آبادی اور جمعیت کو امت کہنا درست نہیں۔آج جن معنوں میں ہم امتِ مسلمہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ قرآن کے معنی سے مطابقت نہیں رکھتا۔لیکن اگر ہم خود امت کا الگ سے اپنا ایک مفہوم وضع کریں اور اس میں امت کا لفظ استعمال کریں اس کا ہمیں اختیار ہے، مثلاً ہم کسی عمارت یا کسی ایک شخص کا نام امت رکھ لیں جیسے امت روڈ، امت کالج، امت سکول، امت مدرسہ وغیرہ۔یہ محض نام ہیں جنھیں ہم نے مختلف چیزوں کے لئے وضع کر لئے ہیں لیکن قرآن جس امت کی طرف راہنمائی کر رہا ہے اور جو دستور دے رہا ہے اس کا اپنا ایک خاص معنی ومفہوم ہے، ہمیں اِس معنی میں امت بننا ہے۔

الٰھی اور انسانی طریقۂ کار میں فرق:

امت کا حقیقی نمونہ ہمیں عہدِ رسول اللہ ﷺ میں ملتا ہے۔خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں امت کے جتنے ارکان بیان کیے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان اصولوں اور ارکان کے تحت امت تشکیل دی لیکن تدریجاً امت کا یہ اصل ڈھانچہ ختم ہوا، اس کا شیرازہ بکھرا اور مختلف شکلوں میں تبدیل ہونا شروع ہوگیا جس کی چند شکلیں آج موجود ہیں اور چند نئی شکلیں پیدا ہوگئی ہیں۔امت سازی کے لئے قرآن مجید نے طریقہ کار بھی ذکر فرمایا ہے کہ کس طرح سے امت سازی کرنی ہے؟ یہ ممکن نہیں کہ اصل فریضہ قرآن کا ہو اور طریقہ کار ہمارا اپنا ہو۔امت سازی میں روش، طریقہ کار اور امت کا ڈھانچہ بھی قرآنی ہے۔ہمیں مکمل طور پر دین کے بتائے ہوئے اصولوں کے تحت امت سازی کا عمل کرنا ہے، مثلاً جس طرح سے روزہ ایک فریضہ ہے تو ایسا نہیں ہے کہ شریعتِ مقدسہ میں خداوند تعالیٰ نے روزے کا حکم دے دیا اور پھر ہمیں روزے کا ڈھانچہ، شرائطِ روزہ اور اوقاتِ روزہ کو خود معین کرنے کے لئے چھوڑا ہو۔ ہمارے ہاں رائج ہے کہ ہم بعض اوقات ایک آئیڈیا تو دین سے لے لیتے ہیں لیکن اس کو عملی کرنے کا طریقۂ کار دین سے نہیں لیتے لہٰذا یہ ایک غیر دینی روش ہے۔مثلاً مسجد، مدرسہ، پارٹی وغیرہ دین کے حکم سے

> آج جن معنوں میں ہم امتِ مسلمہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ قرآن کے معنی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن جس امت کی طرف راہنمائی کر رہا ہے اور جو دستور دے رہا ہے اس کا اپنا ایک خاص معنی و مفہوم ہے، ہمیں اِس معنی میں امت بننا ہے۔

بنا لیتے ہیں لیکن ان کو غیر دینی طریقے سے چلاتے ہیں۔ صرف عنوان دینی ہوتا ہے جبکہ ڈھانچہ، دستور، ہدف اور ہر چیز غیر دینی ہوتی ہے۔

وحدت، اُمت سازی کیلئے ایک بنیادی اصل:

امت سازی کے اصولوں میں سے پہلی اصل و بنیاد اجتماع یا وحدت ہے، قرآن مجید میں خداوند تبارک وتعالیٰ نے متعدد مرتبہ اس کی تاکید فرمائی ہے۔ سورہ مبارکہ آلِ عمران میں امت سازی کا حکم ہے اور حکم سے پہلے رکن امت ذکر کیا گیا ہے۔

"وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا" (العمران۔۱۰۳)

"حبل خدا سے سب مل کر تمسک کرو اور تفرقے میں مت پڑو"

امت سازی کا پہلا رکن محورِ حبل اللہ یا محورِ دین میں اجتماع ہے۔ دین اس طرح کا ہو جو قابلِ تمسک ہو، جس پر عمل کیا جا سکے اور جس کے گرد سب جمع ہو سکیں۔ اس سے مراد وہ دین نہیں ہے جو صرف ذہن میں رکھا جا سکے یا جس کو صرف وردِ زبان بنایا جا سکے بلکہ وہ دین مراد ہے جس کے اوپر عملاً زندگی بسر کی جا سکے، جس کی بنیاد پر لوگ اکٹھے ہو سکیں، جس کے گرد جمع ہو سکیں اور اپنی ساری ضروریات اس دین سے پوری کر سکیں۔

قرآن مجید منبعِ مکتب:

قرآن مجید مکتب یا آئیڈیالوجی کا منبع ہے، ہر نسل کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید سے اپنے لئے آئیڈیالوجی استنباط کریں۔ پس پہلی شرط اجتماع ہے اور اجتماع کے اندر بھی آئیڈیالوجی ضروری ہے، اس کے علاوہ جو بھی اجتماع ہو وہ غیر دینی ہے۔ امت سازی کے لئے غیر نظریاتی اجتماع مطلوب نہیں ہے یعنی ایسا اجتماع ہمیں امت کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ جس طرح آج مسلمان ہزاروں عناوین کے تحت جمع ہیں لیکن وہ سارے غیر دینی عناوین ہیں۔ آج لوگ کہیں علاقے کے محور میں جمع ہیں، کہیں زبان کے گرد جمع ہیں، کہیں قومیت کے گرد جمع ہیں، کہیں نسب کے گرد جمع ہیں، کہیں مفادات کے گرد جمع ہیں، کہیں فرقوں کے گرد جمع ہیں اور کہیں رسومات کے گرد جمع ہیں۔ ایسے اجتماع امت نہیں کہلاتے۔

جہانِ اسلام سے مراد امت نہیں:

ایک اور چیز جو اس وقت امت کی متبادل بن گئی ہے اور اس کے فریب میں سب مبتلا ہو گئے ہیں وہ اصطلاحِ جہانِ اسلام، دنیائے اسلام یا عالمِ اسلام ہے۔ یہ کوئی قرآنی یا دینی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ اصطلاح بھی ہم نے دوسروں سے قرض لی ہے۔ ہمیں جہانِ اسلام نہیں بلکہ امتِ اسلام بننا ہے۔ جہانِ اسلام یعنی مسلمان دنیا میں جہاں جہاں رہتے ہیں یہ سب جہانِ اسلام کا حصہ ہیں اگرچہ وہ اس کے پابند نہ ہوں اور اس کو مانتے بھی نہ ہوں پھر بھی وہ اس جہان اور عالم میں شمار ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ تعبیر آج کل زیادہ رائج ہے اور سب اس پر خوش ہیں۔ یہ عالمِ اسلامی ہے لیکن عالمِ اسلامی میں امتِ اسلام نہیں ہے۔ بغیر اسلام کے عالمِ اسلامی ہے یا یوں کہیں کہ جہانِ اسلام بغیر اسلام کے جہانِ اسلام ہے پس جہان میں اسلام موجود نہیں ہے۔ درحقیقت اسلامی شکل وہ ہے جو دینِ الٰہی بیان کر رہا ہے:

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ"

پس اس وقت اگر آپ دیکھیں تو عالمِ اسلام فقط ایک ذہنی تصور و ذہنی مفہوم ہے۔ ذہن سے ماوراء اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی امتِ اسلامی موجود نہیں ہے، فقط براعظم کی طرح ایک جغرافیہ ہے۔

فرضی اور حقیقی چیزوں میں فرق:

بعض چیزیں فقط ذہنی ہوتی ہیں، ان کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ ذہن کے اندر ہیں، اگر تصور کریں تو ذہن میں آجاتی ہیں اور اگر ذہن سے ان کا تصور ختم کر دیں تو ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسی چیزیں ذہن سے باہر کوئی واقعیت نہیں رکھتیں۔ بہت سارے عناوین جن کے تحت ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ذہنی یا فرضی چیزیں کہلاتی ہیں جو فرض کرنے سے قائم ہو جاتی ہیں اور فرض کرنے سے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ علمی اصطلاح میں انہیں اعتباری چیزیں کہتے ہیں اور یہ محض فرضی مسائل ہیں۔ حقائق وہ ہیں جن کے بارے میں ہم جیسی بھی ذہنیت رکھیں وہ حقائق اپنی جگہ موجود رہتے ہیں، مثلاً رات سے متعلق کوئی شخص اپنے ذہن میں جو بھی فرض کرے حقیقت میں رات، رات ہی رہے گی اور اس تصور سے اسکی صحت

پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔اسی طرح موسمِ گرما ایک حقیقت اور واقعیت ہے۔ موسم گرما فرض کرنے سے شروع نہیں ہوتا کیونکہ یہ ہمارے تصور سے ہٹ کر ایک واقعیت اور حقیقت ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سارا وجود وہستی ہمارے فرض کے ساتھ قائم ہے،فرض کریں تو وہ ہیں،ہم فرض چھوڑ دیں تو وہ نہیں ہیں،مثلاً ہم ایک انجمن بناتے ہیں،کسی شخص کو کہہ دیتے ہیں کہ آپ صدر ہیں۔ ہم نے فرض کرلیا کہ یہ صدر ہے،صدارت محض ایک فرضی چیز ہے اس کا فرض سے باہر کوئی وجود نہیں ہے۔آپ صدر کی جامہ تلاشی لیں کہیں بھی صدارت نہیں ملے گی،پس صدارت وہ چیز ہے جو ہم نے فرض کرلی ہے۔

عالمِ اسلامی ایک فرضی شے:

اعتباری چیزیں وہ ہوتی ہیں جنہیں ہم فرض کرکے اُن کے اندر زندگی بھی بسر کررہے ہیں۔مثلاً ایک شخص اپنے لئے ایک فرضی شخصیت بناتا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، یہ بہت بڑا ہونا فرضی ہے۔ یہ اسی فرضی شخصیت کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے جس کی تصور سے باہر کوئی واقعیت نہیں ہے۔ اگر فرض کو چھوڑ دے تو معمولی انسان ہے۔عالمِ اسلامی ایک فرضی چیز ہے۔ بہت سارے ممالک اور قومیں جو اسلام سے خالی ہیں،وہ سرزمینیں اور وہ مسلمان جن کے اندر اسلام نام کی کوئی چیز نہیں ہے یہ سب مل کر عالم اسلام کو تشکیل دے رہے ہیں مثلاً اس وقت عرب ممالک سب ارکانِ عالمِ اسلام ہیں، یہ سعودی، اردنی، اماراتی، قطرینی، بحرینی اور پاکستانی حکمران سارے عالم اسلام کے سربراہانِ مملکت ہیں یا مثلاً عالمِ اسلام کے رہبر ہیں۔مولانا روم کے بقول کہ

بر خیال است نام شان و ننگِ شان
بر خیال است صلح شان و جنگِ شان

یعنی ان کی ساری بنیاد خیالات پر ہے،خیالات میں ہی یہ ناموری اور عزت حاصل کرتے ہیں اور خیالات میں ہی ان کی بے عزتی ہوجاتی ہے۔ان کی عزت و بے عزتی، نام و ننگ، صلح و جنگ سب کچھ خیالات کے اندر ہے۔ اسلام سے خالی سرزمینیں، نظام، قومیں، لوگ، تعلیمات اور رسومات یہ سب مل کر عالم اسلام تشکیل دے رہے ہیں۔عالمِ اسلام جانشینِ امتِ اسلامی بن گیا ہے اور یہ سب ارکانِ عالمِ اسلام بن گئے ہیں۔پس عالمِ اسلام ایک فرضی چیز ہے۔

امت ایک حقیقت:

امت ایک فرضی چیز نہیں بلکہ ایک حقیقی چیز ہے جس کو تشکیل دینا ہے۔ امت انجمن یا پارٹی کی طرح نہیں ہے۔ یہ باتیں ہمارے لیئے نئی اور ابتدائی ہیں، بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جن کے الفاظ سے ہم ابھی آشنا ہورہے ہیں اور ہمیں اُن کے معانی اور حقیقت تک پہنچنا ہے،انہیں تحلیل کرنا ہے،کھولنا ہے اور ہضم کرنا ہے۔امت سازی قرآن کا واضح وصریح دستور اور اہم ترین فریضہ ہے جس کی طرف ہم پہلی دفعہ متوجہ ہورہے ہیں۔

"وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ"

تم امت بنو

لفظِ امت جب ہمارے ذہن میں آتا ہے ہمارا ذہن فوراً ان مصادیق کی طرف چلا جاتا ہے جن میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں،جن سے ہم مانوس و آشنا ہیں اور بالخصوص طلاب علوم،علماء اور اہلِ علم کو اس نکتے کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔اخباروں میں ہم روز پڑھتے ہیں کہ کچھ لوگ دوسرے لوگوں کو تاوان کے لئے اغواء کرلیتے ہیں،اسی طرح شیطان نے بھی قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ کی عزت کی قسم کھائی ہے کہ میں انسانوں کے ذہنوں کو اغواء کروں گا۔

"لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ" (ص۔۸۲)

میں ان سب کو اغواء کروں گا

ذھنوں کو اغواء کرنا:

اغواء کی اقسام میں سے ایک ذہنی اغواء ہے کہ بعض چیزیں ذہن کو اغواء کر لیتی ہیں،ایک اغواء کنندہ ذہن سے مراد مفروضے ہیں جو ہمارے ذہن میں پہلے سے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں فراواں مفروضے بھرے ہوئے ہیں، کچھ آباؤاجداد سے لیے ہیں اور کچھ کلچر، ماحول، تعلیم اور منبرو سٹیج سے لیے ہیں، یہ مفروضے ذہن کو اغواء کرلیتے ہیں۔دوسرا بڑا اغواء جو ذہن کا ہوتا ہے وہ مصادیق ہیں جن سے ہم مانوس ہیں، جن کے ساتھ ہمارا روزمرہ کا اٹھنا بیٹھنا اور حشر ونشر

> **قرآن کے مطابق امت سے مراد وہ اجتماع یا باہدف لوگ ہیں جو دین کے محور میں ہوں اور دین بھی ایسا جو مکتبی اور دستوری شکل میں ہو۔غیر نظریاتی اجتماع امت سازی کی طرف نہیں لے جاسکتے۔**

ہے، یہ مصادیق بھی اغواء کنندہ ہیں جو ہمارے اذہان کو اغواء کرلیتے ہیں۔مثلاً جب ہمارا ذہن لفظِ امت یا معنی امت کو سمجھنے کے لئے جاتا ہے تو راستے میں مفاہیم ہمیں اغواء کرکے اپنے پاس لے جاتے ہیں کہ ہم ہی وہ امت ہیں اور ہم بھی مان جاتے ہیں کیونکہ ہم امت کونہیں جانتے۔ ہماری حقیقت سے ناآشنائی کی وجہ سے مفاہیم نے ہمیں دھوکہ دیا اور ہمیں اغوا کرلیا ہے۔

فریب خوردہ انسان:

اصل میں انسان ہر چیز سے فریب کھاتا ہے۔ہم میں سے بعض اس گمان میں مبتلا ہیں کہ ہم بہت چالاک ہیں اور خود کو چالاک اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اپنی پلیٹ میں زیادہ بوٹیاں ڈال لیتے ہیں، ذمہ داری سے جان چھڑا لیتے ہیں، یہ ہماری چالاکیاں ہیں۔درحقیقت سب سے زیادہ فریب خوردہ یہی چالاک لوگ ہیں جو کئی چیزوں کے دھوکے میں آئے ہوئے ہیں۔مثلاً ہم کسی کو کچھ رقم دینے جا رہے ہیں اور ہم اُسے نہیں جانتے، راستے میں سو آدمی ہمیں دھوکہ دیتے ہیں، ایک چوک پر ایک ملتا ہے کہتا ہے میں خالد ہوں ہم فوراً اس کے دھوکے میں آ جاتے ہیں اور آدھی رقم اس کو دے دیتے ہیں، پھر اس سے جان چھوٹتی ہے اگلے چوک پر جاتے ہیں وہاں کوئی اور کھڑا ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں خالد ہوں باقی رقم اُسے دیتے ہیں اور سوویں چوک پر ہم دھوکہ کھا کر پھر کہتے ہیں کہ میں تو بہت چالاک ہوں کیونکہ کسی رکشے والے کو دھوکہ دیا ہے۔رکشہ والے سے زیادہ رقم طے کیا تھا مگر چار روپے کم دیے ہیں، رکشے والے کو دھوکہ دے کر سمجھتے ہیں کہ ہم بہت چالاک ہیں جبکہ ہم خود سو دفعہ فریب کھائے ہوئے ہیں۔

مصادیق سے فریب کھانا:

ایک فریب مصادیق کا ہے۔جب ہم حقیقت کو سمجھنے جاتے ہیں تو یہ مصادیق ہمیں دھوکہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم امت ہیں، ہماری جو انجمن ہے یہ امت ہے، اس سے جان چھوٹتی ہے اگلے چوک میں جاتے ہیں وہاں پارٹی سامنے آتی ہے وہ کہتی ہے کہ ہم ہی امت ہیں۔نعرے اور شعار وغیرہ سب بتائیں گے کہ ہم امت ہیں، ہم دھوکے میں آکر اسی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں، اس سے جب جان چھوٹتی ہے تو کسی گروہ یا فرقے میں چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ دھوکے پر دھوکہ اور فریب پر فریب ہوتا ہے اور ہم گم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح سے امتِ مسلمہ اپنا پتہ، اپنی خوبی اور اپنی شناخت کھو بیٹھی ہے۔مثلاً بنو امیہ کے ہاتھوں چڑھی تو انہوں نے کہا کہ ہم امت ہیں، خلافت کا نظام آیا کہا ہم ہی امامت ہیں، ملوکیت کا نظام آیا اُس نے کہا ہم امام ہیں، جب بادشاہت کا نظام آیا تو انھوں نے کہا کہ ہم امامت اور حق ہیں۔دھوکہ کھانے والے وفریب خوردہ ان کے دام میں اسیر ہوکر قدم قدم پر بہک گئے ہیں لہٰذا جب ہم امت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو کوئی مصداق ہمیں اغواء نہ کرے، ہم کسی انجمن کے دامن میں نہ گریں، کسی پارٹی یا حزب کے اسیر نہ ہو جائیں کہ یہ امت ہے اور امت کا یہی نقشہ ہے۔وہ ہمیں دعوت نہ دے کہ میں ہی امت ہوں۔

قرآن امت کی شناخت کا ذریعہ:

ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن سے امت کی شناخت کرلیں، قرآن سے اس کی ساری شناختی علامات ڈھونڈ لیں اور صرف شناختی علامتیں ہی کافی نہیں ہیں بلکہ اس کے ارکان، اس کی ذات، ماہیت، حقیقت اور اس کی ہویت کو قرآن سے دریافت کریں پھر کوئی قوم یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہم امت ہیں۔ابھی کوئی بھی قوم، فرقہ اور گروہ اٹھ کے کہہ دے کہ ہم امت ہیں، ہم اُس کے پیچھے چل پڑتے ہیں جبکہ امت کی درست شناخت قرآن سے کرنی ہے کہ امت کس کو کہتے ہیں؟ امت سے مراد وہ اجتماع یا باہدف لوگ ہیں جو دین کے محور میں ہوں اور دین بھی جو مکتبی شکل میں ہو، مکتبی یعنی جو دین دستوری شکل میں ہو۔جن لوگوں کے پاس ایک دستور ہو اور اس دستور نے انہیں اکٹھا کیا ہوا ہو، اس دستور کے گرد جمع ہوں۔جو لوگ دستورِ دینی کے محور میں جمع ہوں وہ امت ہیں البتہ یہ امت کا پہلا رکن ہے۔

> امت سازی کا پہلا رکن محورِ دین میں اجتماع ہے۔ آج لوگ کہیں علاقے کے محور میں جمع ہیں، کہیں زبان کے گرد جمع ہیں، کہیں قومیت کے گرد جمع ہیں، کہیں نسب کے گرد جمع ہیں، کہیں مفادات کے گرد جمع ہیں، کہیں فرقے کے گرد جمع ہیں اور کہیں رسومات کے گرد جمع ہیں۔ایسے اجتماع امت نہیں کہلاتے۔

اولاً ہمیں اس مکتب یا آئیڈیالوجی کی شناخت ہونی چاہیئے جس کے گرد امت نے جمع ہونا ہے۔ اسکی متعدد صفات ہیں ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ انسان کا مکتب و آئیڈیالوجی کے ساتھ ایمانی تعلق ہونا چاہیئے، فقط علمی و تحقیقی تعلق کافی نہیں ہے۔

آئیڈیالوجی یا مکتب کو پہچاننے کی ضرورت:

اولاً ہمیں اس مکتب یا آئیڈیالوجی کی شناخت ہونی چاہیئے جس کے گرد امت نے جمع ہونا ہے۔ اسکی متعدد صفات ہیں ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ انسان کا مکتب و آئیڈیالوجی کے ساتھ ایمانی تعلق ہونا چاہیئے، فقط علمی و تحقیقی تعلق کافی نہیں ہے۔ یعنی اگر ہم محض ایک محقق، سکالر، عالم یا ایک مجتہد بن کر مکتب کے ساتھ ارتباط رکھیں تو یہ کافی نہیں ہے، مکتب میں ڈگری اور سند لینے یا علمی درجہ پیدا کرنے سے انسان مکتب کے ساتھ مربوط نہیں ہوتا۔ مکتب کے ساتھ مربوط ہونے کے لئے ایمان چاہیئے۔ ایمان کا رکن اصلی تصدیق ہے یعنی مکتب کے ساتھ ایمانی تعلق ہے۔ مکتب خود بھی انسان کے اندر ایمان پیدا کرتا ہے اور ایمان کا ہی تقاضہ کرتا ہے۔ دونوں کا آپس میں ایمانی تعلق ہے۔ یعنی مکتبی انسان سے مکتب یا آئیڈیالوجی ایمان مانگتی ہے، معلومات نہیں مانگتی۔ مثلاً اگر کسی کو مکتب اور آئیڈیالوجی کے بارے میں فراواں معلومات ہوں تو اس کو ہم مکتبی انسان نہیں کہیں گے یہ آئیڈیالوجی کا پیرو نہیں سمجھا جائے گا جب تک اس کا آئیڈیالوجی کے اوپر ایمان نہ ہو۔ آئیڈیالوجی بھی انسان کو فقط علم نہیں دیتی جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ یعنی اسلام و دین ہمیں فقط علم دے رہا ہے اور مدارس میں ایمان کے بغیر دینی علم پھیلایا جا رہا ہے۔ دین ہمیں فراواں معلومات دے رہا ہے، مثلاً تفاسیر پڑھتے ہیں قرآنی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، حدیث پڑھتے ہیں سنت کی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، تاریخ پڑھتے ہیں تاریخ کی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، فقہ پڑھتے ہیں فقہ کی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، آج ہم فقیہ اُس کو کہتے ہیں جس کے پاس فراواں فقہی معلومات ہوں۔ فقط فقہی معلومات انسان کو مکتبی نہیں بناتیں۔

عالم دین اس کو نہیں کہتے کہ جس کے پاس کثیر معلومات ہوں بلکہ مکتبی عالم اس کو کہتے ہیں جس کا آئیڈیالوجی پر ایمان ہو۔ رسول اللہ ﷺ کو خداوند تبارک و تعالیٰ نے جب وحی کے ذریعے سے آئیڈیالوجی یا مکتب اور اسلام دیا تو فرمایا کہ آپ نے اس کو دستوری شکل و دستوری رنگ دے کر معاشرے کے اندر نافذ کرنا ہے اور لوگوں سے عمل کروانا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ رسول وہ ہے جس کے پاس کثیر علم ہے یعنی اعلم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اعلمیت کی تعبیر کہیں بھی نہیں ہے، بلکہ اعلم کی تعبیر ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوئی۔ ابھی ہم کثرت سے کہتے ہیں کہ اعلم کی تقلید کریں، اعلم یعنی زیادہ جاننے والا، جس کے پاس زیادہ معلومات ہوں۔ ممکن ہے ایک غیر مسلم کو اسلام کے بارے میں مسلمانوں سے زیادہ معلومات ہوں۔

مستشرق طبقہ:

ایک طبقہ ہے جس کو مستشرق یعنی ''مشرق شناس لوگ'' کہا جاتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمان نہیں ہیں بلکہ مغربی ممالک کے رہنے والے ہیں لیکن وہ مشرقیات کو آکر پڑھتے ہیں، ان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ڈگریاں لیتے ہیں مثلاً اسی میں انٹر، گریجویشن، ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کرتے ہیں۔ اس وقت بڑے قدآور اسلام شناس مغرب میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہت ساری اسلامی کتب کے بارے میں ان مستشرقین نے تحقیقات کی ہیں، ان کے نسخے ڈھونڈے ہیں اور تصحیح کر کے ان کو چھپوایا ہے۔ انہیں اسلام سے متعلق اکثر مسلمانوں سے زیادہ معلومات ہیں۔ مثلاً اس وقت قرآن کے نسخوں کی معلومات ان کو زیادہ معلوم ہیں۔ انہیں پوری دنیا کے اندر نسخے پتہ ہیں کہ قرآن کے نفیس ترین نسخے کہاں کہاں، کس ملک میں اور کس صدی کے موجود ہیں۔ اگر پاکستان میں قرآن مجید کا کوئی نیا نسخہ نکل آئے مثلاً کسی جگہ کھدائی ہو اور نیچے سے قرآن کا ایک قدیمی نسخہ نکل آئے، تو کون تشخیص دے گا کہ یہ نسخہ کس صدی کا ہے؟ باہر سے انہیں کو بلائیں گے، مغربی دنیا سے بلائیں گے کہ یہ بتائیں کہ یہ قرآن کس صدی کا ہے؟ یہ رسم الخط کون سا ہے؟ ان کو زیادہ معلومات ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ یہ اعلم کہلائیں گے، کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تقلید کی جائے؟ اگر وہ مسلمان اور شیعہ ہوتے تو ان کی تقلید ہو سکتی تھی چونکہ وہ اعلم ہیں لیکن تقلید کے لئے ایک شرط اثناء عشری ہونا بھی ضروری ہے۔

پس دین کے ساتھ علمی تعلق کافی نہیں ہے۔ اگرچہ علمی تعلق دین کو سمجھنے اور فہم دین کے لئے ضروری ہے لیکن دین سے رشتے کے لئے لازم نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کو گھریلو رابطے، ماں باپ کے ساتھ رشتے اور علمی رشتوں کے بارے میں تمام

اگر رسول اللہ ﷺ کے پاس فقط دین کی معلومات ہوتیں اور دین پر ایمان نہیں ہوتا تو رسالت و امامت کا کام انجام نہ پاتا اور آج پوری دنیا میں کہیں بھی مسلمان موجود نہ ہوتے۔ آئیڈیالوجی یا مکتب اپنے متعلقات پر ایمان طلب کرتا ہے اور ساتھ ہی اس میں اضافہ کا باعث بھی بنتا ہے۔

معلومات ہیں لیکن اپنے والد صاحب کے ساتھ بذاتِ خود رشتہ اور والد کے بارے میں معلومات مختلف چیزیں ہیں۔ ممکن ہے اپنے باپ کے بارے میں بیٹے کو کم معلومات ہوں لیکن باپ کا بیٹے کے ساتھ گہرا رشتہ اور تعلق ہو۔ معلومات اکٹھی کر لینے سے انسان عالم دین بن جاتا ہے لیکن پیروئے دین نہیں بنتا، اگر اعلم بھی بن جائے پھر بھی صرف معلومات ہیں ممکن ہے پیروی نہ کر رہا ہو۔ اس وقت بہت بڑی بڑی شخصیات ہیں، دین کے انسائیکلوپیڈیا ہیں، اِن شخصیات کے پاس اتنی معلومات ہیں اگر یہ بغیر وقفے کے سالہا سال بولتے رہیں گے پھر بھی ساری معلومات بیان نہیں کر پائیں گے لیکن ان معلومات میں سے کتنی معلومات پر عمل پیرا ہیں؟ شاید دس فیصد پر بھی عمل پیرا نہ ہوں۔ پس دین انسان سے ایمانی رابطہ مانگتا ہے، یعنی آئیڈیالوجی کے ساتھ ایمانی تعلق ہونا چاہیے اور جواباً آئیڈیالوجی بھی انسان کے اندر جذبۂ ایمانی پیدا کرتی ہے۔ مکتب ایمان افروز ہے، یہ گہرا اور راسخ ایمان قائم کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اعلمُ النّاس ہیں:

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن مجید میں کہیں بھی یہ تعبیر استعمال نہیں ہوئی ہے کہ آپؐ بہت دانا اور اعلم تھے البتہ علمِ رسول اللہ ﷺ میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ

"اعلم الناس"

یعنی بعد از خدا کوئی بھی علمِ رسول ﷺ کے درجے پر نہیں ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے لیکن قرآن نے جو خصوصیت رسول اللہ ﷺ کی ذکر کی ہے یا جس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ دین کے ساتھ تعلق تھا، امت سازی کے لئے علمِ رسول ﷺ کافی نہیں تھا۔ اس وقت مسلمان دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ رسول ﷺ کے پاس علمِ غیب تھا یا نہیں تھا لیکن اصل خصوصیت جسے قرآن ذکر کر رہا ہے وہ اور ہے سورۂ بقرہ کی آیات ۲۸۵ اور ۲۸۶ میں ہے

"اٰمَنَ الرَّسُوْلُ......"

"رسول ﷺ کا ایمان ہے، رسول ایمان لے آئے ہیں" کس پر؟

"......بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ"

خدا نے جو کچھ رسول ﷺ پر نازل کیا ہے اُس پر ایمان لے آئے ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ اس سے رسول ﷺ آگاہ ہیں بلکہ یہ کہا کہ اس پر رسولؐ کا ایمان ہے اور یہ اساس ہے کہ دین کے ساتھ رابطہ، ایمانی رابطہ ہو۔ ایمان کا رکن اصلی تصدیق ہے۔ علمِ منطق میں جو تصدیق پڑھاتے ہیں یہاں وہ مراد نہیں ہے۔ وہ تصدیق ذہنی ہے، یہاں لفظِ تصدیق اپنی گواہی خود دے رہا ہے، اپنا معنی خود کر رہا ہے۔ تصدیق یعنی انسان اس طرح سے کسی چیز کو مان لے کہ اس ماننے میں صداقت روشن اور واضح ہو، پتہ چل رہا ہو کہ اس کے اندر صداقت ہے۔ انسان جو کہہ رہا ہے کہ میں نے اس کو مان لیا ہے اس کے اندر صداقت موجود ہے۔ ہمارا ایمان بہت کم چیزوں پر ہے جبکہ معلومات بہت زیادہ ہیں۔ جس چیز پر ہمارا ایمان ہے اور جو تصدیق کے مرحلے تک پہنچی ہوئی ہے اس کا عملی اثر ہمارے وجود پر ہے، ہم اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہمارا ایمان ہے کہ کسی جگہ پر ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اُس کے ساتھ دوسرا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ پہلا شخص اُس دوسرے کی موجودگی میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو خلوت میں کرتا ہے چونکہ جانتا ہے کہ ساتھ دوسرا آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کی موجودگی پر آپ کا ایمان ہے یعنی آپ اس کی موجودگی کی تصدیق کر رہے ہیں۔ تصدیق کر رہے ہیں سے مراد یہ ہے کہ اسکی موجودگی کے اثرات آپ کے اپنے وجود کے اوپر پڑ رہے ہیں۔ آپ عملاً یہ ثابت کر رہے ہیں کہ دوسرا شخص موجود ہے اس لئے وہ ایسی کوئی حرکت انجام نہیں دے رہا جو اس کی موجودگی میں نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن جب پہلا شخص خلوت میں ہوتا ہے اُسے گمان ہوتا ہے کہ میں خلوت میں ہوں۔ بعض اوقات انسان کسی فکر میں مگن ہوتا ہے پہلو میں کوئی انسان بیٹھا ہوا ہے اسے پتہ نہیں چلتا وہ نازیبا حرکتیں کرتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ یہ کیا کر رہا ہے؟

آئیڈیالوجی ایمان افروز ہے:

آئیڈیالوجی انسان کا ایمان بڑھاتی ہے اور آئیڈیالوجی کے اوپر بھی ایمان

ہے۔یعنی آئیڈیالوجی اپنے متعلقات پر ایمان طلب کرتی ہے اور ایمان عطا بھی کرتی ہے۔یعنی ہدف، ہدف کی رسائی، ہدف کی راہ اور اس راہ پر کامیابی پر بھی ایمان ہو۔ ایمان کے ساتھ آئیڈیالوجی کا راستہ طے ہوتا ہے، معلومات کے ساتھ طے نہیں ہوتا۔ معلوماتی علماء کا طور طریقہ دیکھ لیں کہ وہ صرف ملازمت کے لئے کام کر رہے ہوتے ہیں، مثلاً اگر کوئی مؤذن پیسے کے لئے اذان دیتا ہے اور اذان کے جو کلمات ادا کرتا ہے اُن پر ایمان نہیں رکھتا، تو اس کا اکبراللہ نہیں ہے بلکہ اس کا اکبر وہ حاجی صاحب ہیں جو پیسے دیتے ہیں۔ اذان دینا فقط اس کی نوکری ہے اور یہ اللہ اکبر کہنے کے پیسے لیتا ہے۔ پس اس کے پاس معلومات اور اذان کا علم تو ہے لیکن اذان پر ایمان نہیں ہے۔

ایمان اور علم میں فرق:

قرآن مجید میں سورۂ منافقون میں ہے کہ جب منافق آکر کہتے تھے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ منافقین جھوٹ بولتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنا تو سب سے بڑا سچ ہے لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ پھر یہ جھوٹ کس شعبے میں بول رہے ہیں؟ جھوٹ یہ کہہ رہا ہے کہ میں گواہی اور شہادت دیتا ہوں، یہ گواہی نہیں دے رہا، چونکہ شہادت و گواہی کے لئے دل کا ایمان ضروری ہے جبکہ اس کے دل میں ایمان نہیں ہے، اس لیے یہ گواہی شمار نہیں ہوتی۔ پس اسی لیے مؤذن جب اذان دیتا ہے یا تشہد میں جب پڑھتا ہے ''اشهد ان لا اله الا الله'' تو ادھر سے آواز آتی ہے یہ جھوٹ بول رہا ہے، یہ کب گواہی دے رہا ہے کہ اس کا رب فقط خداوند تعالیٰ ہے دراصل اس نے اپنے ہزار معبود بنائے ہوئے ہیں اور یہ سب سے بڑا جھوٹا ہے۔ یہ ہزار جگہ سجدہ کرتا ہے اور ابھی کہہ رہا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ہے، یہ جھوٹ ہے۔ مثلاً کوئی آدمی یہ کہے کہ عید کی مبارک دینے کے لئے پہلی کال آپ کو کی ہے حالانکہ ہزار کالیں اور بھی کر چکا ہے، یہ جھوٹ بول رہا ہے کہ میں نے پہلی کال آپ کو کی ہے۔ پاکستان کا ایک ملحد عالم ہے، مشہور شخصیت ہے۔ وہ امامِ جمعہ و حافظ قرآن ہے وہ مدرسے میں پڑھاتا ہے اور ریڈیو اور ٹی وی پر لیکچر بھی دیتا ہے اور وہ بڑی اچھی گفتگو کرتا ہے، جب اس کے بارے میں سنا کہ یہ ملحد ہے تو یقین نہیں آیا، ایک دن اُس سے جب ملاقات ہوئی تو وہ خود کہنے لگا کہ آپ نے میرے بارے میں کچھ سنا ہوگا، میں نے کہا سنا تو ہے لیکن یقین نہیں آیا، کہتے ہیں آپ یقین کر لیں میں ایسا ہی ہوں، میں دہریہ ہوں، ملحد ہوں، معاذ اللہ میرا ایمان خدا، انبیاء، قیامت اور کسی بھی چیز پر نہیں ہے حالانکہ امامِ جمعہ ہے، بہترین قاری و حافظ ہے اور ساتھ ہی اس نے کہا کہ میں اکثر بغیر وضو کے نمازیں پڑھاتا ہوں، تراویح بھی پڑھاتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ آپ لوگوں کو دھوکہ کیوں دیتے ہو، آپ لوگوں کو صاف صاف کہہ دو کہ میرا ان چیزوں پر ایمان نہیں ہے، دوسرے لوگوں کا دین کیوں خراب کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ یہ ملازمت ہے۔ میں نے پڑھا ہے، علم حاصل کیا ہے، میری تعلیم ہے، ڈگری لی ہے، دوسرے پڑھے لکھے لوگ دفاتر اور سکولوں میں کام کرتے ہیں، جو کچھ انہوں نے پڑھا ہے وہ جاب کر رہے ہیں، میں بھی اسی طرح جاب ہی کر رہا ہوں اور صحیح جاب کرتا ہوں، کبھی نماز لیٹ نہیں کرتا، کبھی جمعہ لیٹ نہیں کرتا، بالکل ٹھیک پڑھاتا ہوں، قرآن پڑھاتے ہوئے کبھی کوتاہی نہیں کرتا، غفلت نہیں کرتا، صحیح پڑھاتا ہوں، میرے شاگردوں سے جا کر پوچھ سکتے ہیں، یہ میری جاب ہے اور میں امانتداری سے جاب کرتا ہوں لیکن وضو نہیں کرتا۔ میں نے کہا وضو کیوں نہیں کرتے کہا کہ یہ ٹیچر جو پڑھانے جاتے ہیں یہ سارے وضو کر کے جاتے ہیں؟ یہ میری جاب ہے، جاب کے پیسے لیتا ہوں جتنے پیسے لیتا ہوں اتنی ڈیوٹی کرتا ہوں۔ اس کی باتوں نے بہت زیادہ جھنجوڑا کہ اس میں جرأت ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ میں کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا، میرے پاس معلومات ہیں، میں نے دین پڑھا ہے اور جاب کر رہا ہوں لیکن بہت سارے ایسے ہیں جو یہی کام کر رہے ہیں فقط زبان سے نہیں کہتے ورنہ وہ بھی جاب ہی کر رہے ہیں، ان کا کسی چیز پر ایمان نہیں ہے۔

دینِ الٰہی پر رسول اللہ ﷺ کا ایمان:

قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ فرما رہا ہے کہ

''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ'' (بقرہ۔۲۸۵)

''رسول اللہ ﷺ کا ایمان ہے اُس چیز پر جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے'' اگر رسول اللہ ﷺ کے پاس فقط دین کی معلومات ہوتیں اور دین پر ایمان

> جس کے اندر ہدف نہ ہو وہ دین نہیں ہے۔ دین یعنی صراط، حرکت اور ہدف کا نام ہے ورنہ انسان سرگرداں ہو جاتا ہے اور آئیڈیالوجی انسان کو سرگرداں و پریشاں نہیں ہونے دیتی۔

ہدف، راہ اور رہبر تین بڑے شعبے ہیں جن میں انسان کنفیوز یا سرگرداں ہوتے ہیں اور آج کا مسلمان ان تینوں شعبوں میں ہی سرگرداں ہے۔ اصل ہدف آئیڈیالوجی یا مکتب بتاتا ہے لہٰذا ہر چیز سے پہلے اس ملت کی ضرورت مکتبی اسلام ہے۔

نہیں ہوتا تو رسالت وامامت کا کام انجام نہیں پاتا، آج پوری دنیا میں مسلمان موجود نہیں ہوتے۔ پس آئیڈیالوجی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایمان افروز ہے، اپنے پیروکاروں کو خود بھی ایمان عطا کرتی ہے اور ایمان بڑھاتی بھی ہے۔

عہدِ رسول اللہ ﷺ میں صحابہ کرامؓ کے پاس علم کم تھا مگر ایمان زیادہ تھا، یقیناً آج ایک درمیانے طالبعلم کی معلومات حضرت ابوذرؓ سے زیادہ ہیں حضرت ابوذرؓ کے پاس ڈگریاں نہیں تھیں، آپؓ چرواہے تھے، بکریاں چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں راستہ دکھایا اور حضرت ابوذرؓ اس راستے پر ایمان لے آئے، رسول اللہؐ نے ہی راہ ایمان سامنے رکھی اور وہ بھی ایمان لے آئے اور درحقیقت ایمان ہی اپنا اثر دکھاتا ہے فقط علم کافی نہیں ہے۔

آئیڈیالوجی ہدف ساز:

مکتب وآئیڈیالوجی ہدف ساز وہدف پرست ہے، آئیڈیالوجی ہمیشہ ہدف و مقصد کو سامنے رکھتی ہے اور ہدف ومقصد کی طرف انسان کو متوجہ کرتی ہے اور اُس ہدف کی طرف انسان کو راغب کرتی ہے۔ جس کے اندر ہدف نہ ہو وہ دین نہیں ہے۔ دین یعنی پہلے مقصد سامنے رکھو، پھر اُس مقصد کی طرف راستہ تلاش کرو اور پھر اس راستے کو طے کرنے کے لئے حرکت شروع کرو۔ دین یعنی صراط، حرکت اور ہدف کا نام ہے ورنہ انسان سرگرداں ہوجاتا ہے اور آئیڈیالوجی انسان کو سرگرداں و پریشاں نہیں ہونے دیتی۔

ہدف، راہ اور رہبر میں سرگردانی:

ہدف، راہ اور رہبر تین بڑے شعبے ہیں جن میں انسان سرگرداں ہوتے ہیں۔ ان تین شعبوں میں سے کسی ایک کی حیرت انسان کو ہلاک کردیتی ہے جبکہ آج کا مسلمان ان تینوں شعبوں میں ہی سرگرداں ہے۔ مثلاً پاکستانی شیعہ ہیں، ان کے مدِ نظر کونسا ہدف ہے؟ یہ قوم کہاں جانا چاہتی ہے اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب کسی کے لئے واضح نہیں ہے۔ علماء، مفکرین، راہنماؤں، طلبہ تنظیموں، نظریاتی لوگوں، انقلابیوں اور ضدِ انقلابیوں میں سے کوئی ایک فرد آ کر اس سوال کا جواب دے کہ یہ قوم کیا ہدف رکھتی ہے؟ کہاں جانا چاہتی ہے اور کیا کرنا چاہتی ہے؟ سب حیران ہیں کسی کو کچھ بھی پتہ نہیں ہے کہ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ فقط وقت گزار رہے ہیں۔ اس لئے کہ رسومات انسان کو ہدف نہیں دیتیں۔ رسم کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ رسم ادا کرو، رسم کا ہدف خود رسم ہوتی ہے۔ مثلاً عید کے دن پکوڑے اور سویاں پکائی ہیں، سویاں اور پکوڑے کھانا عید کا ہدف ہے پس کھا کے ہدف پورا کردیا۔ ہمیں اصل ہدف کون بتائے گا؟ ہدف آئیڈیالوجی اور مکتب بتاتا ہے۔

پاکستانی عوام کی سرگردانی کی وجوہات:

پاکستانیوں میں سو فیصد حیرانی وسرگردانی ہے۔ یہ بدگمانی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور ان کا حق بھی بنتا ہے کہ سرگرداں ہوں۔ کیوں حق بنتا ہے؟ اس لیے کہ جس قوم و ملت کے پاس آئیڈیالوجی نہ ہو، اس کا سارا ہدف اپنا دن گزارنا ہوتا ہے، کسی طرح بھی زندگی کو طے کر کے موت تک پہنچنا ہے۔ کسی بھی سرگرداں طبقے کا یہی ہدف اور مقصد ہوتا ہے۔ پہلے آئیڈیالوجی انسان کو ہدف دیتی ہے اور حیرانی کو برطرف کرتی ہے پھر انسان کو راستہ بتاتی ہے کہ اس مقصد تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ ہمارے پاس دوسری مشکل راستے کے بارے میں ہے کہ ہم کس راہ پر چلیں؟ اس کے بعد پھر رہبر کے بارے میں مخمصے میں ہیں، رہبر کی تعریف بھی نہیں جانتے۔ ایسی ملت کو اس سارے بحران سے نکالنے کے لئے فقط آئیڈیالوجی یا مکتب کی ضرورت ہے۔ اس ملت کو ان بحرانوں سے نکالنے کے لئے مکتبِ دینی کی ضرورت ہے کیونکہ مکتبِ کشکولی ورسوماتی ہمیں اِن بحرانوں سے نہیں نکال سکتے۔ ہر چیز سے پہلے اس ملت کی ضرورت مکتبی اسلام ہے۔

ابنِ سینا ایک عظیم فیلسوف کا نظریہ:

ابن سینا جس کو بوعلی سینا کہتے ہیں ایک فلسفی تھے، جن کی کتابیں کئی سو سال سے موجودہ صدی کے اوائل تک یورپ کے دانش کدوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی ہیں، ہمارے علماء کا فتویٰ یہ تھا کہ ان کی کتابیں پڑھنا حرام ہے چونکہ ابن سینا کی کتابوں میں فلسفہ ہے اور ان کے نزدیک فلسفہ نجس، حرام اور پلید

تھا جبکہ یورپ نے اس کو اپنے نصاب میں شامل کیا ہوا تھا۔ یورپ کے میڈیکل کالج میں اُن کے قانون کی کتاب آج سے تقریباً پچاس سال پہلے تک پڑھائی جاتی رہی ہے، انھیں شیخ رئیس بھی کہتے ہیں۔ فیلسوف، ریاضی دان، طبیب اور بہترین سیاستدان تھے، ساسانی حکومت میں وزیر اعظم رہے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی جس نے ہندوستان پر حملہ کیا اور ہمارا ہیرو بن گیا ہے، اس نے ابن سینا کو قید کرنے کے لئے خصوصی کمانڈو فورس بنائی تھی جو انہیں قید کر کے سلطان محمود کے پاس لے آئے۔ ابن سینا کی بیشتر عمر حالتِ فرار میں گزر گئی کہ کہیں سلطان محمود غزنوی کے ہاتھ نہ لگ جاؤں، آخر میں اس کے شر سے بچنے کے لئے مخفیانہ طور پر ثمرقند سے ہمدان آئے اور ایک شاگرد کے ساتھ مخفیانہ زندگی بسر کی، وہیں فوت ہو گئے اور وہیں پر ان کا مزار ہے۔ سلطان محمود غزنوی جیسا شخص کہتا تھا کہ اگر ابن سینا میرے ساتھ دے تو میں پوری دنیا پر قبضہ کرلوں گا۔

ابن سینا کی ایک کتاب ''نجات'' ہے اور دوسری ''اشارات'' ہے اور انھوں نے دونوں میں یہ مطلب ذکر کیا ہے کہ نبی اور دین کا ہونا انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے، چونکہ وہ طبیب تھے اس لئے کہتے تھے کہ انسان کے آنکھوں کے اوپر جو اَبرو بنے ہوئے ہیں یہ انسان کی ضرورت ہیں اور پاؤں کا تلوا بنایا ہے یہ بھی انسان کی ضرورت ہے، حتیٰ ہر وہ چیز جو خداوند تعالیٰ نے انسان کے جسم میں بنائی ہے وہ سب ضروریاتِ بشر ہیں، پھر کہتے تھے کہ انسان کے لئے ان سے کہیں زیادہ رہبر اور آئیڈیالوجی کا ہونا ضروری ہے، ان چیزوں کے بغیر بھی انسان رہ سکتا ہے لیکن آئیڈیالوجی اور الٰہی رہبر کے بغیر انسان نہیں رہ سکتا۔ ابن سینا جمہوری رہبر کی بات نہیں کرتے تھے کہ قوم خود کوئی رہبر انتخاب کرلے۔ چونکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ خدا جس نے اَبرو، تلوے اور ہتھیلیاں بنائی ہیں اس خدا کے لئے لازم ہے کہ وہ انسان کے لئے پہلے رہبر اور آئیڈیالوجی دے۔ اُن کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ چھوٹی ضروریات جو خداوند تعالیٰ بناتا ہے تو بڑی ضرورت پہلے بناتا ہے۔

پاکستان میں رہبر کا تصور:

پاکستان میں ابھی رہبر کا تصور بھی نہیں ہے۔ ہم نے جنت کے لئے خیالی راستہ بنایا ہوا ہے کہ مسجد سے سیدھا جنت پہنچ جائیں گے جس کے راستے میں ولایتِ فقیہ، حکومتِ اسلامی، نظامِ اسلامی اور معیشتِ اسلامی کا کوئی شہر آتا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ذہنوں میں یہی ہے کہ ہم مسجد سے سیدھا جنت پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ہم نے خود اپنے خیالوں میں ہی بنایا ہوا ہے لیکن یہ حقیقی نہیں ہے۔ ہر دین ولایتِ فقیہ پر ختم نہیں ہوتا کیونکہ ہر دین کے لئے رہبری ضروری نہیں ہے، رہبر وہاں چاہیئے جہاں معاشرت ہو، جہاں شہروں سے گزرنا ہو، جہاں دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا ہو، جہاں پر امت ہو وہاں رہبر چاہیئے، جس دین کے اندر امت کا تصور نہیں ہے اس دین کے اندر امام کا بھی کوئی تصور نہیں ہے وہ بغیر امام کے جنت جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر بغیر امت کے جاسکتے ہیں تو بغیر امام کے بھی جا سکتے ہیں۔ رہبریت کا تصور مکتبی دین کے اندر موجود ہے، رسوماتی دین کے اندر رہبریت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ رسومات انجام دینے کے لئے رہبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آئیڈیالوجی بتاتی ہے کہ آپ کو رہبر کی ضرورت ہے۔ پس مکتب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مکتب کے پیروکاروں میں حیرت و سرگردانی نہیں ہوگی کیونکہ مکتب انسان کو ہدف عطا کرتا ہے، ہدف کے لئے راستہ معین کرتا ہے، اس راستے کے اوپر حرکت کرواتا ہے اور پھر اس راہ کو طے کرنے کے لئے رہبر شناخت کرواتا ہے۔ رہبر کے ہاتھ میں انسان کی لگام دے دیتا ہے۔ رہبر انسان کو بے لگام و بے مہار نہیں چھوڑتا اور مکتب انسان کی لگام رہبر کے ہاتھ میں دیتا ہے۔

امام خمینیؒ ایک مثالی رہبر:

مکتب کو مجتہد مومن کی ضرورت ہے یعنی جس کا اس راہ پر ایمان ہو۔ امام خمینیؒ کا مکتبِ اسلام پر ایمان تھا۔ شہید مطہریؒ جب انقلاب سے چند ماہ پہلے پیرس گئے، اُس وقت انقلابی تحریک اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی، انقلاب کی کامیابی کے آثار واضح نظر آرہے تھے، شہید مطہریؒ انقلابی کونسل کے سربراہ تھے لیکن کسی کو بھی پتہ نہیں تھا حتیٰ کونسل کے ارکان کو بھی معلوم نہیں تھا کہ انقلابی کونسل کا سربراہ کون ہے؟ بہت سارے ایسے لوگ تھے جو انقلاب کے اندر ہراول دستہ تھے لیکن انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ امامؒ نے اس طرح سے انقلابی طریقہ کار اپنایا ہوا تھا کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس کے ذریعے سے یہ کام ہو رہا ہے، جبکہ یہ فریضہ شہید مطہریؒ

مکتب انسان کو ہدف عطا کرتا ہے، ہدف کے لئے راستہ معین کرتا ہے، اس راستے کے اوپر حرکت کرواتا ہے اور پھر اس راہ کو طے کرنے کے لئے رہبر شناخت کرواتا ہے۔ مکتب انسان کی لگام رہبر کے ہاتھ میں دیتا ہے۔

کے ذمے تھا۔ شہید مطہریؒ آخری ایام میں پیرس میں امامؒ کی خدمت میں تھے، جب آپ وہاں سے واپس آئے تو انقلابی کونسل کے رکن ساتھیوں سے شہید مطہریؒ نے تین جملے بیان کیے، کہا کہ میں جس شخص سے مل کر آیا ہوں اس کے اندر اپنے رب، راہ اور ہدف پر ایمان دیکھا ہے، ایمان کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھا۔

"آمن بربه"

میں نے ایمان سے بھرا ہوا رہبر دیکھا ہے، اس کو میں نے سراپا ایمان دیکھا ہے اور وہ اتنا قاطع ہیں کہ جس کے اندر ذرہ برابر تردید نہیں ہے، کسی بھی شعبے میں تذبذب و شک نہیں ہے۔

"آمن بهدفه"

اس کو اپنے ہدف پر ایمان ہے، پس علم انسان کو اتنا قاطع نہیں بناتا ہے بلکہ ایمان بناتا ہے۔ ہم امام خمینیؒ کی اعلمیت زیادہ چھیڑتے ہیں کہ امام خمینیؒ بہت بڑے علم تھے لہٰذا انقلاب لے آئے، ایسا نہیں ہے اعلم نہیں انقلاب لا سکتا بلکہ مومن انقلاب لاتا ہے، جس کا اپنے رب، دین اور اللہ کے وعدوں پر ایمان ہو۔ امام خمینیؒ کا خدا کے وعدوں پر سو فیصد پختہ ایمان تھا کہ اللہ کے سارے وعدے سچے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کسی علاقے میں کافی عرصے تک بارشیں نہیں ہوئیں، وہاں کے لوگوں نے علاقے کے مولانا سے کہا کہ آپ بارش کیلئے نمازِ استسقاء پڑھیں، انہوں نے کہا ٹھیک ہے کل صحرا میں آؤ نماز پڑھتے ہیں، اگلے دن جب نماز کا وقت آیا سارے لوگ آ گئے۔ مولانا صاحب نے کہا کہ جس چیز پر تمہارا ایمان نہیں ہے وہ عمل کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو سو فیصد یقین ہے۔ مولانا نے کہا مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس چیز پر ایمان نہیں ہے چونکہ اگر تمہارا اس بات پر ایمان ہوتا تو تم چھتریاں ساتھ لے کر آتے۔ امام خمینیؒ کو سو فیصد یقین تھا کہ یہی نجات کا راستہ ہے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

امت سازی کیلئے امامِ برحق کی ضرورت:

امت سازی کے لئے دین شناس مجتہد کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ مجتہد جو اسلام سے آئیڈیالوجی اور مکتب دریافت کر سکے چونکہ آئیڈیالوجی عوام الناس نہیں بنا سکتے، مکتب کا مرحلہ یا آئیڈیالوجی کا مرحلہ عوام الناس پر نہیں چھوڑا جا سکتا، اس کے لئے دین شناس کی ضرورت ہے لیکن اس کے اندر چند خصوصیات ہوں۔ دین کی صحیح شناخت رکھتا ہو اور ان تمام علوم کا حامل ہو جو شناختِ دین کے لئے ضروری ہیں، جس نے دین کی شناخت کے لئے عمر صرف کی ہو۔ ایسا انسان مکتب دریافت نہیں کر سکتا جس نے صرف روایات و آیات حفظ کی ہوں بلکہ دین کا ذائقہ اور مزاج بھی اس کو معلوم ہو، وہ اتنا دین کے اندر راسخ ہو کہ دین کا مزاج اس کو سمجھ میں آ جائے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ دین کے منابع سے تعلیماتِ دین استخراج کر سکتا ہو اور ان تعلیمات کو دستوری شکل دے کر آئیڈیالوجی اور مکتب کا رنگ دے سکتا ہو، مکتبی تدوین کا ماہر ہو۔ آج امت سازی کے لئے ایسے مجتہد کی ضرورت ہے۔ جس کے پاس ڈگری ہو وہ کافی ہے، جو تنخواہ لے کر نماز پڑھاتا ہو وہ کافی ہے۔ امت کی ضمام سنبھالنے والا امام اور ہوتا ہے، جس طرح اقبالؒ نے کہا کہ تیرے زمانے کا امامِ برحق کوئی اور ہے، پیسے لے کر دو رکعت نماز پڑھانے والا تیرے زمانے کا امامِ برحق نہیں ہے، تیرے زمانے کا امام وہ ہے جس کے اندر یہ یہ خصوصیات موجود ہوں۔ بقول مولانا رومؒ کے کہ

دی شیخ با چراغ همیں گشت گردِ شہر
از دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مولانا فرماتے ہیں کہ ایک دانا آدمی چراغ لے کر دوپہر کے وقت گلیوں میں گھوم رہا تھا، میں نے پوچھا کہ اے دانا! یہ کیا ماجرا اور کیا حکمت ہے کہ تو دن کے وقت چراغ لے کے گھوم رہا ہے، کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ اُس نے کہا کہ انسان ڈھونڈ رہا ہوں، میں نے کہا کہ ہم نے بہت ڈھونڈا ہے نہیں ملتا ہے، اُس بزرگ نے کہا کہ وہ جو نہیں ملتا ہے اُسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

امت سازی کیلئے دین کے مزاج شناس مجتہد کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ مجتہد جو اسلام سے آئیڈیالوجی اور مکتب دریافت کر سکے، جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ دین کے منابع سے تعلیماتِ دین استخراج کر سکتا ہو اور ان تعلیمات کو دستوری شکل دے کر آئیڈیالوجی اور مکتب کا رنگ دے سکے۔

> ہر قسم کے نظریے سے انقلاب برپا نہیں ہوجاتا بلکہ انقلاب مکتب کے اندر آتا ہے۔ اسکے لئے تعلیماتِ دین کو دستوری شکل میں مدون کرنا ضروری ہے۔ ایسے مجتہد جو مکتب پیش کرتے ہوں بہت کم گزرے ہیں، جن میں سرِ فہرست شہید مطہریؒ ہیں۔

امت بننے کے لئے علماء کی ضرورت:

آج ہمیں کن علماء کی ضرورت ہے؟ کس قبیلے، طائفے اور کس طرز کے علماء کی ضرورت ہے؟ وہ عالم ہم نے ہی بننا ہے، ظاہر ہے کہ یہ کوہ قاف میں بیٹھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہمیں اِس طرح کے عالم بننا ہے۔ پہلے یہ سمجھ لو کہ کس طرح کے علماء کی ضرورت ہے؟ اقبالؒ کے بقول کہ

یہ دور اپنے ابراہیمؑ کی تلاش میں ہے

سید جمال الدین افغانی دین شناس علماء میں سے تھے، مزاجِ دین کو سمجھتے تھے اور مزاجِ دین کے ساتھ ساتھ دین کو دستوری، مکتبی اور آئیڈیالوجی کی شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ جمال الدین افغانی کی فکر کا ایک نتیجہ علامہ اقبالؒ ہیں یعنی سید جمال نے ہر سرزمین پر جا کر بیج بویا، کہیں اُگا کہیں نہیں اُگا۔ مصر، ہند اور ایران میں اُگا لیکن ترکیہ میں افغانی کے بیج کو زمین کھا گئی، آپؒ نے سب سے زیادہ محنت ترکیہ میں کی تھی اور شہادت بھی ترکیہ میں ہی ہوئی۔ از جملہ جہاں پر سید جمال کا بویا ہوا بیج اُگا وہ سرزمین برصغیر تھی کہ جس میں ایک ہی دانہ اقبالؒ کی صورت میں نکلا لیکن وہ ایک پوری امت تھا

"کان امۃ فی رجل"

اقبال بلا مبالغہ تنہا ایک امت تھے۔

مصر میں بھی سید جمال الدین افغانی کا بویا ہوا بیج اُگا مگر ابھی تک ثمر نہیں دیا، وہ درخت محمد عبدہ، سید قطب اور اس کے بعد وہ بزرگان ہیں جو ایک ایک کر کے پیدا ہوتے گئے۔ اسی طرح ایران میں بہت ساری شخصیات پیدا ہوئیں، اس بزرگوار نے اُس دور میں پہلی دفعہ متوجہ کیا کہ آپ کو مکتبی اسلام استنباط کرنے والے مجتہد ور ہبر کی ضرورت ہے۔

قرآنِ معدنِ علوم:

قرآن منبع و معدن ہے، قرآن کی تدوین مکتبی نہیں ہے، اس کے اندر جو تعلیمات ہیں وہ معدنی حالت میں ہیں مثلاً ہم پٹرول پمپ سے اپنی گاڑی میں پٹرول ڈالتے ہیں، یہ پٹرول کچھ مراحل سے گزرا ہے اور اس قابل ہوا ہے کہ اس کو گاڑی میں ڈالیں، اب یہ گاڑی کو حرکت دیتا ہے، یہ پٹرول زمین کے اندر معدنی شکل میں تھا، انسان نے اسے اپنی ضرورتوں کے مطابق نکال کر بنایا ہے، اس کے لئے انجینئر چاہئے، اگر وہی تیل جو مٹی کے اندر ہے اس کو نکال کر گاڑی کے اندر ڈالا جائے تو گاڑی نہیں چلے گی۔ پس قرآن بھی معدن ہے اور اس معدن سے تعلیم و ہدایت کو نکالنے کے لئے دینی انجینئر کی ضرورت ہے یعنی جو اس سے مکتب و آئیڈیالوجی کی شکل دے سکے ایسے عالم کی ضرورت ہے۔ ایسے مجتہد جو مکتب پیش کرتے ہوں بہت کم گزرے ہیں جن میں سرِ فہرست شہید مطہریؒ ہیں۔ شہید مطہریؒ ایک ناشناختہ حقیقت ہیں۔ جو کارنامہ شہید مطہریؒ نے انجام دیا وہ بہت ہی عظیم ہے۔ امام خمینیؒ کسی کی شہادت پر اتنا نہیں روئے جتنا شہید مطہریؒ کی شہادت پر روئے تھے، امامؒ نے بہت شدید گریہ کیا اور فرمایا کہ یہ میرا پارہِ تن تھا۔ آپؒ انقلاب کے سسٹم انجینئر تھے، مکتب بنانے والی شخصیت تھے، جن کی تعلیمات سے انقلاب پھوٹا۔ اس کے بعد شہید صدرؒ تھے البتہ ان کو توفیق کم ہوئی، ان کے بعد شہید باقر الصدرؒ تھے وہ ایک اور نمایاں شخصیت تھے، ان سے پہلے بھی خلا تھا اور ان کے بعد بھی خلا ہے۔ ہر قسم کے نظریے سے انقلاب برپا نہیں ہوجاتا بلکہ انقلاب مکتب کے اندر آتا ہے۔ پہلے مکتبی تشکیل و تدوین ضروری ہے، تعلیماتِ دین کو دستوری شکل میں مدون کرنا ضروری ہے۔ ابھی یہ جو کشکولی تعلیمات ہم لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں، یہ ہزار سال سے ہو رہی ہیں اگر ہزار سال اور بھی ایسے ہوتی رہیں پھر بھی یہی حال رہے گا جو ابھی ہے۔

قرآن اور رسول اللہ ﷺ کا ساتھ مبعوث ہونا:

خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید نازل کیا اور ساتھ ہی رسول اللہؐ کو بھی مبعوث فرمایا۔ کس لیے؟ رسول اللہ ﷺ فقط قاریِ قرآن کے طور پر مبعوث نہیں ہوئے تھے جس طرح آج ہمیں قرآن پڑھنا نہیں آتا پس ہم قاری صاحب کو رکھتے ہیں تاکہ ہمیں قرأت سکھائیں، اکثر ہمارا ذہن یہی ہوتا ہے کہ عربوں کو قرآن پڑھنا نہیں آتا تھا لہٰذا خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو بھیجا کہ انہیں صحیح قرآن پڑھنا سکھا

> اگر قرآن بنے بنائے دستور کی شکل میں اتارا جاتا تو یہ محض کسی ایک زمانے کیلئے کارآمد ہوتا لیکن قرآن چونکہ ہر نسل کیلئے ہے لہٰذا اسکی تدوین ایک معدن کی شکل میں ہوئی ہے۔ لہٰذا ہر زمانے کے لئے اس کو مبین و مفسر کی ضرورت ہے جو اس کو عملی و دستوری شکل میں لاکر قابلِ نفاذ بنائے۔

دیں تا کہ ان کا قرأت، تجوید اور تلفظ ٹھیک ہو جائے۔ آپؐ کے بارے میں جو وظیفہ قرآن نے بیان کیا ہے وہ تبیین ہے۔

"لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ"

ہم نے آپؐ پر وحی نازل کی ہے تا کہ آپ تبیین کریں۔ تبیین کا مصداق یہ ہے کہ آپ قرآنی تعلیمات کو مکتب بنا کر اور عملی و دستوری بنا کر ان لوگوں کے سامنے پیش کریں لہٰذا آپؐ کا کام فقط جیسے وحی اترتی ہے ویسے ہی پڑھ کر سنا دینا اور پھر "وما علینا الا البلاغ" کہنا نہیں تھا۔ اگر آپؐ قوم کو اسی طرح سنا دیتے تو وہ قوم بھی ویسی ہی ہوتی جیسے آج ہم ہیں۔ آپؐ نے اس کو تبیین کیا، تبیین یعنی تفسیر و تدوین کیا، یعنی اس معدن سے آپؐ نے مکتب بنایا چونکہ یہ منبع تمام امتوں کے لئے ہے۔ اب ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچیں کہ اگر مکتب اور آئیڈیالوجی کی شکل میں دین چاہیئے تھا تو قرآن کو اسی طرح دستوری حالت میں کیوں نہیں اترا؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ توقع رکھے کہ جس طرح پٹرول پمپ میں پٹرول ہے اسی طرح زمین میں بھی ہوتا، اگر اس طرح سے زمین کے نیچے ہوتا تو صرف آپ کا کام آتا، اگلی اور پچھلی نسلوں کا کام نہ آتا، زمین میں معدن اس لیے رکھی جاتی ہے کہ ہر نسل اپنی ضرورت اور اپنی استعداد کے مطابق اس کو کام میں لائے۔ قرآن معدنی حالت میں اس لئے ہے کہ قرآن تمام نسلوں کے لئے ہے، اس کو ایسے ہی ہونا چاہیئے جس حالت میں تدوین ہوا ہے۔ البتہ ہر امت اور ہر زمانے کے لئے اس کو مبین و مفسر کی ضرورت ہے، مبین و مفسر کا کام مکھی پر مکھی مارنا نہیں ہے، جس طرح ابھی ہم تفاسیر سے آشنا ہیں آج کے تفاسیر میں صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ آیت کہاں اور کتنی بار اتری وغیرہ، اس کو تفسیر نہیں کہتے بلکہ یہ وہی ضمیریں لوٹانے والا مشغلہ ہے، یہ ضمیریں لوٹا لوٹا کے ساری عمر گزار کے چلے جاتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ خدا اس کو میری آخرت کا توشہ قرار دے۔ قرآن کو ایسے مفسر و مبین کی ضرورت ہے جو اپنے زمانے کے مطابق قرآن سے مکتب نکالے، باایں کہ قرآن خود تبیان و روشن ہے لیکن اس واضح منبع کو مبین چاہیئے، مبین تبیین کے لئے یعنی جو اس کو مکتب و آئیڈیالوجی بنائے، جو اس کو عملی و دستوری شکل لاکر قابلِ نفاذ بنائے پس رسول اللہ ﷺ نے یہی کام کیا اور اسی لیے ہر زمانے میں قرآن کے ساتھ ہادی اور مفسر کی ضرورت ہے تا کہ اس سے ہمیشہ ایک مکتب استخراج ہو سکے۔

مکتب کی دو صفات:

مکتب ہمیشہ تازہ ہوتا ہے کہنہ نہیں ہوتا، یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں اسلام پرانا ہو گیا ہے، ان کو کیوں پرانا نظر آتا ہے؟ چونکہ ہم نے اس کو مکتبی شکل میں پیش نہیں کیا، غیر مکتبی شکل میں پیش کیا ہے لہٰذا ان کو قدیمی نظر آتا ہے، چودہ سو سال پہلے کا نظر آتا ہے، اگر اس کی مکتبی و آئیڈیالوجیکل تفسیر و تدوین ہوتی انھیں ہمیشہ تازہ نظر آتا۔ قرآن جو انسان کی ہدایت کا منبع ہے اس سے مکتب و آئیڈیالوجی اس طرح سے روشن ہونی چاہیئے جس طرح روزانہ سورج طلوع ہوتا ہے، امام باقرؑ کی یہ حدیث ہے کہ

"القرآن یجری مجری الشمس و القمر"

قرآن سورج اور چاند کی طرح ہے جس کا ہر نسل کے لئے نیا طلوع ہے۔ یوں نہیں ہے کہ ہر نسل کے لئے نیا ایڈیشن چھپے یا ہر نسل میں نئے قاری و حافظ پیدا ہوں یعنی قرآن مجید ہر نسل کو اس کی ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، قرآنی افق کو روشن کرنے کے لئے اسلام شناس و دین شناس کی موجودگی درکار ہے جس کے دل پر طلوع انجام پائے مثلاً امام خمینیؒ کے دل و دماغ پر قرآن کا طلوعِ نو ہوا ہے، یہ طلوعِ جدیدِ قرآن ہے اور باقی لکیر کے فقیر ہیں، وہ پرانے طلوع کے قصے پڑھ رہے ہیں، یعنی وہ رات کو بیٹھ کر دن کے قصے پڑھ رہے ہیں مثلاً زمین کے شمالی اور جنوبی دو قطب ہیں ان میں چھ چھ مہینے دن اور چھ چھ مہینے رات ہوتی ہے وہاں سے خطِ استواء کی طرف آئیں تو یہ عرصہ کم ہوتا جاتا ہے اور ایک پوائنٹ ایسا ہے کہ جہاں پر چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے، جب چھ مہینے رات ہوتی ہے اور سورج نہیں نکلتا ہے تو وہ بچے جو اُن چھ مہینوں میں پیدا ہوئے تھے جن میں رات ہوتی ہے انھوں نے سورج نہیں دیکھا ہوتا ہے، ان کو ماں باپ سناتے ہیں کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو سورج نکلا تھا اور بچے اسی آرزو میں ہوتے ہیں کہ ایک دن ہماری زندگی میں بھی سورج نکل آئے۔ ہم بھی ان بچوں کی طرح ہیں کہ

بقیہ: صفحہ نمبر ۲۹ پر ملاحظہ کریں............

رونے کا مقام کاروانِ حسینؑ ہے، تم کاروانِ حسینؑ میں نظر آؤ، خاذل نہ بنو اور اس کاروان کا حصہ بنو۔ کاروانِ حسینؑ کا حصہ بننے کا طریقہ کیا ہے؟ حصہ بننے کا طریقہ یہ ہے کہ تمہاری بھی کوئی لاش پائمال ہونی چاہئے تھی، تمہارا ابھی کوئی سرنوکِ سناں پر ہونا چاہیے تھا، تمہارے بھی قیدی اس کاروان میں رسیوں بندھے ہونے چاہئے تھے، جب اس کاروان میں تمہارا کوئی بھی نظر نہیں آرہا ہے تم خاذلینِ حق ہو اس رونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر رونا ہے تو تمہیں یہاں آنا پڑے گا۔

بقیہ: امت سازی از نظر قرآن

قرآن ہمارے پاس موجود ہے اس کے باوجود تاریکی وظلمت میں ہیں اور ہم قصے پڑھ رہے ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن نے طلوع کیا تھا۔

طلوعِ قرآن کی ضرورت:

آج قرآن کو طلوع کی ضرورت ہے۔ یعنی مفسر اور دین شناس لوگ قرآن مجید سے مکتب وآئیڈیالوجی کو نکال کر پیش کریں۔ جب ہر نسل کے لئے قرآن طلوع کرے گا تب قرآن کبھی بھی کہنہ، قدیمی اور پرانا نہیں ہوگا اور قرآن کا یہی معجزہ ہے۔ لوگ کبھی بھی یہ احساس نہیں کر سکتے کہ قرآن کی تاریخ گزر چکی ہے، قرآن قدیمی ہو چکا ہے اور زمانہ ایڈوانس ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔ جب ہم قرآن سے مکتب نکالے بغیر لوگوں کو آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں تب یہ احساس ہوگا کہ قرآن پرانا ہو چکا ہے۔ بعض لوگ ہیں جن کو آیات پڑھ کر سنائیں اور ان سے کہیں کہ قرآن میں بہت کچھ ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا، صرف تقدس یا عذابِ خدا کے خوف سے کچھ نہیں کہتے۔ پس قرآن مجید کو مکتبی شکل میں پیش کر کے دیکھیں کہ کس طرح سے سمجھتے ہیں اور کس طرح جھومتے اور سر دھنتے ہیں۔ جب قرآن لوگوں کے دلوں، زمانوں اور نسلوں پر طلوع کریگا تب لوگوں کو قرآن بالکل جدید لگے گا۔ طلوعِ قرآن یعنی آئیڈیالوجی ومکتب قرآن سے دریافت ہو۔

مکتب و دین مجموعۂ نظام:

مکتب ودین فقط نصیحتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ نظاموں کا مجموعہ ہے۔ مکتب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر احکام وقوانین سے پہلے نظام ہو، یعنی مکتب کی تدوین ہی نظام سے شروع ہوتی ہے، نظام کے بعد پھر قوانین کی باری آتی ہے لیکن جب دین غیر مکتبی ہو وہاں نصیحتوں سے ہی شروع کرتے ہیں پہلے دن ہی آخری بات کرتے ہیں لیکن مکتبی دین میں پہلا کام پہلے دن ہی کرنا ہے۔ یعنی مکتب وآئیڈیالوجی کے اندر سب سے پہلا مرحلہ شعبہ ہائے زندگی سے متعلق نظام بنانا ہے۔ اس وقت جو دین ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے اِس میں ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں فقط نصیحتیں ہیں، آج نظامِ تربیتی ونظام اسلامی یہ پیش کیا جاتا ہے کہ بیٹے کا اچھا نام رکھو، اس کا پیمپر (Pampe) وقت پر تبدیل کرو۔ کیا یہ اسلام کا تربیتی نظام ہے؟ ابھی جو ہمارے پاس اسلام شناس ماہرینِ اقتصاد ہیں وہ کہتے ہیں کہ مال پاک ہونا چاہیئے، غصبی اور حرام نہیں ہونا چاہئے، یہ تو مالی نصیحتیں ہیں۔ اسی طرح ہمارا نظامِ تعلیم یہ ہے کہ محنت کرنی چاہئے، شاگرد کو استاد کا احترام کرنا چاہئے، نقل نہیں کرنی چاہئے، یہ سب صرف نصیحتیں ہیں کوئی نظام نہیں ہے۔ پاکستان میں کسی بھی شعبے میں دیکھا جائے تو نصیحتوں کو نظام کی جگہ دی ہوئی ہے یعنی مکتب کا خلا نصیحتوں سے پُر کیا ہوا ہے اور لوگ نصیحتیں سن کر بھی سارے غلط کام انجام دیتے ہیں، نصیحتیں سن کر حرام کھاتے ہیں، گھریلو نظام فاسد ہیں، معاشرے میں بے حیائی ہے، فساد وفحشاء ہے، گمراہی وتباہی ہے۔ پس نصیحتیں نظام کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ مثلاً ہسپتال کو ختم کر دیا جائے، سرجری روم اور تھیٹر ختم کر دیے جائیں، سرجنوں کو نکال کر وہاں پر فقط طبی نصیحتیں لکھ دیں کہ کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہئے، کھانا ہاتھ دھو کر کھانا چاہئے، کھانے پر پھونک نہیں مارنی چاہئے، بسم اللہ پڑھ کے کھانا چاہئے، پس نصیحتوں سے سے کچھ نہیں ہوتا اس کے لئے پورا نظام چاہئے، اس نظام کے اپنے ارکان ہوں، وہاں پر میڈیکل آفیسر ہو، تھیٹر ہو، اپنی اپنی جگہ ساری چیزیں موجود ہونی چاہئیں پھر جا کر ایک سسٹم چلتا ہے۔ اسی طرح زراعت کے بارے میں چند نصیحتیں تیار کرنے سے زرعی نظام نہیں بن سکتا۔ پس مکتب کے اندر پہلے نظام بنتا ہے، اُس نظام کے قوانین بنتے ہیں، پھر ان قوانین کے ساتھ ساتھ نصیحتیں بھی موجود ہوتی ہیں، نصیحتوں کا اپنا ایک مقام ہے۔ یوں نہیں ہے کہ دین کے اندر نصیحتیں نہیں ہیں۔ پس امت سازی کے لئے ان خصوصیات کے تحت مکتب چاہئے اور پھر اس مکتب کے گرد وحدت چاہئے۔ جب اس مکتب کے گرد لوگ اکٹھے ہو جائیں امت کہلائیں گے۔ جب لوگ اس مکتب پر ایمان لائیں، اس کے پیروکار بن جائیں تب وہ امت بنیں گے۔

امت سازی ٦

از نظر قرآن

گروہ معارف

''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ'' يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ'' عَظِيْمٌ'' (آل عمران،۱۰۴)

امت سازی، دین کا بنیادی فریضہ

دین کا اہم ترین اور تمام فرائض سے بالاتر فریضہ جس پر قرآن میں سب سے زیادہ تاکید کی گئی ہے وہ امت سازی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے تبلیغِ دین کے عنوان سے جو سب سے پہلا کام انجام دیا، وہ امت سازی کے لئے بنیادیں فراہم کرنا تھا اور آخر کار رسول اللہ ﷺ نے یہ امر کامیابی کے ساتھ انجام دیا اور ایک باشکوہ اور نمونہ امت تشکیل دی۔ البتہ بعد میں کچھ انحرافات کی وجہ سے وہ امت پلٹ کر پھر سے قدیم شکلوں میں ڈھل گئی اور اس کے بعد آج تک دوبارہ امت کا روپ نہیں دھار سکی۔

فریضۂ امت سازی ترک کرنے کے نتائج

امت سازی وہ فریضہ ہے کہ اگر یہ ترک ہو جائے تو اس سے ایسا خلا پیدا ہوتا ہے جس میں بہت سارے مفاسد جنم لیتے ہیں اور ایسا ہوا بھی ہے۔ جب بھی انسان کوئی ذمہ داری ترک کرتا ہے تو اس ترکِ فریضہ کے نتیجے میں جو خلا پیدا ہوتا ہے اس خلا سے مفاد پرست، جاہ طلب، اقتدار پرست، مال پرست اور دنیا پرست انسان فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس خلا میں کوئی متبادل چیز یا نظام قائم کر کے اس سے سوئے استفادہ کرتے ہیں۔

امت سازی کا فریضہ انجام نہیں پایا اور اس سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس سے تاریخ میں بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا ہے۔ ہم تاریخِ اسلام میں بنو امیہ سے شروع کریں تو انہوں نے امت کے خلا سے فائدہ اٹھا کر ایسے سلسلے قائم کیے کہ تمام مسلمانوں کو ان میں مبتلا کر دیا اور اس کے بعد وہ موروثی سلسلے کبھی سیاست کے نام پر، کبھی دین کے نام پر اور کبھی دیگر عناوین سے چلتے رہے۔ امت کے خلا کو آج تک انہی چیزوں سے بھرا جا رہا ہے۔ مفاد پرست عناصر دین کا لبادہ اوڑھ کر امت کے خلا میں آ کر ایسے اقدامات انجام دیتے ہیں جو خلافِ دین اور خلافِ اسلام ہیں، جن کا نقصان اس قدر زیادہ ہے کہ قابلِ تلافی نہیں ہے۔ ایسا تاریخ بھر میں ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ اس وقت بھی اگر ہم دیکھیں تو جو خلا پیدا ہوا اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

عصری تقاضوں سے غفلت اور دہشت گردی

انقلابِ اسلامی کے بعد رہبری کا ایک تقاضہ پیدا ہوا تھا لیکن اس وقت اس

انقلاب اسلامی کے بعد امتوں کے اندر بیداری، اسلام کی طرف رجحان اور اسلامی قیادت کا تقاضا پیدا ہوا تھا لیکن جن لوگوں نے اس تقاضے کو پورا کرنا تھا انہوں نے اس تقاضے کا جواب نہیں دیا جس سے فائدہ اٹھا کر میڈیا نے اسلام کی جعلی لیڈر شپ بنائی اور اس کو قبول کروانے کے لئے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا!

تقاضے کا جواب نہیں دیا گیا، اس تقاضے کو پورا نہیں کیا گیا، صحیح منبع اور درست راہ سے اس کا انتخاب نہیں کیا گیا لہٰذا اسکے نتیجے میں دہشت گردی وجود میں آئی اور دہشت گرد، نام نہاد مجاہدین اور اسلام کے نام نہاد لیڈر وجود میں آئے جنہوں نے آ کر پوری دنیائے اسلام کو آگ میں جھونک دیا۔ خصوصاً پاکستان کے اندر ایسا ہوا۔ آج جب ہم پاکستان میں دہشت گردی کے وجود کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تو عموماً یہ کہتے ہیں کہ یہ ایجنسیوں نے کیا، فلاں نے کیا، یہ فرقہ واریت کی وجہ سے پیدا ہوا لیکن اس میں ایک اہم ترین عنصر کہ جس سے غفلت برتی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دہشت گردی اور دہشت گردوں کے وجود میں آنے کے لئے میدان ان لوگوں نے ہموار کیا ہے جنہوں نے اس وقت جو تقاضے پیدا ہوئے تھے ان تقاضوں کا جواب نہیں دیا اور انہیں پورا نہیں کیا۔ یعنی انقلابِ اسلامی کے بعد امتوں کے اندر بیداری، انقلاب، اسلامی قیادت اور رہبری کا تقاضہ اور اسلام کی طرف رجحان پیدا ہوا تھا لیکن جن لوگوں نے اس تقاضے کو پورا کرنا تھا وہ یا جہالت کی وجہ سے یا نادانی کی وجہ سے یا پسماندگی کی وجہ سے یا تحجر و خناقاہیت کی وجہ سے یا خیانت کی وجہ سے یا جس وجہ سے بھی کہیں، انہوں نے اس تقاضے کا جواب نہیں دیا، جس سے فائدہ اٹھا کر میڈیا نے اسلام کی جعلی لیڈر شپ بنائی اور اس جعلی لیڈر شپ کو قبول کروانے کے لئے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، جو ساری دنیا دیکھ رہی ہے اور ہم آج بھی اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔

تقاضوں سے غفلت اور جعلی نظام

جب بھی ملت کے اندر امامت کا تقاضہ پیدا ہوا اور اسے پورا نہ کیا جائے تو اس کی جگہ جعلی امام پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب بھی دین کی طرف رجحان پیدا ہوا اور اس تقاضے کا جواب نہ دیا جائے تو جعلی مکاتب وجود میں آ جاتے ہیں اور جب بھی امت کا تقاضا پیدا ہو لیکن امت سازی نہ کی جائے تو اس کی جگہ پر جعلی ڈھانچے اور ایسے نظام وجود میں آ جاتے ہیں جو امت کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ قانون ہے کہ جب بھی حقیقی طور پر کسی ملت یا کسی علاقے کے اندر تقاضا پیدا ہوا اور وہ پورا نہ ہو تو اس کو جعلی طریقے سے پورا کیا جاتا ہے۔ اس لیے امت سازی نہ کرنے کا جو نتیجہ، ضرر اور نقصان ہے وہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ جتنی بھی جعلی چیزیں بنی ہوئی ہیں، جتنے جعلی ڈھانچے بنے ہوئے ہیں، جتنے جعلی فرقے بنے ہوئے ہیں، جتنی جعلی قیادتیں بنی ہوئی ہیں، جتنی جعلی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور جتنے جعلی اسلامی سلسلے قائم ہو چکے ہیں یہ سب کے سب درحقیقت امت کے خلا کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی جن لوگوں کا فریضہ تھا انہوں نے یہ کام انجام نہیں دیا لہٰذا اس خلاء اور خالی میدان کے اندر متعدد بستیاں آباد ہو گئی ہیں۔

اگر ایک میدان خالی پڑا ہو تو اس میں نشئی جا گھستے ہیں، اس میں جھگیوں والے آ کے اپنی جھگیاں لگا لیتے ہیں، اس میں ریڑھیوں والے ریڑھی لگا لیتے ہیں، اس میں ہر آدمی آ کر اپنی کوئی نہ کوئی بساط بچھا لیتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا ہے کہ امت سازی کا میدان خالی تھا اور اس کی جگہ پر آج جب ہم دیکھتے ہیں تو ہزاروں چیزیں بنی ہوئی ہیں، وہ ہزاروں چیزیں اتنی راسخ ہو چکی ہیں کہ عینِ دین بن چکی ہیں اور انہیں کو امت کا نعم البدل سمجھا جاتا ہے۔ ان کی پرستش و پوجا کرتے ہیں اور اگر آج بھی یہ امت سازی کا کام شروع نہ ہوا تو یہ جعلی سلسلے جاری رہیں گے اور ان کے جاری رہنے میں وہ لوگ بھی شریکِ جرم ہوں گے جنہوں نے فریضۂ امت سازی ترک کیا ہے۔ ہم نے بہت ساری چیزیں بنا رکھی ہیں لیکن جو بنانا تھا، جس کے لئے ماموریت تھی، جس کو بنانے کا حکم تھا وہ نہیں بنا سکے۔ اصلاً معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم نے وہ چیز جو بنانی ہے اور اس کے نام پر کچھ اور چیزیں تشکیل دیتے رہے۔

امت سازی کا رکنِ اوّل: وحدت در مکتب

امت سازی کے لئے قرآن مجید نے جہاں پر حکم دیا ہے

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ"" (آل عمران،۱۰۴)

تم میں سے ایک امت ہو یعنی حکم ہے کہ تم امت بنو اور بناؤ۔ ہم بعد میں دیگر آیات کی طرف آئیں گے جو قرآن مجید میں امت سے متعلق موجود ہیں لیکن یہ قرآن مجید کا صریح حکم ہے کہ تم امت بنو، امت کی طرف آؤ اور انبیاءؑ کا

ایک ہی منشور تھا کہ لوگوں کے اس ریوڑ کو امت بنانا۔نہضتِ انبیاءؑ کا اصلی ہدف امت سازی تھا، باقی اہداف امت کے ذریعے سے حاصل کرنے ہیں، امت وہ ہدف ہے جس کے ذریعے سے دین کے الٰہی مقاصد حاصل ہونا ممکن ہیں۔امت سازی کے لئے قرآن مجید نے باقاعدہ راہنمائی کی ہے کہ آپ کن طریقوں اور کن اصولوں کے مطابق امت قائم کرسکتے ہیں۔

ان میں سے پہلی چیز جو امت کے اندر شرط ہے وہ دین اور آئیڈیالوجی ہے۔

"وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا" (آل عمران،۱۰۳)

آپ سب کے سب دینِ خدا سے تمسک کرو، دینِ خدا سے اعتصام کرو، دینِ خدا جب سب کے لئے قابلِ اعتصام ہو، ہر شعبۂ زندگی میں قابلِ اعتصام ہو، اعتصام بہ دین، اعتصامِ بحبل اللہ یعنی تمام شعبہ ہائے زندگی میں، تمام اموراتِ زندگی میں آپ دین سے اعتصام کرو یعنی ہر جگہ تمہارا ملجاء و ماویٰ دین ہونا چاہیے، ہر قدم پر تمہارے پاس دلیل وسند، ہر کام کا جواز دین ہونا چاہیے۔

مکتب: دین کی قابلِ تمسّک حالت

دین اس وقت قابلِ تمسک ہوتا ہے جب دین مکتب کی شکل میں ہو، یعنی دین جب اس معدنی حالت سے دستوری حالت میں تبدیل ہوجائے۔اسی لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے ساتھ نبی مبعوث فرمائے ہیں اور امام بھی منصوب کیے ہیں۔ان آئمہؑ کا کام دین کو دستوری وعملی بنانا تھا۔ یعنی قرآن مجید میں دین کے جو اصولِ کلی ہیں وہ منبع ہیں اور آئمہؑ کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان اصولوں کو اس منبع سے نکال کر عملی و دستوری شکل دیں تاکہ لوگ ان کو اپنا سکیں اور ان پر چل سکیں۔ ہر شعبۂ زندگی کی ضرورت کے مطابق اس سے مواد نکال کر لوگوں کو فراہم کرسکیں۔اگر وہ نظام ہے تو نظام بنائیں، اگر وہ احکام ہیں، تو قوانین بنائیں، اگر وہ اخلاقیات ہیں، تو اخلاقیات بنائیں، اگر وہ اقدار ہیں، تو ان سے اقدار بنائیں، ہر مطلب جو لوگوں کی راہنمائی کے لئے ضروری ہے اس کو منبعِ دین سے نکال کر عملی اور دستوری حالت دینے کا نام مکتب ہے۔یعنی امت سازی کے لئے لوگوں کا، مسلمانوں کا دین کے ساتھ تمسک ضروری ہے۔دین کے گرد جمع ہونے سے ہی امت بنتی ہے۔

امت اس طبقے اور اس نظریاتی گروہ کو کہتے ہیں جو دین کے گرد جمع ہوا ہو اور صرف دین نے ان کو جمع کیا ہو اور دین کے علاوہ کوئی چیز ان کا نکتۂ اشتراک نہ ہو۔باقی کسی چیز میں ایک دوسرے سے کوئی ارتباط نہ رکھتے ہوں، ہر چند آپس میں بھائی بھی ہوں لیکن جس چیز کی وجہ سے آپس میں اکٹھے ہوئے ہیں وہ فقط دین ہو: نہ برادری، نہ قوم، نہ قبیلہ، نہ علاقہ، نہ زبان، نہ رنگ، نہ نسل، نہ کوئی اور چیز۔ان کے مدنظر فقط دین ہو اور دین بھی جب مکتب کی شکل میں ہو تو لوگوں کو اکٹھا کرسکتا ہے یعنی لوگ اس کے گرد جمع ہو کر اس کو اپنے لئے دستور و منشور بنا سکتے ہیں۔

امت سازی کے لئے پہلا مرحلہ آئیڈیالوجی ہے۔دینی آئیڈیالوجی و دینی مکتب کی ضرورت ہے۔دینی مکتب کے لئے ہمیں مکتب کی کچھ خصوصیات سے آگاہی ضروری ہے۔امت سازی کا سب سے اہم مرحلہ یہی مکتب ہے اس وجہ سے اس کی کچھ خصوصیات جو دیگر علمائے کرام نے بیان کی ہیں وہ آپ کی خدمت میں بھی بیان کی جارہی ہیں۔

مکتب بمقابلہ دینِ موروثی

مکتب کے مقابلے میں ایک رسوماتی اور موروثی سلسلۂ دین ہے، یعنی وہ دین جو اجتماعی رسم کی شکل اختیار کرگیا ہے اور انسان کو وراثت میں ملتا ہے۔ہم مسلمان اس لیے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ہم شیعہ اس لیے ہیں کہ ہم شیعہ کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔موروثی طور پر اپنے آباء و اجداد سے، اپنی ماؤں سے، اپنی نانیوں سے، اپنی دادیوں سے جو کچھ سیکھا ہے یہ مکتب نہیں ہے بلکہ یہ رسوماتِ دین ہیں یا یوں کہیں کہ ایک اجتماعی رسم ہے جو ہمیں اجداد کی طرف سے دین کے نام پر منتقل ہوئی ہے، اسی کو بڑے ہو کر ہم نے علمی شکل میں بھی پڑھ لیا ہے۔یہ دین قابلِ عمل و قابلِ نفاذ نہیں ہے چونکہ اس کی شکل دستوری و منشوری نہیں ہے اور ہر تقاضۂ زندگی کا جواب و راہنمائی اس کے پاس موجود نہیں ہے۔فقط نصیحتیں ہیں نظام نہیں ہے۔نظام کسی اور کا

> **قرآن مجید کا یہ صریح حکم ہے کہ تم امت بنو؟ امت کی طرف آؤ اور انبیاءؑ کا ایک ہی منشور تھا کہ لوگوں کے اس ریوڑ کو امت بنائیں۔ نہضتِ انبیاءؑ کا اصلی ہدف امت سازی تھا باقی اہداف امت کے ذریعے سے حاصل کرنے ہیں، امت وہ ہدف ہے جس کے ذریعے سے دین کے الٰہی مقاصد حاصل ہونا ممکن ہیں۔**

ہے نصیحتیں اس کی ہیں، عمل کسی اور نے کرنا ہے نصیحت اس نے کرنی ہے، روشیں کسی اور کی ہیں نصیحتیں اس کی ہیں، اس وجہ سے یہ راہنمائی نہیں کرسکتا۔

موروثی دین جو ہم نے پیدائشی اور تقلیدی طور پر اپنایا ہوا ہے، یہ مکتبی دین کے مقابلے میں ہے۔ مکتبی یا مدون دین یعنی باقاعدہ مفصل، روشن، واضح دین، جس کے اندر کسی قسم کی کنفیوژن و سرگردانی نہ ہو اور اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس دین کے ساتھ ایمانی تعلق ہو۔ مکتبی دین اپنے پیروکار کو متعہّد بناتا ہے اور مکتب دوسرے لفظوں میں ایک سندِ تعہدِ انسان ہے۔ یہ قرآنی اصطلاحات ہیں جو ہمیں سیکھنی ہیں اور ان سے آشنا ہونا ہے۔

قرآنی اصطلاحات سے نا آشنائی

عہد و تعہد قرآنِ مجید کی اصطلاحات ہیں جس طرح امت خود اصطلاحِ قرآن ہے۔ آج ہم غیر قرآنی زبان میں بات کریں تو سب کو سمجھ آتی ہے لیکن اگر قرآن کی زبان میں بات کریں تو سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ ہم نے قرآن منشور کے طور پر نہیں رکھا ہوا۔ ہم قرآنی اصطلاحات سے مانوس نہیں ہیں، مثلاً امت سے آشنا نہیں ہیں لیکن انجمن سے آشنا ہیں، تنظیم سے آشنا ہیں، حزب سے آشنا ہیں، پارٹی سے آشنا ہیں، قبیلے سے آشنا ہیں، قوم سے آشنا ہیں، برادری سے آشنا ہیں، یہ وہ عناوین ہیں کہ اگر ان کو یہاں بیان کریں تو وضاحت کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سب کے ذہن میں یہ تصور موجود ہے کہ برادری کس کو کہتے ہیں، قومیت کس کو کہتے ہیں، لسانیت کس کو کہتے ہیں لیکن امت کا کوئی مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امت قرآنی عنوان و اصطلاح ہے جو ہمارے اندر رائج نہیں ہے۔

ہم قرآن سے باہر سے چیز لے کر اس کے اوپر قرآن کا بینر لگا دیتے ہیں۔ ماڈل کہیں اور سے لیتے ہیں اور آ کر آیات کا بینر بناتے ہیں، جیسے:

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ" (آل عمران، ۱۰۳)

یہ وہ آیت ہے جو عموماً بینر کے لئے استعمال کی جاتی ہے کہ جب بھی شیعہ سنی اکٹھے کرنے ہوں تو اوپر لکھ دیتے ہیں کہ

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (آل عمران، ۱۰۳)

یہ بینر کی آیت ہے جبکہ یہ آیہ امت سازی کے اصولوں میں سے ایک اصل بیان کر رہی ہے۔ انہی اصطلاحات میں سے ایک امت ہے اور ایک عہد ہے۔

غیر ذمہ دار طبقہ اُمت کی بربادی کا سبب

تعہد یعنی احساسِ مسئولیت و احساسِ ذمہ داری۔ مکتب اپنے پیروکاروں کو متعہّد بناتا ہے۔ متعہّد کے مقابلے میں دو طبقے ہیں: غیر ذمہ دار افراد اور پیشہ ور۔ غیر ذمہ دار یعنی وہ لوگ جن کے دوش پر کوئی مسئولیت نہیں ہے، جو کسی قسم کی ذمہ داری نہیں رکھتے اور کسی قسم کی ذمہ داری کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔

یہ غیر ذمہ دار طبقہ ہے جس کو قرآن حیوان کہتا ہے۔ قرآن ان کو جانور بلکہ پست ترین جانور کہتا ہے کہ رینگنے والوں میں سب سے حقیر و پست یہی ہیں جو غیر ذمہ دار ہیں۔ جنہوں نے اپنے دوش پر کوئی ذمہ داری نہیں لے رکھی۔ اگرچہ ہم عموماً یوں سمجھتے ہیں کہ قوم چوروں اور ڈاکوؤں کے چنگل میں آئی ہوئی ہے لہٰذا قوم کی نجات اس میں ہے کہ اسے ان چوروں اور فاسد لوگوں سے نجات دی جائے لیکن شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ اگر چوروں، ڈاکوؤں اور مفسدین سے قوم کو نجات دے بھی دیں پھر بھی قوم تباہ و ویران ہی ہوگی کیونکہ قوم چوروں سے زیادہ خطرناک طبقے کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے اور وہ طبقہ غیر ذمہ دار لوگ ہیں۔ وہ مقدس نما لوگ جو ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگرچہ چور بھی نہیں ہیں، ڈاکو بھی نہیں ہیں، بدنام بھی نہیں ہیں، فاسد بھی نہیں ہیں، شرابی بھی نہیں ہیں، بہت اچھے ہیں، نمازی ہیں لیکن وہ غیر ذمہ دار ہیں اور ساری قوم ان کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ جب تک ان سے نجات نہیں پاتے قوم کی نجات کی امید نہیں ہے اور ان سے نجات دینا آسان نہیں ہے۔

یہ وہ اسارت گاہیں ہیں کہ جہاں انسان رضا کارانہ طور پر للہ، فی اللہ جاتا ہے اور اپنے آپ کو قید کر لیتا ہے۔ جیسے آپ دیکھتے ہیں کہ مقدس زنجیریں ہوتی ہیں جن کو انسان قربۃً الی اللہ اور ثواب کے طور پر باندھتے ہیں۔ انسان کو اُس زنجیر سے کیسے نجات دی جائے جو انسان خود انتخاب کرتا ہے؟ وہ زنجیریں جو انسان ناگوار سمجھتا ہے، جو انسان کو زبردستی پہنائی جاتی ہیں ان سے آسانی سے نجات دی جاسکتی ہے لیکن وہ زنجیریں جو انسان خود مقدس سمجھ کر پہن لیتا

> دین اس وقت قابلِ تمسّک ہوتا ہے جب دین مکتب کی شکل میں ہو، یعنی دین، دستوری حالت میں تبدیل ہو جائے۔ اسی لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے ساتھ نبی بھی مبعوث فرمایا اور اس کے بعد امام منصوب کیئے ہیں۔ ان آئمہؑ کا کام دین کو دستوری و عملی بنانا تھا۔

> **امت اس طبقے اوراس نظریاتی گروہ کو کہتے ہیں جو دین کے گرد جمع ہوا ہو اور صرف دین نے ان کو جمع کیا ہو، دین کے علاوہ کوئی چیز ان کا نکتہِ اشتراک نہ ہو۔**

ہے ان زنجیروں سے انسان کو کیسے نجات ملے؟ کچھ ڈاکو ہیں جو انسان کو اغواء برائے تاوان یا کسی اور وجہ سے بندوق کے زور پر اٹھا کر لے جاتے ہیں، ان ڈاکوؤں سے نجات دینا آسان ہے لیکن جس گروہ کے اختیار میں خود انسان رضا کارانہ طور پر چلا جائے اس سے نجات کی سبیل کرنا کارِ دشوار ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے کہ جس نے مسلمانوں کی اکثریت کو اپنا اسیر بنایا ہوا ہے۔

بے مسئولیت وغیر ذمہ دار مقدس مآب، جن کا ظاہر بہت اچھا ہے لیکن وہ غیر ذمہ دار ہیں اور لوگ ان کے گرویدہ ہیں۔ مسلمانوں کے غیر ذمہ دار ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ لوگ ہیں۔ ان کو دیکھ کر دوسروں کے اندر بھی غیر ذمہ داری کی بیماری سرایت کرتی ہے۔ وہ توجیہ ودلیل کے طور پر ان کا عمل پیش کرتے ہیں کہ ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی چونکہ وہ بزرگ بھی اس چیز کو جائز نہیں سمجھتے یا وہ اس چیز کے قائل نہیں ہیں یا انہوں نے یہ کام نہیں کیا اور چونکہ انہوں نے نہیں کیا لہٰذا ہم بھی نہیں کرتے۔ مثلاً امام حسینؑ کے ساتھ صرف بہتر لوگ آئے اور مسلمانوں کی اکثریت نہیں آئی، جبکہ اس وقت بہتر لاکھ سے زیادہ جمعیت تھی۔ بہتر لاکھ میں سے فقط بہتر تن آئے باقی بہتر لاکھ کہاں تھے؟ اس وقت شیعہ بہت زیادہ تھے، اس وقت یہ سارے شیعہ کہاں تھے؟ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، حج کر رہے تھے، زیارت کر رہے تھے، سب اپنی اپنی عبادتگاہوں میں مشغول تھے، سب شامیوں کی طرح فاسد نہیں تھے بلکہ ان کرداروں اور ان لوگوں کے اسیر بنے ہوئے تھے جو یہ کہتے تھے کہ ہم پر کچھ بھی لازم نہیں ہے، ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، ہم نے بس اپنی قبر میں جانا ہے۔

مکتب کی چند خصوصیات:

مکتب منبعِ ذمہ داری

جن کا دین یہ تھا کہ 'تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو' درحقیقت ان لوگوں نے بہتر لاکھ لوگوں کو روک کے رکھا ہوا تھا لیکن بہتر تن ان کی اسارت سے آزاد ہو کر امام احرار اور سیّدِ احرار، سیّد الشہداءؑ کے پاس آ گئے۔ یہ بہتر آزاد لوگ تھے، جبکہ دیگر بہتر لاکھ بے مسئولیت لوگوں کے ہاتھوں اسیر تھے۔ اگرچہ یہ بدکردار نہیں تھے لیکن بے مسئولیت وغیر ذمہ دار لوگ تھے۔ ذمہ دار کون بناتا ہے؟ ذمہ داری کہاں سے آتی ہے؟

منبعِ ذمہ داری مکتب ہے۔ رسوماتی دین، موروثی دین اور آبائی دین انسان کے اوپر ذمہ داریاں نہیں ڈالتا، وہ صرف انسان کو تسکین دیتا ہے، چسکا دیتا ہے اور انسان کے اندر احساس پیدا کرتا ہے کہ تم بہترین ہو۔ ایک کاذب احساس انسان میں ڈالتا ہے لیکن وہ دین جو انسان کو ذمہ داری دیتا ہے وہ مکتب ہے کہ جب دین مکتب کی شکل میں آجائے۔ درحقیقت آئیڈیالوجی انسان کو ذمہ داریاں تقسیم کرتی ہے اور اگر انسان آئیڈیالوجی سے مربوط ہی نہ ہو یعنی کوئی آئیڈیالوجی نہ ہو تو انسان کی ذمہ داری کا سوال بھی نہیں اٹھتا۔ بس کھاؤ، پیو، عیش کرو، زندگی بسر کرو، صبح کو شام کرو، شام کو صبح کرو اور لذت اٹھاؤ۔ دنیاوی لذتوں سے اٹھ کر براہِ راست جنت کی لذتوں میں چلے جاؤ یعنی یہاں بھی لذت پرستی، وہاں بھی لذت پرستی۔ یہاں عورتوں کی بغلوں سے اٹھ کر وہاں حوروں کی بغلوں میں جا بیٹھنا، یہ غیر مکتبی دین کا منشور وہدف ہے کہ تم چار چار شادیاں یہاں کرلو وہاں پر تمہیں چار چار ہزار حوریں مل جائیں گی، یہاں کچھ بھی نہیں کرنا۔

درحقیقت مکتب ہے جو انسان کو ذمہ دار بناتا ہے اور عہد دیتا ہے۔ قرآن کی نظروں میں مرد کہلانے کے حقدار وہی ہیں جو ذمہ دار ہیں اور جو غیر ذمہ دار ہیں وہ نامرد ہیں۔ امیرالمومنینؑ اپنی سپاہ اور اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر کے جو خطبہ دیتے تھے اس میں ایک تو یہ کہ ان لوگوں کو کبھی امت کہہ کر مخاطب نہیں کیا، ہمیشہ کہا:

"مجتمعة الابدان"

حضرتؑ نے ان کو ہمیشہ کہا کہ تم پارٹی ہو، تنظیم ہو، امت نہیں ہو بلکہ تم 'مجتمعة الابدان' ہو

"ایھاالناس المجتمعة ابدانھم، المختلفة اھواؤھم"

اور پھر جب حضرتؑ انہیں خطاب کرتے تو فرماتے کہ:

"یا اشباہ الرجال ولا رجال"

اے نامردو! اے مردوں جیسے چہرو، مردوں جیسی صورتو، مردوں جیسی شکلو اور نامردو، تمہارے اندر مردانگی کے جوہر نہیں پائے جاتے۔ مردانگی داڑھی اور مونچھ سے نہیں ہوتی بلکہ مردانگی کچھ صفات کا نام ہے۔ قرآن کے نزدیک

موروثی دین، مکتبی دین کے مقابلے میں ہے۔ مکتبی یا مدوّن دین یعنی باقاعدہ مفصّل، روشن، واضح دین، جس کے اندر کسی قسم کی کنفیوژن و سرگردانی نہ ہو اور اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس دین کے ساتھ ایمانی تعلق ہو۔ مکتبی دین اپنے پیروکار کو متعہد بناتا ہے۔

مردانگی کا پہلا عنصر مسئولیت و ذمہ داری ہے۔ غیر ذمہ دار انسان مرد نہیں ہے، اصلاً لائق وسزاوار نہیں ہے کہ اس کو مرد کہا جائے۔ قرآن مجید کا فرمانا ہے کہ

''مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ''

(سورہ احزاب، آیت ۲۳)

''اور اہلِ ایمان میں سے کچھ مرد ایسے بھی ہیں جنہوں نے وہ عہد و پیمان سچا کر دکھایا جو اللہ سے کیا تھا۔''

''فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ''

(سورہ احزاب، آیت ۲۳)

''سو ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اپنا وقت پورا کر چکے ہیں اور کچھ اس (وقت) کا انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے (اپنی روش میں) ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔''

قرآن کے نزدیک غیر ذمہ دار انسان جس کے دوش پر کوئی ذمہ داری نہ ہو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے، مرد کہلانے کا مستحق نہیں ہے، مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ انسان یعنی مسئولیت، انسان یعنی ذمہ داری۔ ذمہ داریاں مکتب عطا کرتا ہے۔ مکتب میں غیر ذمہ دار انسان کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ مکتب درحقیقت ذمہ داریاں سکھانے کی تربیت گاہ ہوتا ہے۔ مکتب وہ آغوش ہے جس میں انسان اپنے فرائض سے آگاہ ہوتا ہے، اپنی ذمہ داریوں سے آشنا ہوتا ہے اور ان ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ مکتب ایک تو ذمہ دار پالتا ہے اور دوسرا ذمہ داری کی تربیت بھی دیتا ہے۔ مکتب کا کام ہی یہی ہے۔ یہ ذہن نشین فرمالیں کہ مکتب سے مراد آئیڈیالوجی ہے۔

مکتب سرچشمہِ قوت

اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً چھ ارب ہے اور اس میں سے ایک ارب کے قریب مسلمان ہیں۔ اگر ان مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ لگائیں تو یہ سو آدمیوں کے برابر بھی نہیں ہے کیونکہ کچھ بھی نہیں کر سکتے، حتیٰ اپنے ملکوں میں کچھ کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ آج پاکستانی، پاکستان کے اندر کچھ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے لیکن اگر امریکہ پاکستان میں کچھ کرنا چاہے تو فوراً کر لیتا ہے، سعودی عرب پاکستان میں کچھ کرنا چاہے تو فوراً کر لیتا ہے، حتیٰ کویت جو ایک چھوٹا سا شہر ہے، وہ بھی اگر پاکستان کے بارے میں کوئی نیت رکھتا ہو تو وہ آسانی سے آ کر کر سکتا ہے مگر پاکستانی، پاکستان میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ پاکستان کے اندر جو سترہ یا اٹھارہ کروڑ کی آبادی ہے وہ بے طاقت ہے۔ اگر اٹھارہ کروڑ مریض ہوں جو لاغر، اپاہج و مفلوج ہوں یعنی ہاتھ بھی خشک ہوں، پاؤں بھی خشک ہوں، گردنیں مڑی ہوئی ہوں، یہ کیا کر سکتے ہیں؟ یہ اپنے آپ سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتے اگرچہ تعداد میں اٹھارہ کروڑ ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ یہ مفلوج ہیں۔

مکتب کے اندر قوت ہے، مکتب طاقت دیتا ہے۔ درحقیقت انسانوں کی طاقت کا سرچشمہ مکتب ہوتا ہے۔ آئیڈیالوجی قوت کا منبع ہے۔ اگر ان ایک ارب مسلمانوں کے پاس آئیڈیالوجی ہوتی تو یہ کیا کرتے؟ مدینہ میں جب پہلا حملہ ہوا تو کل مدافعینِ اسلام کی تعداد تین سو تیرہ تھی، یہ تین سو تیرہ بھی سارے جنگجو نہیں تھے، بعض ایسے تھے کہ جن سے تلوار بھی نہیں اٹھ سکتی تھی لیکن وہ اس میدان میں حاضر تھے۔ رسول اکرمؐ نے ان سے کہا تھا کہ آپ خضاب لگائیں تاکہ جوان نظر آئیں۔ یہ خضاب لگانے کا استحباب اسی وقت سے شروع ہوا ہے لیکن آج کل شادی کے لئے خضاب لگاتے ہیں، جس کو دوسری شادی کرنی ہو وہ عورتوں پر رعب جمانے کے لئے خضاب لگاتے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے خضاب لگاؤ۔ چونکہ آج کل مردوں کے لئے سب سے بڑا دشمن عورتوں کو سمجھا جاتا ہیں لہٰذا داڑھی کالی کر کے ان کے سامنے جاتے ہیں کہ ہم ابھی بھی جوان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا دشمن کو مرعوب کرنا ہے۔

علیؑ کے زمانے میں امیرالمومنینؑ کی فوج نے کہا کہ کالی مہندی ختم ہوگئی ہے، اب خضاب کس سے لگائیں؟ تو حضرتؑ نے کہا کہ اب ضرورت نہیں ہے، اسکی ضرورت اس زمانے میں تھی جب ہم تھوڑے تھے اور جو تھے وہ بھی بوڑھے تھے، اب ہماری تعداد اتنی ہے کہ بوڑھوں کو جنگ کے اندر لانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

غرض یہ کہ جنگِ بدر میں تین سو تیرہ نے ایک ہزار کو شکست دی۔ وہ ایک ہزار سارے کے سارے جنگجو تھے، وہ خضاب لگا کے نہیں آئے تھے، وہ واقعاً پہلوان تھے، ان میں ایک سے بڑھ کر ایک بڑا جنگجو تھا۔ مکی ویسے بھی جنگ کے بارے میں مدینے والوں سے زیادہ قوی تھے کیونکہ اسلام سے پہلے یہ بالکل ہی وحشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مدینہ میں مکہ کی نسبت پھر بھی قدرے بہتر حالت تھی۔ لہٰذا مکہ میں زیادہ جنگجو تھے، مثلاً آپ دیکھیں کہ ان کے اندر خالد بن ولید جیسے جنگجو موجود تھے جس شخص نے جنگِ احد میں تن تنہا مسلمانوں کو شکست دے دی، ایک فردِ واحد نے جیتی ہوئی جنگ کی کایا پلٹ دی۔ اہلِ مکہ کے پاس اس طرح کے جنگجو تھے لیکن یہ تین سو تیرہ ان پر غالب آئے۔ کیوں غالب آئے، کیا تھا ان کے پاس؟ اہلِ مکہ کے پاس اسلحہ اور گھوڑے زیادہ تھے، جبکہ مسلمانوں کے پاس صرف تین چار تلواریں، اتنے ہی نیزے اور محدود تعداد میں زرہیں تھیں لیکن وہ اس جانفشانی سے لڑے کہ وہ جنگ تاریخ میں ثبت ہوگئی کہ کس طرح مسلمانوں نے انتہائی محدود وسائل کے باوجود اپنے سے تین گنا بڑے لشکر کو شکست دی جس کے پاس آلاتِ جنگ بھی کہیں زیادہ تھے۔ دراصل مسلمانوں کے پیچھے مکتب کی قوت کارفرما تھی۔

ہمیشہ مکتب قوت عطا کرتا ہے، طاقت مکتب کے اندر ہے۔ امام خمینیؒ جو فرماتے ہیں کہ

''کربلا پیروزیٔ خون بر شمشیر است''

کربلا میں شمشیر پر لہو غالب آیا ہے یعنی مکتب غالب آیا ہے۔ آئیڈیالوجی ہمیشہ ٹیکنالوجی پر مقدم ہوتی ہے۔ اگر آئیڈیالوجی اور ٹیکنالوجی کی جنگ ہو تو آئیڈیالوجی جیت جاتی ہے، بشرطیکہ حقیقتاً آئیڈیالوجی ہو اور یہ طے شدہ بات ہے۔ آپ نے حزب اللہ، اسرائیل کی جنگ میں دیکھا کہ ایک طرف جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس اسرائیل تھا جسے پوری دنیا کی پشت پناہی حاصل تھی اور دوسری طرف حزب اللہ کے چند ہزار غیرت مند اور نظریاتی جوان تھے۔ اسرائیلی طیارے دبئی اور سعودی عرب سے ایندھن بھرتے تھے۔ جنگی جہازوں کا ایندھن بہت مہنگا ہوتا ہے، اسرائیل کے پاس اتنا ایندھن نہیں تھا، ان کے پاس سٹور بھی نہیں تھا لہٰذا وہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات سے ایندھن بھر کر حملہ کرتے تھے۔ انہوں نے پورے لبنان کو تہس نہس کر دیا لیکن آخر کار آپ نے دیکھا کہ کس خفت کے ساتھ تینتیس دن کے بعد انہیں شکست ہوئی اور ابھی تک وہ خوف اسرائیلیوں کے وجود سے باہر نہیں نکلا۔ اسرائیل کے پیچھے پوری دنیا کی ٹیکنالوجی موجود تھی، عرب و عجم اس کے ساتھ جمع تھے اور ادھر صرف ایک جماعت حزب اللہ۔ اس جنگ میں حزب اللہ کا صرف ایک دستہ شریک ہوا تھا لیکن غلبہ کسے ملا؟ آئیڈیالوجی کو غلبہ ملا، درحقیقت مکتب کی قوت تھی۔ ایک ہزار کے اندر اتنی طاقت آئی کہ انہوں نے دنیا کی بہترین مسلح فوج کو شکست دے دی۔ ان چیزوں پر ہمارا ایمان ہونا چاہیے۔ مکتب کے اندر طاقت ہے، مکتب قوت ہے، انسان کے اندر ساری طاقت مکتب اور آئیڈیالوجی سے آتی ہے۔

مکتب انقلاب آفرین قوت

آئیڈیالوجی کے اندر ایک اور قوت موجود ہے اور وہ ہے قوتِ انقلاب۔ کسی بھی معاشرے کی کایا مکتب ہی پلٹ سکتا ہے۔ تبدیلی آئیڈیالوجی کے ذریعے سے آتی ہے۔ آج ہم چاہتے ہیں کہ ہماری معاشرتی حالت بدلے، ہمارے قومی حالات بدلیں، ہمارے ملکی حالات بدلیں، البتہ بدلنے کی کوئی نہیں سوچتا بلکہ صرف بہتری کی سوچ رہے ہیں۔ سب نے این جی اوز اور ویلفیئر کے ادارے بنائے ہوئے ہیں۔ ویلفیئر یعنی بہتری، ویلفیئر کا معنی ہی یہی ہوتا ہے کہ بہتری آجائے، بہتری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مشکل ابھی باقی ہے لیکن پہلے سے کچھ فرق پڑ گیا ہے۔ اگر آپ مریض کی عیادت کے لئے جائیں، اس سے پرسشِ احوال کریں اور وہ کہے کہ بہتر ہوں تو اس کا معنی ہے کہ ابھی تک بیمار ہے، بس پہلے سے کچھ بہتر ہے۔ اگر ہم بہتری کے لئے کوششیں کریں، پھر بھی یہ حالت نہیں بدلے گی، پھر بھی بیماری ہی رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ قیمتوں میں دو تین روپے کا فرق پڑ جائے گا۔ ہمارے ہاں بہتری کی علامت یہی ہوتی ہے: دسترخوان پر ایک روٹی زیادہ ہو جائے گی، پکوڑا ایک اور مل جائے گا آپ کو یعنی ہمارے ہاں بہتری کا بس یہی مطلب ہے۔ بجلی ابھی سولہ گھنٹے جاتی ہے پھر

شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ اگر چوروں، ڈاکوؤں اور مفسدین سے قوم کو نجات دے بھی دیں پھر بھی قوم تباہ و ویران ہی رہے گی کیونکہ قوم چوروں سے زیادہ خطرناک طبقے کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے اور وہ طبقہ ''غیر ذمہ دار لوگ'' ہیں۔ وہ مقدس نما لوگ جو ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے۔

پندرہ گھنٹے جائے گی تو کہیں گے یہ بہتری ہوگئی ہے۔

تبدیلی کی ضرورت ہے یہ حالات بدلنے چاہئیں لیکن تبدیلی کہاں سے آئے اور کون تبدیلی لے کر آئے، پھر فوراً ہی ہم وہ بچگانہ سوال کرتے ہیں کہ یہ تبدیلی لائے گا کون؟ غیر مکتبی ذہنیتیں فوراً یہی سوال کرتی ہیں۔ پھر کسی آدمی کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ کسی فلم کا سپر مین آجائے وہ تبدیلی لائے۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر ہمارے ذہن ایسے بن چکے ہیں۔ مثلاً بچپن میں الہ دین کے چراغ والی کہانی پڑھتے تھے، پھر بچے ہر چراغ کو جا کر ملنا شروع کر دیتے تھے کہ شاید یہی الہ دین کا چراغ ہو، بچگانہ حرکتیں یہی ہوتی تھیں، ہر بچہ اپنے گھر میں جا کر چراغ ملنا شروع کرتا تھا کہ شاید یہاں سے کوئی جن نکل آئے۔ اسی طرح فلمیں دیکھ دیکھ کے ہماری ذہنیتیں یہ بن گئی ہیں کہ رات کو سو کر جب صبح اٹھیں تو دیکھیں کہ شاید کوئی سپر مین آگیا ہو اور ہمارے سارے حالات ٹھیک کر دے۔ تبدیلی کہاں سے آئے گی؟ تبدیلی نام ہے موجودہ حالت کے ختم ہونے کا اور اس کی جگہ پر مطلوب حالت کے قائم ہونے کا۔ انسان موجودہ حالت سے اس وقت نکلتا ہے جب موجودہ حالت انسان کے لئے قابل نفرت ہو۔ کون یہ احساس انسان کے اندر پیدا کرتا ہے کہ یہ موجودہ حالت آپ کے لئے مناسب نہیں ہے؟ وہ مکتب ہے۔ مکتب ہی یہ بیداری انسان کے اندر ڈالتا ہے کہ یہ موجودہ حالت تمہارے شایانِ شان نہیں ہے، بلکہ ننگ وذلت ہے۔ انسان کے اندر احساسِ زیاں مکتب پیدا کرتا ہے، انہیں یہ بتاتا ہے کہ تم ذلت کے اندر رہ رہے ہو اور موجودہ حالت کے خلاف شورش بھی مکتب کرواتا ہے۔ بغاوت آئیڈیالوجی (مکتب) کرواتی ہے، باقی سب مل کر موجودہ حالت کی توجیہ کر رہے ہوتے ہیں، سب کسی نہ کسی طریقے سے موجودہ حالت کے ساتھ ہم آہنگی بنانے اور سمجھوتہ کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ مکتب تنہا وہ منبع ہے جو موجودہ حالت کو ناپسند قرار دے کر رد کرتا ہے، لوگوں کو اس کے خلاف اکساتا ہے اور تبدیلی کی طرف لے کر جاتا ہے۔ یہ طاقت فقط مکتب کے اندر موجود ہے اور کسی منبع کے اندر موجود نہیں ہے۔

اس لیے انقلاب فقط مکتب کے بطن سے ہی باہر آتا ہے۔ اگر مکتب کے بغیر ہو تو وہ تحریکیں انقلاب نہیں کہلاتیں بلکہ وہ شورشیں اور بغاوتیں ہیں اور ان کے بہت سارے نام ہیں۔ جہاں مکتب اور آئیڈیالوجی موجود نہ ہو وہاں ان کو انقلاب نہیں کہہ سکتے۔ ہر ریلی انقلاب نہیں ہوتی، مثلاً لوگ مہنگائی سے تنگ آ کر سڑکوں پر نکل آئے ہیں یہ انقلاب نہیں ہے۔ سڑک پر آ کر ٹائر جلا رہے ہیں اور نعرہ لگا رہے ہیں کہ بھنڈی سستی کر دو، اس کے بعد یہ چپ کر کے گھروں میں جا کر بیٹھ جائیں گے۔ حکام بھنڈی سستی کر کے کریلا مہنگا کر دیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے مطالبات پورے ہو چکے ہیں اور قوم جیت گئی ہے۔ اس کو نہیں کہتے انقلاب!

انقلاب اس حرکت کو کہتے ہیں جو مکتب ایجاد کرتا ہے، جو آئیڈیالوجی تیار کرتی ہے، آگے میدان میں اتارتی ہے، اس کو انقلاب کہتے ہیں، انقلاب کی تعریف اور مفہومِ انقلاب کے اندر یہ چیز پوشیدہ ہے۔ مثلاً ابھی لوڈ شیڈنگ کے خلاف ریلی نکلے تو اسے کہیں گیکہ انقلاب آگیا ہے، یہ انقلاب نہیں ہے! اگر سارا پاکستان اٹھ کر مہنگائی کے خلاف باہر آجائے اور اس کے نتیجے میں حکومت بھی گر جائے اس کو انقلاب نہیں کہیں گے کیونکہ اس کی جگہ ایک اور حکومت برسرِ اقتدار آجائے گی۔ انقلاب کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہوتی ہے۔

مکتب کا عام فہم ہونا

مکتب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مکتب پیچیدہ ترین امور کو سادہ ترین زبان میں پیش کرتا ہے۔ مکتب کے اندر پیچیدگی نہیں ہوتی۔ مکتب ٹرین کی پٹڑی کی طرح رواں ہوتا ہے جس میں چوڑائی بھی نہیں ہوتی کیونکہ مکتب عام لوگوں کے لئے عملی راستہ ہوتا ہے اور عملی راستہ پیچیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے اندر زیادہ موڑ نہیں ہونے چاہئیں تا کہ لوگ اس کے اندر گم نہ ہو جائیں۔ مکتب کے اندر بھول بھلیاں نہیں ہوتیں جبکہ علمی اور تحقیقی مواد میں بھول بھلیاں بہت ہوتی ہیں۔ مکتب بالکل سیدھا راستہ ہوتا ہے تا کہ ایک قوم اس پر چل سکے اور اس پر عمل کر سکے۔

مکتب ہم آہنگی کا ذریعہ

مکتب کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ مکتب کے اندر غیر ہم آہنگ عناصر،

> منبعِ ذمہ داری مکتب ہے۔ رسوماتی دین، موروثی دین اور آبائی دین انسان کے اوپر ذمہ داریاں نہیں ڈالتا، وہ صرف انسان کو تسکین دیتا ہے، چسکا دیتا ہے اور انسان کے اندر احساس پیدا کرتا ہے کہ تم بہترین ہو! قرآن کی نظروں میں مرد کہلانے کے حقدار وہی ہیں جو ذمہ دار ہیں اور جو غیر ذمہ دار ہیں وہ نامرد ہیں۔

مکتب اپنے پیروکار کو ہمیشہ نبرد اور جنگ میں رکھتا ہے، فقط میدان بدلتا رہتا ہے۔ یہ مکتب کا طریقہ کار ہے کہ کبھی بھی فرد کو ستیز و نبرد سے باہر نہیں آنے دیتا اور ہمیشہ اس کو اسی حالت میں رکھتاہے تا کہ اس کی آمادگی باقی رہے۔

افراد، گروہوں اور نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی قوت موجود ہوتی ہے اور یہ صرف آئیڈیالوجی کے بس میں ہوتا ہے۔ یہ کام آئیڈیالوجی کے علاوہ کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہی فرمایا ہے کہ تم آپس میں اعداء تھے، غیر ہم آہنگ تھے:

"وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ" (آل عمران، ۱۰۳)

یاد کرو جب تم دشمن تھے، غیر ہم آہنگ تھے، ضد تھے ایک دوسرے کی اور خدا نے تمہارے اندر الفت پیدا کردی

"فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا" (آل عمران، ۱۰۳)

اور تم خدا کی نعمت کے طفیل آپس میں بھائی بن گئے۔ دشمن تھے لیکن بھائی بن گئے۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا ہے کہ یہ کام ہونے والا نہیں تھا اگرچہ آپ بہت زیادہ پیسہ بھی خرچ کرتے۔ چونکہ غیر مکتبی طریقہ یہ ہے کہ پیسوں کے ذریعے سے لوگوں کو جمع کیا جائے۔ خداوند تعالیٰ کا فرمانا ہے کہ اے رسول ﷺ اگر یہ ساری دنیا کی دولت آپ کے پاس ہوتی اور یہ دولت آپ خرچ کرتے پھر بھی یہ دل ایک نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ دل لطفِ خدا سے ایک ہوئے ہیں ان دلوں کو مکتب نے ایک کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مدینے آنے کی داستان بھی بہت جالب ہے۔ مدینے میں تین بڑی آبادیاں یا برادریاں تھیں: اوس، خزرج اور یہود۔ اوس وخزرج مقامی لوگ تھے اور بت پرست تھے جبکہ یہود مہاجرین تھے جو فلسطین، کنعان اور مختلف علاقوں سے کئی سو سال پہلے ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ کے استقبال کے لئے مدینے آئے تھے، کیونکہ ان کی کتابوں میں تھا کہ رسولِ خاتم آنے والے ہیں لہٰذا یہ اپنا علاقہ چھوڑ کر اس علاقے میں آئے۔ ان کی کتابوں میں نشاندہی موجود تھی کہ کس علاقے میں رسول ﷺ آئیں گے۔ لہٰذا یہ پہلے سے ہی آکر آباد ہوگئے کہ جب رسول ﷺ اس علاقے میں آئیں تو کہیں دیر نہ ہوجائے اور ہم لبیک کہنے والوں میں ہراول دستہ ہوں۔ یہود کے بھی البتہ متعدد قبائل تھے لیکن ہم ان کو ایک برادری شمار کرتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اوس و خزرج جو بت پرست تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مان لیا لیکن جو منتظرین تھے اور العجل العجل کہنے والے، انہوں نے نہیں مانا!

ایسا ہمیشہ سے رہا ہے کہ جب منتظر قوموں کا امتحان ہوتا ہے اور جو العجل العجل کہتے ہیں وہ انکار کردیتے ہیں اور جو مخالف ہوتے ہیں وہ مان لیتے ہیں۔ ان کو بات سمجھ میں آجاتی ہے چونکہ وہ پہلے سے مفروضے بنا کر نہیں بیٹھے ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ جو دین لے کر آئے وہ یہود کے مفروضوں کے مطابق نہیں بیٹھا ہوا تھا لہٰذا انہوں نے کہا کہ یہ تو وہ نہیں ہے جس کا ہمیں انتظار تھا۔

جس طرح ہمارے مفروضے حضرتِ حجتؑ کے ساتھ بالکل غیر ہم آہنگ ہیں، وہ جب تشریف لائیں گے تو وہ ہماری ذہنیتوں کے مطابق بات نہیں کریں گے بلکہ وہ الگ بات کریں گے۔ ہم کچھ اور لیے بیٹھے ہیں جبکہ وہ کچھ اور بات کریں گے، بالکل وہی سماں تکرار ہوجائے گا۔ روایات میں بھی ہے کہ حضرتِ حجتؑ کے خلاف سب سے پہلا گروہ جو مخالفت میں اٹھے گا اور جنگ کرے گا وہ متدین اور مذہبی لوگوں کا ہوگا۔

اہلِ مدینہ کا تجارت کی غرض سے مکہ آنا جانا ہوتا تھا جس دوران وہ رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے آشنا ہوئے تھے۔ انہوں نے واپس جا کر اپنے عمائدین کو بتایا کہ مکّہ کے اندر ایک شخصیت نئی نئی باتیں کرتی ہے جو مسیحیت، یہودیت، بت پرستوں اور دیگر ادیان کی اکثر سنی جانے والی باتوں سے ہٹ کر ہیں۔ اہلِ مدینہ نے باقاعدہ ایک وفد بنا کر بھیجا کہ تفصیل سے پوچھ کر آؤ کیا کہتے ہیں۔ جب وہ آئے اور باقاعدہ طے شدہ ملاقات میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس میں انہوں نے اپنے حالات بتائے کہ مدینہ میں ہم اس مشکل سے دوچار ہیں، ہم اوس وخزرج ہیں، آپس میں دشمنیاں ہیں اور تیسرا گروہ یہود کا ہے۔ ہم اپنے معاشرے کے اندر افراتفری ختم کرنا چاہتے ہیں، امن وامان برقرار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا پیغام کیا ہے؟ حضرتؐ نے ان کو جو پیغام سنایا وہ اُسی عملی آئیڈیالوجی یعنی دینِ مکتبی کا ایک اقتباس تھا۔ اس میں حضرتؐ نے وہ تعلیمات دیں کہ میرا پیغام یہ ہے کہ تم نے مثلاً عقیدہ کیسے رکھنا ہے، خدا کے اوپر ایمان رکھنا

مکتبی خودسازی اور ہے جبکہ خانقاہی خودسازی اور ہے۔ مکتبی خود سازی امت سازی کا مقدمہ ہے۔ صوفیانہ یا خانقاہی خودسازی یہ ہے کہ جس میں انسان ایک بند کمرے میں بیٹھ جائے اور کوئی غلط کام نہ کرے۔ مکتبی خودسازی امت سازی کے لئے ہے یعنی امت کے اندر رہ کر فرد اپنے آپ کو سنبھال سکے۔

ہے، خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کرنی ہے پھر فوراً معاشرتی مسائل پر آ گئے۔ پہلے ان سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور پھر فوراً کہا:

''وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا'' (البقرہ،۸۳)

اور والدین کے ساتھ احسان کرو، لوگوں کے ساتھ معروف کے ساتھ باتیں کرو، ناپ تول میں ایسے کرو، فلاں کام میں ایسے کرو، جب انہوں نے یہ باتیں سنیں تو انہیں اندازہ ہوگیا کہ یہ عملی چیزیں ہیں جن سے ہماری مشکل حل ہوسکتی ہے لہٰذا انہوں نے جا کر اپنے بڑوں سے مشورہ کیا۔ عمائدین نے بھی کہا کہ یہی وہ راہِ حل ہے کہ جس سے ہماری مشکل حل ہوسکتی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے جو مکتب، دستوری دین ان کے سامنے رکھا وہ دستوری دین انہیں ایک خط پر لے آیا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ غیر ہم آہنگ اوس و خزرج کو مکتب نے ہم آہنگ کر دیا۔

''فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ'' (آل عمران،۱۰۳)

''الف''، بہت ہی خوبصورت تعبیر ہے۔ الفت، الف سے نکلا ہے۔ الف عربی زبان میں ہزار کو کہتے ہیں اور عربی زبان میں سب سے بڑا عدد ہزار ہے۔ عربی میں ہزار ایسے ہی لکھا جاتا ہے جس طرح ہم اردو یا انگریزی میں لکھتے ہیں: ایک کا عدد لکھتے ہیں پھر اس کے آگے تین صفر لکھتے ہیں۔ جب یہ تین صفر اس ایک کے ساتھ بلا فاصلہ لکھے جاتے ہیں تو یہ 'الف' یعنی ہزار بن جاتا ہے۔ صفر تنہا کچھ بھی نہیں ہے لیکن یہ صفر جب دوسرے صفر سے مل جاتا ہے اور دوسرا صفر تیسرے صفر سے مل جاتا ہے اور یہ تین صفر جب اس ایک کے ساتھ رابطہ برقرار کرلیں تو ان سے ہزار کی طاقت بن جاتی ہے۔ یہیں سے یہ لفظ الفت بھی عربوں نے نکالا ہے۔ الفت انسانوں کے درمیان رابطے کا نام ہے یعنی انسان اس طرح سے آپس میں مل جائیں جس طرح الف میں وہ صفر ملتے ہیں اور مل کر اس واحد کے ساتھ جڑتے ہیں تو ان کے اندر الفت پیدا ہوتی ہے اور وہ الف بن جاتے ہیں یعنی ان کی قیمت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہزار بن جاتے ہیں۔ اسی لفظ سے انہوں نے الفت نکالا ہے:

''فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ'' (آل عمران،۱۰۳)

جب تم پراگندہ تھے اور کچھ بھی نہیں تھے خدا نے تمہارے اندر الفت پیدا کی اور قریب کیا۔ کس کے قریب کیا؟ وہ ایک کیا ہے، وہ واحد کیا ہے جس کے ساتھ صفر ملیں تو ان کی طاقت اتنی بڑھ جاتی ہے۔ خداوند نے فرمایا:

''فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا'' (آل عمران،۱۰۳)

خدا نے تمہارے درمیان الفت پیدا کردی، یہ مکتب کی قوت ہے کہ غیر ہم آہنگ عناصر، غیر ہم آہنگ امور کو متحد و ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ آج ہماری صورتحال بہت عجیب ہے اور یہ سب کا درد ہے، مثلاً کوئی سے دو مولوی بھی آپس میں متفق نہیں ہیں۔ اس لیے کہ غیر ہم آہنگ ہیں، دین ایک ہی پڑھا ہے، قرآن ایک ہے، سب کچھ ایک ہے لیکن بقول اقبالؒ:

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک!

ہم آہنگی کیلئے فقط علم کافی نہیں

مسلمان اس لیئے ایک نہیں ہیں کہ کعبہ، حرم اور قرآن، یہ سب کچھ ایک مکتب کے طور پر ان کے پاس نہیں ہے۔ کوئی طبقہ آپس میں ہم آہنگ نہیں ہے بلکہ جنہوں نے درسِ ہم آہنگی پڑھا ہوا ہے وہ بھی غیر ہم آہنگ ہیں کیونکہ ان کے پاس مکتب نہیں ہے۔ سب کے پاس ایک موروثی اور تقلیدی دین ہے۔ اگرچہ ان کے پاس علم ہے لیکن صرف علم انسانوں کو متفق و متحد نہیں کرتا۔ علم کے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ پراگندہ اکائیوں کو جوڑ کر ایک کر دے بلکہ یہ طاقت مکتب کے اندر ہے۔ جو توقع ہم علم سے رکھتے ہیں وہ طاقت خدا نے مکتب یا آئیڈیالوجی کے اندر رکھی ہے ورنہ اگر صرف علم کافی ہوتا تو یہود اور دیگر مذاہب کے علماء بہت زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ آج جتنا اختلاف اہلِ علم میں ہے اتنا غیر اہلِ علم میں نہیں ہے کیونکہ ان کے پاس فقط علم ہے، مکتب نہیں ہے۔ اس لیے امام خمینیؒ فرماتے تھے کہ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کسی عریض کمرے میں سو سال اکٹھے رہیں تو کسی جزئی مسئلے میں بھی ان کا آپس میں اختلاف نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ سب اہلِ مکتب ہیں، پیروئے مکتب اور

صاحبِ مکتب ہیں۔انبیاءؑ فقط صاحبِ علم نہیں ہیں، اگر فقط علماء ہوتے تو ایک دوسرے کی اتنی پگڑی اچھالتے کہ سب انبیاء کو پتہ چل جاتا لیکن وہ فقط اہلِ علم نہیں ہیں بلکہ اہلِ مکتب ہیں۔ان کے پاس علم مکتب کی خاطر ہے پس اس وجہ سے ہم آہنگ ہیں۔غیر ہم آہنگ لوگ، مہاجر وانصار صرف مکتب کی وجہ سے ایک ہو سکتے ہیں۔اوس وخزرج مکتب کی وجہ سے ایک ہوئے۔غیر ہم آہنگ امور کو ہم آہنگ کرنے کی طاقت آئیڈیالوجی کے اندر ہے۔

مکتب راہِ روشن

پہلے یہ بھی خصوصیت ذکر کی تھی کہ مکتب کی راہیں روشن ہوتی ہیں یعنی مکتب ہدف رکھتا ہے اور ہدف کی طرف پہنچنے کے راستے مکتب کے لئے بہت روشن وہموار ہوتے ہیں۔وہ مکتب نہیں ہے جس کے پاس ہدف تک رسائی کے لئے راہ نہ ہو اور وہ راہ روشن نہ ہو بلکہ پیچیدہ، تاریک وظلمانی ہو۔مکتب میں ہدف تک پہنچنے کا روشن راستہ موجود ہے۔مکتب میں ماضی وحال کا واضح تجزیہ موجود ہوتا ہے۔مکتب ماضی کا باقاعدہ تجزیہ کرتا ہے، تاریخ کا تجزیہ کرتا ہے، مکتب کے پاس تاریخ عبرت گاہ ہوتی ہے، تاریخ درسگاہ ہے۔کسی جگہ بھی ابہام نہیں ہے۔مکتب کے پاس جواب موجود ہے کہ آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔آئیڈیالوجی کہتے ہی اس کو ہیں جس کے پاس جواب موجود ہو۔ہمیں آج کیوں خبر نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ اس لیئے کہ ہم مکتب کے بغیر چل رہے ہیں۔جو آگاہی مکتب عطا کرتا ہے وہ مکتب ہی سے ملتی ہے، ہمیں نہیں پتہ کہ آج دنیا میں کیا خبر ہے، پاکستان میں کیا ہو رہا ہے اور پاکستان کے قرب و جوار میں کیا ہو رہا ہے۔مسلمانوں کے اندر کیا ہو رہا ہے، بیرونی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔اس کا کوئی تجزیہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

ابھی ہمارے تجزیہ نگار وہی فضلہ خوری کرتے ہیں کہ انٹرنیٹ کی سائٹوں پر گشت کرتے ہیں وہاں سے کسی سے ایک جملہ لیا، کسی سے دوسرا جملہ لیا، کسی سے تیسرا لیا، تجزیہ بنا کر، کنفیوژن پیدا کر کے، ٹی وی پر آکر، ریڈیو پر آکر، منبر پر آکر دوسروں کو منتقل کر دیتے ہیں۔جب ایک قوم کے پاس خود سے حالات کا تجزیہ کرنے کا ذہن نہ ہو، اس کو فضلہ خوری کہا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر مکتب کے اندر جو قوت موجود ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مکتب مستقبل کی پیشین گوئی کرتا ہے اس کو پتہ ہوتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔آئیڈیالوجی اس لیے روشن راستہ ہے کہ مکتب اپنے پیروکاروں کو صاف بتاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

مکتب مستقبل کا پیشگو!

آپ دیکھیں کہ تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وتعلیماتِ آئمہِ اطہارؑ میں یہ حدیث ہے کہ

"سیاتی من بعدزمانٌ"

ہمارے بعد یہ زمانہ آنے والا ہے کہ جس کے اندر یہ ہونے والا ہے، مستقبل قریب میں کیا ہونے والا ہے اور مستقبل بعید میں کیا ہونے والا ہے، یہ مکتب باقاعدہ پیشنگوئی کرتا ہے۔یہ پیشنگوئی بھی غیب گوئی نہیں ہوتی۔مکتب چونکہ واضح اور شفاف راہ ہے اس لئے اس کے اوپر نشاندہی ہوتی ہے۔مثلاً ٹرین کا راستہ معین ہے، جبکہ رکشے کا نہیں پتہ کہ کدھر مڑ جائے گا؟ کس گلی میں مڑ جائے گا، کس گھر میں گھس جائے گا لیکن ٹرین کا پتہ ہے کہ کدھر جائے گی، آپ بتا سکتے ہیں کہ اس ٹرین نے کدھر جانا ہے چونکہ اس کے جانے کی راہ ہی یہی ہے، لہٰذا مکتب کو پہلے پتہ ہوتا ہے کہ حالات کدھر جا رہے ہیں اور ہم نے کدھر جانا ہے۔مکتب میں تمام طبقات وتمام افراد کی فکری جہت مشخص ہوتی ہے۔ہر طبقہ اور ہر فرد معین جہت کے ساتھ حرکت کر رہا ہوتا ہے۔

مکتب دوست اور دشمن میں امتیاز کا معیار

جیسا کہ پہلے کہا تھا کہ مکتب میں دوست ودشمن بالکل واضح اور شفاف ہوتے ہیں۔مکتب کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ اپنے پیروکاروں کو دوست بھی بتائے اور دشمن شناسی بھی کروائے۔باقاعدہ معرفت کروائے کہ یہ تمہارا دوست ہے اور یہ تمہارا دشمن ہے چونکہ عملی طور پر لوگوں کو یہ مشکل بہت پیش آتی ہے کہ دوستوں کو دشمن اور دشمن کو دوست سمجھ لیتے ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ یہ بتانا ہے کہ یہود تمہارے دوست نہیں ہیں، فلاں تمہارے دوست نہیں ہیں، کفار تمہارے دوست نہیں ہیں، مشرک تمہارے دوست نہیں ہیں کیونکہ مسلمان ان کو دوست سمجھتے تھے اور آج بھی ایسا ہی

> **آج کا تقاضہ امت سازی ہے۔آج امت سازی کیلئے تاریخ کی نسبت سب سے زیادہ مناسب حالات موجود ہیں۔شاید تاریخِ اسلام میں عہدِ نبویؐ کے بعد اتنے آمادہ حالات نہ ہوئے ہوں جتنا کہ آج ہیں۔اگر آج ہم امت کی طرف نہ آئے تو پھر وہی خرابیاں پیدا ہوں گی اور ان ساری خرابیوں کے ذمہ دار ہم ہوں گے۔**

ہے۔ مسلمانوں نے آج جس جس کو دوست بنایا ہوا ہے وہ دوست نہیں ہیں، مثلاً پاکستان کے دوست ممالک کی فہرست دیکھیں، اگر یہ سب دوست ہیں تو پاکستان کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں سے ایک دوست سعودی عرب ہے جس نے پورے پاکستان میں آگ لگائی ہوئی ہے، جس نے بھائی کو بھائی سے لڑایا ہوا ہے، جس نے لوگوں کا دین تباہ کر دیا ہے، جس نے مقدس ترین مراکز ویران کر دیے، جس نے قتلِ عام کروا دیا، جس نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ ایک اور دوست پاکستان کا امریکہ ہے، ایک دوست برطانیہ ہے، اس طرح سے اور بھی دوست ہیں۔ مکتب انسان کو یہ بتاتا ہے کہ دوست کون ہیں اور دشمن کون ہیں یعنی دوستی اور دشمنی کا معیار سمجھاتا ہے۔

مکتب کی بنیاد تعلقات نہیں، ضوابط ہیں

مکتب میں روابط و تعلقات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ مکتب تعلقات کی بنیاد پر نہیں ہوتا، تعلقات یعنی رابطے اور رشتے، کہ یہ چچا ہے، یہ ماموں ہے، یہ سالہ ہے، یہ داماد ہے، یہ فلاں ہے، یہ اپنی قوم کا ہے، یہ اپنے قبیلے کا ہے، یہ اپنے علاقے کا ہے، اس بنیاد پر کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ کسی قسم کا غیر مکتبی، غیر نظریاتی تعلق مکتب میں معیار نہیں ہوتا بلکہ مکتب میں معیار واضح اور شفاف قواعد و ضوابط ہیں۔ مکتب میں سارا دارومدار انہیں قواعد و ضوابط کے اوپر ہوتا ہے، اس میں رابطہ دخیل نہیں ہوتا۔

مکتب اپنے پیروکاروں کو انتخاب کا معیار عطا کرتا ہے۔ ان کو ایسے ہی صحراء میں نہیں دھکیل دیتا، پہلے ان کو معیار دیتا ہے کہ تم اس معیار کے تحت زندگی انتخاب کرو، زندگی کا رخ انتخاب کرو، وسائل انتخاب کرو، ہدف انتخاب کرو اور راہ انتخاب کرو۔ انتخاب کے لئے پہلے معیار دیتا ہے۔ یعنی انتخاب کے لئے پہلے ان کو ضروری شعور عطا کرتا ہے اس طرح پیروکارِ مکتب کو ان راہوں کے اختیار کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مکتب کُل حیات کا منصوبہ

یعنی وہ مکتب جس کے تحت امت وجود میں آتی ہے ہم اس مکتب کی خصوصیات پڑھ رہے ہیں کہ ہمیں وہ مکتب ابھی پڑھنا اور سیکھنا ہے۔ مکتب میں کوئی چیز بغیر منصوبہ بندی کے نہیں ہوتی۔ یوں نہیں ہوتا کہ کل کا کل دیکھیں گے۔ یہ غیر مکتبی روش ہے، یہ آبائی روش ہے، یہ رسوماتی روش ہے، یہ بھیڑ چال ہے کہ کل کے کام کل دیکھیں گے۔ مکتب کے پاس پوری زندگی کا منصوبہ ہوتا ہے اور اس منصوبہ میں یہ معین ہوتا ہے کہ کوئی خاص ہدف کتنی مدت میں حاصل کرنا ہے۔ اس ہدف کے لئے اتنے وسائل ہیں، اس ہدف کے لئے اتنی افرادی قوت ہے، اس ہدف کے لئے اس قدر آمادگی چاہیے، غرضیکہ مکتب میں ہر چیز ایک طے شدہ منصوبہ کے اندر ہوتی ہے۔

مکتب تعارضات سے بچاؤ کا ذریعہ

مکتب شخصی سلیقوں پر نہیں چلتا۔ ابھی ہم سلیقوں پر چل رہے ہیں۔ ایک مسجد اور وہاں کا جو مولانا ہے وہ اپنے سلیقے پر، دوسری جگہ کوئی اور سلیقہ، تیسری جگہ کوئی اور سلیقہ، ہر انجمن میں الگ سلیقہ ہے، اس وقت سب کچھ انفرادی سلیقے، انفرادی ذوق و انفرادی رجحانات پر چل رہا ہے۔ ہر آدمی جو بہتر سمجھتا ہے اور جو ذوق و شوق رکھتا ہے اس کے مطابق چل پڑتا ہے۔ چونکہ یہ دنیا اور معاشرہ مختلف افراد سے مل کر بنتا ہے، امت بھی مختلف افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ ان افراد میں انفرادی خصوصیات کی وجہ سے تضاد و تعارض موجود رہتا ہے۔ جب افراد کے اندر انفرادیت آجاتی ہے تو ان کے مابین تعارض و ٹکراؤ یقینی ہو جاتا ہے۔ مکتب ان تعارضات اور اس ٹکراؤ کو حل کرنے کی قوت رکھتا ہے بلکہ یوں کہیں کہ فقط مکتب کے پاس ہی یہ طاقت موجود ہوتی ہے کہ ان تعارضات کو حل کرے، اس ٹکراؤ کو صرف مکتب ہی حل کر سکتا ہے، آئیڈیالوجی حل کر سکتی ہے ورنہ جہاں مکتب نہ ہو وہاں جیل اور پولیس یہ کام کرتے ہیں۔ مکتب تربیت ہی ایسی کرتا ہے کہ جس سے فرد ٹکراؤ سے بچ جاتا ہے، اگر ٹکراؤ ہو بھی جائے تو درگزر کرتا ہے۔ مکتب کا تربیت یافتہ جنگلی نہیں ہوتا۔ جس کی نوبت پولیس تک جا پہنچے وہ یہ سمجھے کہ جنگلی ہے کیونکہ دوسرے فرد کے ساتھ اپنا ٹکراؤ حل نہیں کر سکا۔ تضادات اور ٹکراؤ کو حل کرنے کی قوت فقط آئیڈیالوجی کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔

مکتب کی حاکمیت

معاشرے اور امت کے اندر اصل اقتدار و حاکمیت مکتب ہی کی ہوتی ہے،

> **آئیڈیالوجی ہمیشہ ٹیکنالوجی پر مقدم ہوتی ہے۔ اگر آئیڈیالوجی اور ٹیکنالوجی کی جنگ ہو تو آئیڈیالوجی جیت جاتی ہے، بشرطیکہ حقیقتاً آئیڈیالوجی ہو اور یہ طے شدہ بات ہے۔ اسرائیل کے خلاف حزب اللہ کی شاندار فتح اس کی روشن مثال ہے۔**

انقلاب فقط مکتب کے بطن سے ہی باہر آتا ہے۔ اگر مکتب کے بغیر ہو تو وہ تحریکیں انقلاب نہیں کہلاتیں بلکہ وہ شورشیں اور بغاوتیں ہیں اور ان کے بہت سارے نام ہیں۔ جہاں مکتب اور آئیڈیالوجی موجود نہ ہو وہاں ان کو انقلاب نہیں کہہ سکتے۔ انقلاب کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہوتی ہے۔

افراد فقط اس کا نفاذ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی طاقت افراد کی نہیں ہوتی، طاقت مکتب کی ہوتی ہے۔ ہمارے استاد بزرگوار آیۃ اللہ جوادی آملی دام ظلہ نظریہ ولایتِ فقیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''ولایتِ فقیہ دراصل ولایتِ فقاہت ہے''۔ یعنی وہی بات کہ حاکم مکتب ہے۔ درحقیقت، آئیڈیالوجی حاکم ہے اور افراد مکتب کو نافذ کر رہے ہوتے ہیں۔ حکومت مکتب کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے افراد کے آنے جانے سے کسی بھی شعبے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مکتب ، ایثار گر پیدا کرتا ہے

مکتب اپنے پیروکاروں کو مکتبی اہداف کے لئے تیار کرتا ہے، ان کی خصوصی تربیت کرتا ہے اور اس خصوصی تربیت سے مراد یہ ہے کہ مکتب اپنے پیروکاروں کو مفاد پرست نہیں بلکہ ایثار گر بناتا ہے۔ مکتبی کبھی بھی مفاد پرست نہیں ہوتا، مکتبی ہمیشہ ایثار گر ہوتا ہے۔ مکتبی اور غیر مکتبی کی پہچان انہی اقدار سے ہوتی ہے، نعروں سے نہیں ہوتی۔ ایثار بھی کس قسم کا؟ این جی اوز جیسا ایثار نہیں۔ این جی اوز کا ایثار یہ ہے کہ مثلاً اگر بلی روشن دان میں پھنس جائے تو بلی کی نجات کیلئے عالمی سطح پر تحریک شروع کروا دیتے ہیں اور انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے خیر خواہ اور بڑے ہی ہمدرد ہیں۔ مکتب یہ این جی اوز والا ایثار نہیں سکھاتا۔ آج کل جو ہمدردی موجود ہے کہ تھوڑی سی مٹھائی بانٹ دی، تھوڑا سا افطار تقسیم کر دیا، راشن بانٹ دیا، یہ ایثار نہیں بلکہ جو ایثار مکتب سکھاتا ہے اور اپنے پیروکاروں کے اندر پیدا کرتا ہے وہ ہدف پر قربان ہونے کا جذبہ ہے۔ اسی کا نام ایثار ہے۔ مکتبی، جانثاری وفداکاری سے بالکل دریغ نہیں کرتے۔ مکتبی کے لئے سب سے آسان کام مکتب کی راہ میں جان دینا ہوتا ہے۔

مکتب ، مسؤلیت ساز

مکتب مسئولیت آور و مسئولیت ساز ہے۔ مکتب ہمیشہ یعنی روزانہ مسئولیتیں نکالتا ہے اور سونپتا ہے۔ مکتب ہر روز نئی مسئولیت اور نئی ذمہ داری سونپتا ہے یعنی افراد کو ذمہ دار بناتا ہے۔ یوں نہیں کہ کسی فرد کو ذمہ دار بنا کر اسے کوئی ذمہ داری دے دی کہ اب تمام عمر یہی کام کرتے رہو، اسے پیشہ کہتے ہیں۔ پیشے اور ذمہ داری میں فرق ہے۔ مکتب جب کسی انسان کو ذمہ دار بناتا ہے تو اس کے اندر احساسِ ذمہ داری و احساسِ مسئولیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ شخص اب ہر قسم کی ذمہ داری کے لئے تیار ہے۔ مکتب کے اندر روز نئی ذمہ داریاں سامنے آتی ہیں، ایک دن ایک کام کرنا ہے دوسرے دن دوسرا کام کرنا ہے۔ آپ کو ایک دن جہاد کرنا ہے، ایک دن پیداوار بڑھانی ہے، ایک دن تعلیم کا کام کرنا ہے، ایک دن آپ کو کچھ اور کرنا ہے، یعنی مکتب جو ذمہ دار انسان بناتا ہے وہ آج کی اصطلاح میں آل راؤنڈر یا ہر فن مولا ہوتا ہے یعنی وہ ہر کام کے لئے تیار ہوتا ہے۔ وہ پیشہ ور ہے جو صرف ایک کام کر سکتا ہے، دوسرا نہیں کر سکتا۔ جبکہ مکتب کا پروردہ ہر کام کے لئے تیار ہے لہٰذا آپ دیکھیں کہ خود امیر المومنینؑ نے ہر کام کیا: خالص گھریلو کام یعنی برتن دھونا، جھاڑو دینا، بچے سنبھالنا وغیرہ بھی کیا، حکومت بھی کی، جنگ بھی لڑی، امامت بھی کی، باغ بھی لگائے، مزدوری بھی کی، اپنے جوتے کو بھی اپنے ہاتھوں سے پیوند لگایا، غرض کون سا کام تھا جو امیر المومنینؑ نے اپنے ہاتھ سے نہیں کیا؟ مکتب ایک انسان کو اس طرح تیار کرتا ہے کہ اس کو کسی وقت کوئی بھی کام پیش آجائے تو اس کے اندر آمادگی اور قابلیت ہو کہ فوراً وہ کام شروع کر دے۔ اس کو میدانِ جہاد سے نکال کر تعلیم پر لگا دو تو وہیں سے تعلیم شروع کر دے گا، یہ نہ کہے کہ جی میں تو صرف پڑھا سکتا ہوں، میں تو صرف نماز پڑھا سکتا ہوں، میں صرف تسبیح پڑھا سکتا ہوں، میں صرف نعرہ لگا سکتا ہوں، میں صرف یہ کر سکتا ہوں۔ ایسا انسان مکتبی نہیں ہوتا بلکہ مکتبی آل راؤنڈر ہوتا ہے۔

مکتب، دافعِ احساساتِ کاذب

جب مکتب اپنے پیروکار کے اندر فداکاری پیدا کرتا ہے تو اسکی یہ ایثار گری اپنے پیروکار کے اندر سے کاذب احساسات ختم کر دیتی ہے۔ ابھی ہم بہت سارے کام کرتے ہوئے عار محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کو مسجد میں جھاڑو دیتے ہوئے عار محسوس ہوتی ہے تو یہ کاذب عار ہے جبکہ مکتبی آدمی کو یہ کام کرتے ہوئے عار محسوس نہیں ہوتی کیونکہ یہ کاذب و جھوٹی عار ہے۔ مکتب سچی عار سے بچاتا ہے، ننگ وذلت کی طرف نہیں جانے دیتا لیکن ساتھ ہی کاذب

معیارات بھی مٹا دیتا ہے۔ ابھی ہم کاذب احساسات میں مبتلا ہیں ۔عزت کا معیار کاذب ہے جو ظاہری رسومات میں انجام پاتی ہے۔ مکتب انسان کو جان قربان کرنے سے بھی بڑی فداکاری یعنی اپنی شخصیت بھی قربان کرنا سکھاتا ہے۔ مکتب قربانی مانگتا ہے، قربانیوں کے بغیر کوئی آئیڈیالوجی نہ بنتی ہے اور نہ ہی پھیلتی ہے۔ جو لوگ اپنی شخصیت کو بت بنا کے بیٹھے ہیں کہ ہمیں کوئی برا نہ کہے وہ مکتبی نہیں ہوسکتے، مکتبی ہوتے ہی وہ ہیں کہ جن کو اس چیز کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کون انکا مخالف ہے اور کون حامی ہے، ساری دنیا اگر مخالف ہوتی ہے تو ہوجائے، ساری دنیا حامی ہوتی ہے ہوجائے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ نہیں ہے کہ اگر چند افراد اس کے ساتھ ہوں تو وہ کہے کہ ٹھیک ہے اب فضا مناسب ہے اور چند لوگ ناراض ہوجائے تو مایوس ہوجائے۔ مکتب کے تربیت یافتہ کے لئے کبھی رات نہیں ہوتی، کبھی بھی تاریکی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے امید کی روشنی ہمیشہ زندہ ہے۔

> **مکتب کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ مکتب کے اندر غیر ہم آہنگ عناصر، افراد، گروہ اور نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی قوت موجود ہوتی ہے۔ آج ہماری صورتحال بہت عجیب ہے اور یہ سب کا درد ہے، مثلاً کوئی بھی دو مولوی آپس میں متفق نہیں ہیں، اس لیے کہ غیر ہم آہنگ ہیں۔**

مکتب، عشق اور خود احتسابی کی درسگاہ

مکتب انسان کو اپنے ہدف کا عاشق بنا دیتا ہے۔ پیشہ ورانہ نہیں، بلکہ عاشقانہ راہ طے کرواتا ہے۔ پیروئے مکتب درحقیقت عاشق ہوتا ہے۔ مکتب کے اندر اقدار محور ہوتی ہیں۔ مکتب اعمال نہیں دیکھتا بلکہ اقدار دیکھتا ہے اور مکتب کے اندر اقدار کا ایک باقاعدہ جامع نظام موجود ہوتا ہے۔ مکتب انسانوں اور اپنے پیروکاروں کو ہمیشہ نامناسب و ناموزوں حالت کے خلاف اکساتا ہے۔ شہید مطہریؒ کا جملہ ہے "مکتب سب سے پہلے انسان کو اپنے خلاف بغاوت کرواتا ہے" کیونکہ انسان اپنے آپ سے راضی رہتا ہے، خودخواہ، خودغرض انسان اپنے آپ سے راضی ہے۔ مثلاً اپنی ہر برائی پر بھی راضی ہے، اپنی ہر بری عادت پر بھی راضی ہے۔ مکتب یہ حالتِ رضایت ختم کرتا ہے اور انسان کو اپنے خلاف اکساتا ہے۔ اس کو اپنے خلاف پہلا انقلابی بناتا ہے۔ اعتراض کرواتے اوپر کہ یہ کوئی سوچ ہے جو میری ہے، یہ کوئی حالت ہے جو میری ہے، یہ کوئی عادت ہے جو میری ہے، میں کیا ہوں؟ آیا واقعاً تسلی بخش ہوں؟ خودخواہ انسان اپنی ہر چیز سے راضی ہوتا ہے، خودغرض و خودبین انسان اپنے ہر کام سے راضی رہتا ہے۔ کسی کو اگر گالی دے تو اس پر بڑا ہی خوش ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں نے گالی دے کر تسبیح سے زیادہ بڑا کام کیا ہے۔ اگر کسی کی توہین کرے تو سمجھتا ہے شجاعت ہے یعنی خودخواہ انسان اپنے گناہوں کو اچھے نام دیتا ہے۔ شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ مکتب سب سے پہلے انسان کو اپنے خلاف اکساتا ہے اور یہ مرحلہ جب طے کر لے تو پھر مکتب انسان کو بیرونی اجتماعی حالت کے خلاف اکساتا ہے۔ اس کے خلاف احتجاج و اعتراض کرواتا ہے پس اس کو سراپا احتجاج بنا دیتا ہے۔ مکتب ہمیشہ اپنے سے ہی شروع کرتا ہے۔ مکتبی اور غیر مکتبی میں فرق یہ ہے کہ غیر مکتبی مبلغ پہلے دوسروں سے شروع کرتا ہے یعنی پہلے دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور اپنی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مکتبی انسان اصلاح کا آغاز ہمیشہ اپنے آپ سے آغاز کرتا ہے۔

مکتب، ایک مسلسل نبرد

مکتب اپنے پیروکار کو ہمیشہ نبرد اور جنگ میں رکھتا ہے۔ نبرد سے باہر نہیں آنے دیتا فقط میدان بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھی جنگ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے کہا اس قوم کو مرحبا جو جہادِ اصغر سے لوٹے ہیں اور جہادِ اکبر میں داخل ہونے والے ہیں۔ قوم ڈر گئی کہ یہ چھوٹی جنگ تھی جس سے فارغ ہو کر ہم آئے ہیں ابھی بڑی جنگ رہتی ہے لیکن یہاں رسول اللہ ﷺ کی مراد جہاد بالنفس تھا۔ یہ مکتب کا طریقۂ کار ہے کہ کبھی بھی فرد کو ستیز و نبرد سے باہر نہیں آنے دیتا اور ہمیشہ اس کو اسی حالت میں رکھتا ہے تاکہ اس کی آمادگی باقی رہے۔ ممکن ہے مکتب ایک ہی وقت میں اپنے پیروکار کو دس محاذوں پر نبرد کروا رہا ہو: جہالت کے خلاف، خرافات کے خلاف، ستم کے خلاف، ظلم کے خلاف، ناہمواری کے خلاف، اپنے خلاف، اپنی بدکرداری کے خلاف، اپنی بدخلقی کے خلاف! پس مکتب ہمیشہ حالتِ نبرد میں رکھتا ہے، کبھی بھی باہر نہیں آنے دیتا اور ظاہر ہے کہ جو مجاہد

ہمیشہ حالتِ ستیز میں ہو، ہمیشہ حالتِ نبرد میں ہو وہ اہلِ فن کے بقول بہت زبدہ ہوتا ہے، یعنی بہت ماہر اور آمادہ انسان ہوتا ہے۔

مکتب، ایک انتخابی راہ

مکتب کو آگاہانہ اور شعوری طور پر انتخاب کرنا پڑتا ہے کیونکہ مکتب موروثی نہیں ہوتا۔ مکتب انسان وراثت میں نہیں لیتا، نہ ماں باپ سے وراثت میں لیتا ہے، نہ معاشرے سے وراثت میں لیتا ہے اور نہ اساتذہ سے وراثت میں لیتا ہے۔ مکتب انسان معلم سے سیکھتا ہے، مربی سے سیکھتا ہے، رہبر و راہنما سے سیکھتا ہے لیکن انسان اس کو انتخاب آگاہانہ طور پر اور پوری بصیرت کے ساتھ کرتا ہے۔ مکتب تقلیدی یا موروثی نہیں ہوتا۔ رسوماتی دین موروثی ہے جو ہم آباؤ اجداد اور دوسروں سے لیتے ہیں۔

مکتب مانع خرافات

مکتب میں کسی شعبے کا خلاء نہیں ہوتا: نہ نظام کا خلا، نہ قانون کا خلا، نہ ضابطے کا خلا، نہ عمل کا خلا، نہ فریضے کا خلا، نہ ذمہ داری کا خلا اور نہ حق کا خلا لہٰذا وہ امور مثلاً خرافات، بدعات وغیرہ جو عموماً معاشرے میں پیدا ہوجاتے ہیں وہ مکتب کی موجودگی میں پیدا نہیں ہوتے۔ یہ خرافات و بدعات مکتب کی غیر موجودگی میں سر اٹھاتی ہیں۔ جہاں مکتب یا آئیڈیالوجی موجود ہو وہاں خرافات نہیں ہوتیں، یہ بہترین علامت ہے یہ دیکھنے کیلئے کہ آیا کسی معاشرے میں مکتبی حالت موجود ہے یا نہیں۔ پس خرافات کی سطح دیکھ لیں کہ اس معاشرے کے اندر کتنی خرافات ہیں، جتنی خرافات زیادہ ہوں گی اس کا مطلب ہے کہ معاشرہ مکتب سے بہت دور ہے۔

مکتبی خود سازی، مقدمۂ امت سازی

مکتبی خودسازی امت سازی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ مکتبی خودسازی اور ہے جبکہ خانقاہی خودسازی اور ہے۔ مکتبی خودسازی امت سازی کا مقدمہ ہے۔ صوفیانہ یا خانقاہی خودسازی یہ ہے کہ جس میں انسان ایک بند کمرے میں بیٹھ جائے اور کوئی غلط کام نہ کرے۔ مکتبی خودسازی امت سازی کے لئے ہے یعنی امت کے اندر رہ کر فرد اپنے آپ کو سنبھال سکے۔ مکتب اس لئے انسان کی خودسازی کرتا ہے کہ وہ امت کے ساتھ منسلک رہ کر اپنے آپ کو سنبھال سکے اور اپنا کردار ادا کر سکے۔

امت سازی کا مرحلہِ اوّل: اجتماع در مکتب

امت سازی کے لئے قرآن نے پہلا مرحلہ یہ ذکر کیا ہے کہ لوگ دین کے گرد جمع ہوں لیکن وہ دین سے تمسک بھی کریں۔ سارے دین کے دائرے میں جمع ہوں، دین کے دائرے میں پروئے جائیں اور دین کے علاوہ کسی چیز میں شراکت نہ ہو۔ اگر دین کے علاوہ کسی چیز میں شراکت ہوئی تو وہ امت نہیں ہوں گے۔ وہ قوم، قبیلہ، برادری، پارٹی یا کچھ اور ہوں گے لیکن وہ امت نہیں ہوں گے اور دین بھی ایسا جو زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان میں قابلِ تمسک ہو۔ ایسا قابلِ تمسک دین، دستوری دین، مکتبی دین یا آئیڈیالوجی کہلاتا ہے۔ وہ دینی آئیڈیالوجی جو انسانوں کو اکٹھا کرسکتی ہے اس کی چند خصوصیات ذکر ہوئیں لیکن آج یہ کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔ اگر آپ پوچھیں کہ کہاں ہیں یا کس کتاب کو پڑھیں جس میں آئیڈیالوجی موجود ہو تو جواب یہی ہوگا کہ کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ خدا رحمت کرے شہید مطہریؒ پر کہ انہوں نے دین کی بطور آئیڈیالوجی یا مکتب تدوین کرنا شروع کی تھی لیکن شہادت نے مہلت نہیں دی اور وہ کام ادھورا رہ گیا جس کی تکمیل کی ضرورت ہے۔ وہ ابتدائی کام تھا اور اس کو پختہ تر کرنے کی ضرورت ہے۔

انسان کے اندر پہلے یہ احساس موجود ہو کہ کیا پڑھنا ہے۔ ایک طالب علم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے کیا پڑھنا ہے، اس کو پڑھ کر کیا کرنا ہے اور اس کو کیا بنانا ہے؟ ابن سینا کو خدا نے بہت صلاحیت دی تھی جس کی بدولت انہوں نے بہت سے اچھے کام بھی سرانجام دیئے۔ از جملہ، وہ اور بہت کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اور سرجن بھی تھے۔ انہوں نے خدا کی دی ہوئی صلاحیت کے تحت خود سے ہی سارا کچھ سیکھا ہوا تھا۔ ابنِ سینا سے صدر الحکیم، صدر المتألھین ملا صدرا نے ایک مرتبہ شکوہ کیا کہ خدا نے آپ کو جو صلاحیت دی تھی، اب یہ ملا صدرا کے الفاظ ہیں ابنِ سینا کے لئے، کہ یہ اتنی عظیم صلاحیت جو خدا نے آپ کو دی تھی جسے آپ نے بشریت کی خدمت میں استعمال کیا اگرچہ بشر کی خدمت کی ہے لیکن آپ اس سے بڑا کام کر سکتے تھے اور وہ یہ تھا کہ بشر کے لئے مکتب و آئیڈیالوجی تدوین کرتے لیکن آپ نے اکثر وقت

مکتب کو پہلے پتہ ہوتا ہے کہ حالات کدھر جا رہے ہیں اور ہم نے کدھر جانا ہے۔ مکتب میں تمام طبقات و تمام افراد کی فکری جہت مشخص ہوتی ہے۔ ہر طبقہ اور ہر فرد معین جہت کے ساتھ حرکت کر رہا ہوتا ہے۔

مکتب کے پاس پوری زندگی کا منصوبہ ہوتا ہے اور اس منصوبہ میں یہ معین ہوتا ہے کہ کوئی خاص ہدف کتنی مدت میں حاصل کرنا ہے۔ اس ہدف کے لئے اتنے وسائل ہیں، اس ہدف کے لئے اتنی افرادی قوت ہے، اس ہدف کے لئے اس قدر آمادگی چاہیئے، غرض یہ کہ مکتب میں ہر چیز ایک طے شدہ منصوبہ کے اندر ہوتی ہے۔

طبابت کو دے دیا۔ خدا نے یہ ساری صلاحیت اس لیے نہیں دی تھی کہ بشر کا پیشاب ٹیسٹ کرکے بشر کی خدمت کرو۔ اتنی بڑی صلاحیت اس کام کے لئے نہیں دی تھی کیونکہ یہ کام تو معمولی صلاحیت والا بھی کرسکتا ہے۔ البتہ یہ کام بھی ضروری ہیں لیکن اس کے لئے ابنِ سینا نہیں چاہیئے بلکہ ایک معمولی آدمی بھی یہ کام کرسکتا ہے۔ ابنِ سینا بڑے کام کرے۔ جیسے ابنِ سینا خود کہتے ہیں کہ آئیڈیالوجی، نبی اور رہبر و راہنما کا ہونا کہیں زیادہ ضروری ہے ان چیزوں کے لئے جو خدا نے انسان کو عطا کی ہیں پس حتماً خدا نے یہ اہتمام کیا ہے۔ یہ ابن سینا کی وجودِ شریعت پر دلیل ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ امت سازی کے لئے آئیڈیالوجی کے بعد کون سے ارکان ہیں اور کون سے مراحل ہیں جن کے طے کرنے سے قرآن فرماتا ہے کہ آپ امت بن سکتے ہو اور امت بنو؟

بقیہ: ہمِ حسینؑ و غمِ حسینؑ

غم کا وارث مانگ رہے ہیں۔

"ھل من ذابٍ یذب عن حرم رسول اللہ ﷺ"

کوئی ہے وارثِ غمِ حسینؑ جو حسینؑ کا غم آکر اُٹھائے، حاملِ غمِ حسینؑ بن جائے۔

غمِ حسینؑ اور اهلبیتؑ کے مصائب!

حسینؑ نے بہت غم اُٹھائے اس ایک غم کو باقی رکھنے کیلئے جو ساری اُمت کے دل میں مرگیا تھا مگر حسینؑ کے دل میں زندہ تھا۔ حاجیوں کے دل میں مرگیا تھا، نمازیوں کے دل میں مرگیا تھا، زائرین کے دل میں مرگیا تھا، رسوماتیوں کے دلوں میں مرگیا تھا، یہ غم صرف حسینؑ کے دل میں زندہ تھا اس لئے صرف حسینؑ آئے اور وہ ۷۲ آئے جن کے دلوں میں یہ غم زندہ تھا، وہ بہتر آئے اور اس راہ میں پھر ہزاروں غم اور دیکھے۔

اُن غموں میں سے ایک غم جو جنابِ زین العابدینؑ کیلئے بہت شدید غم بنا۔ سیدالساجدینؑ سے جب لوگ پوچھتے مولاؑ! کونسی سخت منزل پیش آئی؟ بس رو کر کہہ دیتے شام، شام، شام۔ شام بڑی سخت منزل تھی، بڑے غموں کی جگہ تھی شام، کربلا کے غم اتنے شدید نہیں تھے جتنے شام کے غم تھے۔ جب دربارِ یزید میں بیبیوں کو اور آلِ رسول ﷺ کو لے جایا گیا، رسیوں میں باندھ کر دربار سجا کر نشیوں کو نشے تقسیم کرکے پلا کر حکم دیا گیا کہ آلِ رسول ﷺ کو لے آئیں، آلِ رسول ﷺ کو ایک قطار میں اندر لایا گیا، آکر چاروں طرف لوگ بیٹھے ہیں درمیان میں آلِ رسول ﷺ کو کھڑا کردیا گیا، کھڑا کرکے یزید پوچھتا ہے میں نے سنا تھا حسینؑ کی ایک بہن تھی جس کا نام زینب سلام اللہ علیہا تھا، آیا کربلا میں ماری گئی ہے یا اسیر ہوکے شام آگئی ہے؟ ایک لعین نے اشارہ کیا کہ کربلا میں ماری نہیں گئی اسیر ہوکے شام آگئی ہے۔ یہی غم سید سجادؑ تھا، جب تک سید سجادؑ زندہ رہے وہ منظر دربار کا جب یاد آجاتا، جب بی بی دربار میں گئی منظر دیکھا دربار کا پکار کر فرماتی ہیں، ہمارے اُستادِ بزرگوار حضرت آیت اللہ جوادی آملی اکثر یہ فرمایا کرتے ہیں کہ یہ ایک جملہ عزاداروں کیلئے قیامت تک رونے کیلئے کافی ہے، یہ بنت علی علیہ السلام کا ایک جملہ، بنت زہراء سلام اللہ علیہا کا ایک جملہ کہ جب دربارِ شام میں گئی چاروں طرف بی بی نے جب نگاہ دوڑائی اور اُس کے بعد ایک جملہ کہا، کہا آیا تم میں کوئی مسلمان موجود ہے؟ آیا میں مسلمانوں کے مجمع میں کھڑی ہوئی ہوں؟ آیا یہ رسول اللہ ﷺ کا کلمہ پڑھنے والے ہیں؟ یہ رسول اللہ ﷺ کے کلمہ گو کس کو دیکھ رہے ہیں۔ میں رسول اللہ ﷺ کی بیٹی ہوں جس کا تم کلمہ پڑھتے ہو آیا کوئی موجود ہے؟ جب یزید کو بتایا گیا کہ وہ ماری نہیں گئی اسیر ہوکے شام آگئی ہے، اُس لعین نے نشاندہی کی، کیا بتایا؟ کہا وہ ایک بوڑھی خاتون کے کندھے پر ماتھا رکھ کر کھلے بالوں والی جس کے ہاتھ پس گردن بندھے ہیں جو خاتون سر ٹیک کر کھڑی ہے وہی حسینؑ کی بہن زینب سلام اللہ علیہا ہے۔ بس یہ جملہ نکلنا تھا سید الساجدین علیہ السلام کا غم ابدی ہوگیا، سرمدی ہوگیا، پورے دربار کی نگاہیں اُٹھیں، یزید کی نگاہ اُٹھی اُس وقت سید سجادؑ نے یہ مرحلہ کیسے برداشت کیا ہوگا؟ امامؑ جب بھی شام کا نام سنتے کھڑے ہوکر فریاد کرتے، ہائے شام!

امت سازی ۷

از نظر قرآن

گروہ معارف

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ" يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ" عَظِيْمٌ"" (سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

امت سازی، دین کا بنیادی ترین فریضہ:

قرآن مجید کی نظر میں پیروانِ اسلام کیلئے سب سے اہم ترین فریضہ امت بنانا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو یہ فریضہ متروک ہی نہیں بلکہ فراموش شدہ بھی ہے جس سے مسلمان مکمل طور پر ناآگاہ اور دور ہیں۔ یہ فریضہ انجام نہ پانے کی وجہ سے مسلمان زوال کا شکار ہوئے ہیں اور آج اتنی بڑی کثرت میں ہونے کے باوجود حقارت و ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس حقارت پر راضی بھی ہیں۔ مسلمانوں کیلئے حقارت سے نکلنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ فرائض دینی پر عمل ہو اور ان کی بنیاد پر اپنے آپ کو دوبارہ زندہ کریں جن میں پہلا اور اہم ترین فریضہ امت بنانا ہے۔ امت سازی کے لئے قرآن مجید نے باقاعدہ راہنمائی و ہدایت کی ہے اور اسی ہدایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عجیب و غریب قوم اور معاشرے کو امت میں بدل دیا ہے۔

ظہورِ اسلام سے پہلے مکہ اور مدینہ، ثقافتی، علمی، مذہبی اور اقتصادی طور پر دنیا کے سب سے پسماندہ ترین خطے تھے لیکن اسی خطے کے اندر آپؐ نے قرآنی اصولوں اور قرآنی راہنمائی کے تحت ایک نمونہ امت تشکیل دی۔ آج یہ اصول ہمارے پاس بھی موجود ہیں اور ایک لحاظ سے جو اصول قرآن مجید میں ذکر کیے گئے ہیں ہمارے لئے محض تجریدی نہیں بلکہ تجرباتی بھی ہیں۔

تجریدی وتجربی امور:

جو امور فقط ذہنی ہوں، جن پر دلیل قائم کی جاسکتی ہو، جن کی وضاحت کی جاسکتی ہو لیکن جن پر تجربہ نہ کیا جاسکتا ہو وہ تجریدی امور کہلاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تجربی امور ہیں، تجربی امور وہ ہیں جنہیں انسان آزما سکتا ہے، جن پر عمل کرسکتا ہے اور جن کا نتیجہ دیکھ سکتا ہے۔ قرآنی ہدایات محض تجریدی نہیں بلکہ تجربی ہیں، اگرچہ قرآن میں تجریدی اصول بھی موجود ہیں لیکن ان کے اوپر بنائی گئی عمارت تجربی ہے لہٰذا امت سازی کے لئے قرآنی اصول تجربہ شدہ بھی ہیں یعنی ان پر عمل کرکے باقاعدہ ایک امت وجود میں آچکی ہے اور اس امت کے کارنامے تاریخ کے حافظے میں محفوظ ہیں جن میں سے بعض کی طرف قرآن نے بھی نشاندہی کی ہے۔

امت سازی کا فریضہ انجام نہ پانے کی وجہ سے مسلمان زوال کا شکار ہوئے ہیں اور آج اتنی بڑی کثرت میں ہونے کے باوجود حقارت و ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس حقارت پر راضی بھی ہیں۔ مسلمانوں کیلئے حقارت سے نکلنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ فرائضِ دینی پر عمل ہو اور ان کی بنیاد پر اپنے آپ کو دوبارہ زندہ کریں جن میں پہلا اور اہم ترین فریضہ امت بننا ہے۔

مراحلِ امّت سازی:

قرآن مجید کے مطابق امت سازی ایک ایسا عمل ہے جس کے کئی مراحل ہیں، کوئی بھی معاشرہ یا قوم ان مراحل سے گزر کر امت یا امت سازی کے مرتبے پر پہنچتی ہے۔ پس ان مراحل کی شناخت ضروری ہے کہ کن مراحل سے گزر کر انسان امت کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔

۱۔دائرۂ دین میں اجتماع:

قرآن مجید کے مطابق امت وہ اجتماع ہے جو دین کے محور میں جمع ہو اور جن میں دین، مکتب اور آئیڈیالوجی کے علاوہ کوئی اور چیز وجہ اشتراک تو ہو لیکن وہ وجہ اشتراک محور نہ ہو مثلاً ایک قبیلے یا ایک علاقے کے لوگ ہوں لیکن ان کے اجتماع کا سبب علاقائیت یا قبیلہ نہ ہو بلکہ مکتب نے انہیں اکٹھا کیا ہوا ہو۔ بعض اوقات بہت ساری چیزیں انسانوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں لیکن یہ مشترک چیزیں محور نہیں ہوتیں یا یوں کہیں کہ ہر مشترک چیز کو مرکزیت حاصل نہیں ہوتی مثلاً انسانوں کے درمیان بہت ساری چیزیں مشترک ہیں لیکن انسان ان کو مدارِ وحدت قرار نہیں دیتے جیسا کہ سب حضرت آدمؑ وحوا کی اولاد ہیں لیکن اس چیز کو معیارِ وحدت قرار نہیں دیتے ہیں، کہیں بھی انسان محض آدمیت کی وجہ سے اکٹھے نہیں ہوتے۔ پس کسی صفت کا مشترک ہونا ایک نکتہ ہے اور اس مشترک چیز کو محورِ وحدت قرار دینا اور اس کے گرد جمع ہونا یہ ایک الگ نکتہ ہے۔ پس قرآن مجید کے مطابق پہلا امر یہ ہے کہ امت اس اجتماع سے وجود میں آئے گی جس کا محور مکتب ہو۔ یہ بھی توجہ طلب نکتہ ہے کہ اگر دینِ رسوماتی، دینِ موروثی اور دینِ تقلیدی نکتۂ اشتراک واقع ہو تو اس سے امت وجود میں نہیں آتی جیسا کہ ابھی مسلمانوں کے درمیان کچھ عقائد، اعمال اور رسومات مشترک ہیں لیکن ان مشترکات کے باوجود امت نہیں ہیں۔ پس امت بننے کے لئے دینِ مکتبی یا آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے۔

۲۔امت سازی کا نظریاتی مرحلہ:

امت سازی کا پہلا مرحلہ جب مکتب کی بنیاد پر شروع ہوتا ہے یعنی جب یہ عملی شکل اختیار کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا پہلا مرحلہ نظریاتی ہے اور اگر نظریاتی مرحلہ طے نہ ہو تو اگلا عملی مرحلہ ہرگز شروع نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کی راہنمائی بھی اسی بات پر ہے اور ہدایت کا محور بھی یہی ہے کہ امت سازی نظریاتی مرحلے سے آغاز کریں۔ سیرتِ رسول اللہ ﷺ بھی اسی بات پر گواہ ہے کہ آپؐ نے بھی امت سازی کا کام نظریاتی مرحلے سے شروع کیا ہے۔

مکتبی دین کی شناخت:

انسان کی زندگی کے لئے آئیڈیالوجی ایک دینی، الٰہی اور عملی منشور یا دستور ہے جس میں ایک جامع اعتقادی اور نظریاتی نظام موجود ہے اور اس کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق نظام، قوانین و احکام بھی موجود ہیں یعنی اس کے اندر اقدار کا ایک پورا اپنا منظّم نظام پایا جاتا ہے۔ ہمیں اب اس آئیڈیالوجی سے آشنا ہونا ہے، ہمارے ذہن میں جو دین کی تصویر بیٹھی ہوئی ہے یہ مکتب نہیں ہے، ہم نے اس کو اخذ کرنا ہے کہ مکتبی اور دستوری دین کیا ہوتا ہے جس پر ہم عمل کر سکیں۔

آئیڈیالوجی کا پہلا مرحلہ نظریاتی واعتقادی مرحلہ ہے اور امت سازی کا پہلا مرحلہ بھی نظریاتی مرحلہ ہے۔ نظریاتی مرحلہ جس کو ہم اعتقادی مرحلہ کہہ سکتے ہیں اس میں اعتقاد کی بنیاد پر امت کا ڈھانچہ و عمارت رکھی جاتی ہے۔ نظریے میں انسان کو ایک ضروری آگہی کی ضرورت ہے جس کو ہم نظریہ کہیں گے۔ انسان کو جزمی اور یقینی آگہی کی ضرورت ہے کیوں کہ اس مرحلے میں انسان کے لئے بہت ساری چیزوں کا واضح ہونا ضروری ہے اگر اس مرحلے میں وہ اصول وہ بنیادیں واضح اور روشن نہ ہوں اس وقت تک امت کا اگلا مرحلہ طے نہیں ہوسکتا اور ممکن ہی نہیں ہے۔

علم کلام اور امت سازی:

وہ آگہی جو نظریاتی مرحلے میں انسان کو درکار ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی

خلقت اور کائنات کے بارے میں ضروری آگہی ہونی چاہئے تاکہ کام اگلے مرحلے میں داخل ہوسکے۔ نظریاتی مرحلہ، آگہی کا مرحلہ اور باقی سارے مراحل تھے لیکن تدریجاً اس نے اور شکل اختیار کرلی ہے مثلاً اس وقت ہمیں جس سے سروکار ہے وہ اعتقادی مرحلہ ہے۔ ہم عقائد کے نام پر یا اصولِ دین کے نام پر علمِ کلام پڑھتے ہیں، علمِ کلام میں بھی وہی نظریاتی باتیں ہی ہوتی ہیں جو امت سازی کا پہلا مرحلہ ہے لیکن جس روش کے ساتھ علمِ کلام ان مسائل کو پیش کرتا ہے وہ امت سازی کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہے، جس انداز سے علمِ کلام ان مسائل کو اٹھاتا ہے یا جس انداز سے علمِ کلام ان مسائل کو پیش کرتا ہے وہ امت سازی کی طرف نہیں جاتے بلکہ فرقہ سازی کے لئے اچھے ہیں لہٰذا علمِ کلام پر اکتفاء نہ کیا جائے مثلاً علمِ کلام میں جو کتابیں موجود ہیں اگر وہ مرحلہ ہم اعتقادی طور پر طے کریں گے تو اس کے بعد عملی مرحلۂ امت سازی میں داخل ہوجائیں گے۔ علمِ کلام میں جو موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں وہ وہی نظریاتی مراحل ہیں، انہیں کو امت سازی کے پہلے مرحلے کے طور پر طے کرنا ہے یعنی وہ ضروری آگہی جو انسان کو درکار ہے وہ انہی موضوعات کے بارے میں ہے لیکن سطحِ آگہی، طریقۂ آگہی، کیفیتِ آگہی اور درجۂ آگہی درکار ہے جو علمِ کلام میں نہیں ہے۔

علمِ کلام و علمِ فقہ کے کمزور پہلو:

علمِ کلام میں ہم جو کچھ پڑھتے ہیں اس کو سمجھتے ہیں، دلیل دیتے ہیں اور امتحان دے کر پاس ہوتے ہیں پھر اس کے بعد تحقیقات اور مناظرے کرسکتے ہیں، دوسرے فرقے کے اوپر حملہ کرسکتے ہیں اور اپنے فرقے کا دفاع کرسکتے ہیں۔ یہ نتائج ہیں جو علمِ کلام سے نکلتے ہیں۔ علمِ کلام جدلی علم ہے، یہ امت سازی کے لئے نہیں بنایا گیا ہے، علمِ کلام کے موضوعات قرآنی ہیں، تخصص کے طور پر قرآنی موضوعات پر ہی بحث کرتا ہے۔ جس طرح فقہ میں جتنے موضوعات ہیں وہ قرآنی موضوعات ہیں مثلاً فقہ میں طہارت، نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے بارے میں بحث ہوتی ہے یہ سارے قرآنی موضوعات ہیں۔ فقہ میں جاکر ان موضوعات نے جو شکل اختیار کرلی ہے وہ دستوری اور منشوری نہیں ہے چونکہ منشوری نہیں ہے لہٰذا یہ فقہ جو ابھی ہمارے پاس موجود ہے یہ اس حالت میں قابلِ عمل نہیں ہے بلکہ قابلِ بحث اور قابلِ تحقیق ہے، اس پر مقالے لکھے جا سکتے ہیں، دروس دیے جاسکتے ہیں، تحقیقات کی جاسکتی ہیں اور سب کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن ان احکام کو نفاذ کی شکل نہیں دی گئی ہے یعنی احکامِ شرعیہ کو نفاذی، دستوری اور آئینی شکل نہیں دی گئی بلکہ اس پر تحقیقی اور مدرسہ ای رنگ غالب ہے، پس اس کو بھی آئیڈیالوجی کی شکل دینے کی ضرورت ہے، اس کی ترتیب اور انداز بھی دستوری ہوتا کہ قابلِ نفاذ ہو۔ پھر کچھ مراحل ایسے ہیں جو اس کے اندر طے ہونے چاہئیں تھے وہ نہیں ہوئے مثلاً فقہ میں ایک خلاء موجود ہے اور وہ نظامِ دینی کا خلاء ہے، فقہ فقط احکامِ دین پر مشتمل ہے، نظامِ دین اس کے اندر اصلاً موجود نہیں ہے اسی وجہ سے ہمیں احکام میں مشکل پیش آتی ہے اور ان احکام پر عمل کرنا دشوار ہورہا ہے۔

قرآنی مباحث کا محض علمی ہونا:

فقہ میں کسی نظام کے بارے میں بحث نہیں ہے جبکہ دین میں نظام پہلے ہے اور احکام بعد میں بیان ہوئے ہیں پس قرآنی موضوعات علوم نے لے لئے ہیں ان علوم نے لے کر قرآنی موضوعات کو علمی شکل دے دی ہے جبکہ آئیڈیالوجی چاہیے تھی۔ اس وقت ہمارے پاس علومِ دین موجود ہیں لیکن دینی آئیڈیالوجی نہیں ہے، علم کا مصرف علم کے لئے ہی ہوتا ہے مثلاً فزکس ایک علم ہے آئیڈیالوجی نہیں ہے، عمل کے طور پر فزکس کو پڑھیں تو پڑھ سکتے ہیں، اس میں تحقیق و تجربے کرسکتے ہیں، اس کی بنیاد پر بہت ساری چیزیں بناسکتے ہیں لیکن فزکس کو نافذ نہیں کرسکتے چونکہ یہ ایک علم ہے۔ اسی طرح فلسفہ ایک علم ہے آئیڈیالوجی نہیں ہے لہٰذا فلسفے کو نافذ نہیں کرسکتے ہیں چونکہ فلسفہ مکتب نہیں ہے، البتہ فلسفے سے آئیڈیالوجی بنائی جاسکتی ہے لہٰذا ہم نے قرآن سے علوم لے لئے ہیں مثلاً ادبیات، صرف ونحو اور دیگر علوم لے لئے ہیں، یہ علوم ہیں،

قرآن مجید کے مطابق امت وہ اجتماع ہے جو دین کے محور میں جمع ہو اور جن میں دین، مکتب اور آئیڈیالوجی کے علاوہ کوئی اور چیز وجہِ اشتراک تو ہو لیکن وہ وجہِ اشتراک محور نہ ہو۔ اگر دینِ رسوماتی، دینِ موروثی اور دینِ تقلیدی نکتۂ اشتراک واقع ہو تو اس سے امت وجود میں نہیں آتی ہے۔ پس امت بننے کے لئے دینِ مکتبی یا آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے۔

ان علومِ اسلام سے اگر ہم ہزار سال بھی سروکار رکھیں تو کبھی بھی مکتب نہیں نکلے گا اور علوم قابلِ نفاذ نہیں ہوتے بلکہ علوم قابلِ تعلیم و تعلم ہوتے ہیں۔علوم کو سیکھا، سکھایا اور پڑھا، پڑھایا جاتا ہے تاکہ ان علوم کی مدد سے ہم مکتب اور آئیڈیالوجی بنا سکیں، ہم علوم تک آتے ہیں لیکن علوم کی مدد سے جو کام آگے کرنا ہے اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور صرف علوم پر ہی اکتفاء کر لیتے ہیں دین کے معاملے میں یہی کرتے ہیں کہ علوم ہی ہمارے لئے کافی ہیں مثلاً عدالتی نظام (قانون) ایک علم ہے یا پولیٹیکل سائنس ایک علم ہے اور پولیٹیکل سائنس نافذ نہیں ہوسکتی چونکہ سائنس ہے، اسی طرح علمِ سیاست ہے جو قابلِ نفاذ نہیں ہوتا ہے مثلاً اگر سیاسی نظام یا جمہوریت نہ ہو تو کیا فقط پولیٹیکل سائنس سے مملکت چلائی جاسکتی ہے؟ پولیٹیکل سائنس پر یونیورسٹیز اور مدرسے بنا کر ڈگریاں لی اور دی جاسکتی ہیں، اس پر لیکچرز دیے جاسکتے ہیں، اس پر ریسرچ کی جاسکتی ہے، اس پر نظریہ قائم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے ذریعے کوئی مملکت نہیں چل سکتی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ پولیٹیکل سائنس سے ایک نظامِ سیاسی باہر آنا چاہئے، یعنی علمِ سیاست کا فریضہ ہے کہ انسان کو نظامِ سیاست بنا کر دیں ورنہ خود علمِ سیاست قابلِ نفاذ نہیں ہے۔اگر دنیا میں فقط پولیٹیکل سائنسز ہوتیں اور سیاسی سسٹم نہیں ہوتے تو کوئی حکومت قائم نہ ہوسکتی تھی علم سیاست کے بڑے بڑے مجتہد موجود ہوتے لیکن کوئی نظامِ سیاسی نہ ہوتا، کوئی حکومت نہ ہوتی۔نظامِ حکومت، آئین اور منشور علمِ سیاست نہیں ہے بلکہ وہ علمِ سیاست سے نکلا ہوا ثمرہ و نتیجہ ہے۔

علومِ دینی کی اصل، مکتب کی تشکیل:

مکتب و آئیڈیالوجی ان علومِ اسلامی کا ثمرہ ہونا چاہیے تھا، سارے علومِ اسلامی مثلاً علمِ کلام سے ایک نظریاتی مکتب و آئیڈیالوجی باہر آنی چاہئے تھی لیکن ابھی ہمارے پاس فقط علمِ کلام ہے، علمِ کلام میں جو نظریہ ہے وہ مکتبی رنگ نہیں ہے بلکہ علمی رنگ ہے۔یعنی تمام علوم دینی کو مل کر ایک مکتب تشکیل دینا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا ہے۔علماء، سکالر، فلاسفہ اور علماء کم ہیں جبکہ علوم کے ماہرین بہت ہیں مثلاً ٹیچر بہت ہیں لیکن صاحبِ نظر کم ہوتے ہیں مثلاً کیمسٹری پڑھانے والے بہت ہیں لیکن کیمسٹری میں نظریہ رکھنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔اسی طرح دینی علوم پڑھانے والے بہت ہیں لیکن اُن پر نظریہ رکھنے والے، بہت کم ہیں اور پھر جو صاحبِ نظر کسی علم میں پیدا ہو جائیں وہ صاحبِ نظر اس علم کے اندر سے مکتب نہیں بنا سکتے یا وہ ضرورت ہی نہیں سمجھتے یا پھر ان میں مکتب بنانے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ہمیں صاحبِ نظر سے بڑی صلاحیت والا آدمی چاہئے جو اس سے مکتب نکالیں لہٰذا امت سازی کے نظریاتی مرحلے میں اس کے لئے علم پر اکتفاء نہیں کیا سکتا بلکہ اعتقادی و نظریاتی نظام کی ضرورت ہے جو تھیوری کی شکل میں ہو اور جس کا لب و لہجہ علم والا نہ ہو بلکہ آئیڈیالوجی والا اور دستوری لب و لہجہ ہو۔

قرآن کتابِ علم نہیں، کتابِ ہدایت ہے:

اگر قرآن مجید میں دیکھیں تو اس میں زیادہ تر نظریاتی باتیں ہیں، اس میں علمی لہجہ کم استعمال ہوا ہے چونکہ قرآن علمی کتاب نہیں ہے بلکہ قرآن مجید در حقیقت ہدایت کا منبع ہے جیسے خود قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ

"ھُدًی لِّلنَّاسِ" (سورہ آل عمران، آیت ۳)

قرآن انسانوں کی ہدایت کیلئے نازل ہوا ہے لہٰذا ہم اگر قرآن کو دیکھیں تو علمی اصطلاحات استعمال نہیں کر رہا بلکہ عرفی زبان استعمال کرتا ہے، قرآن مجید میں بول چال کی زبان ہے، جس طرح معاشرے میں عام لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں، قرآن مجید نے بھی یہی زبان استعمال کی ہے مثلاً بعض اہلِ تفسیر نے یہ نکتہ ذکر کیا ہے کہ جس طرح ہماری دو زبانیں ہوتی ہیں، کتابی زبان اور بول چال کی زبان یا تحریری اور تقریری زبان۔تحریری زبان اور تقریری زبان میں بہت فرق ہوتا ہے۔کسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے جو

> علمِ کلام میں جو موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں وہ وہی نظریاتی مراحل ہیں جنہیں امت سازی کے پہلے مرحلے کے طور پر طے کرنا ہے لیکن جس انداز سے علمِ کلام ان مسائل کو اٹھاتا ہے یا جس انداز سے علمِ کلام ان مسائل کو پیش کرتا ہے وہ امت سازی کی طرف نہیں جاتے بلکہ فرقہ سازی کے لئے اچھے ہیں۔لہٰذا علمِ کلام پر اکتفاء نہ کیا جائے۔

> قرآن انسانوں کی ہدایت کیلئے نازل ہوا ہے لہٰذا ہم اگر قرآن کو دیکھیں تو علمی اصطلاحات استعمال نہیں کر رہا بلکہ عرفی زبان استعمال کرتا ہے،قرآن مجید میں بول چال کی زبان ہے،جس طرح معاشرے میں عام لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔قرآن مجید کا اسلوب، طریقۂ کار اور انداز علمی کتابوں سے ہٹ کر ہے اگرچہ قرآن مجید میں علمی خزانے موجود ہیں اور یہ علماء کو میدان دیتا ہے کہ وہ ان موضوعات پر آکر اپنی کاوشیں کریں۔

زبان استعمال ہوتی ہے یہ تقریری زبان کہلاتی ہے اور تحریری زبان وہ ہوتی ہے جس میں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔تقریری زبان میں علم کو پیش نہیں کیا جا سکتا، اگر کوئی علمی گفتگو یا علمی تحقیق کرنا چاہتا ہے تو اسے کتابی زبان سیکھنی پڑے گی لیکن ہدایت کے لئے عام گفتگو اور بول چال کی زبان درکار ہوتی ہے۔پس قرآن مجید کا موضوع ہدایت ہے اس لئے اس میں کتابی زبان استعمال نہیں ہوئی ہے بلکہ محاوراتی، بول چال والی اور عام گفتگو والی زبان استعمال ہوئی ہے۔قرآن مجید کا اسلوب، طریقۂ کار اور انداز علمی کتابوں سے ہٹ کر ہے اگر چہ قرآن مجید میں علمی خزانے موجود ہیں،قرآن علوم کو موضوعات اور علماء کو میدان دیتا ہے تا کہ ان موضوعات پر علماء و علوم آکر اپنی کاوشیں کریں اور مہارتیں دکھائیں مثلاً قرآن نے آکر زمین و آسمان کا نظریہ دیا اور کہا کہ اس کا مطالعہ کرو لیکن یہ ہمارے ذہن میں رہے کہ قرآن کا انداز علمی نہیں ہے بلکہ ہدایتی انداز ہے۔

قرآن کی روش استدلال:

علمِ کلام میں جو عقائد کی بحث ہوتی ہے یہ امت سازی کے لئے کافی نہیں ہے،فرقہ سازی کے لئے خوب ہے۔امت سازی کے لئے ہمیں مکتبی عقائد کی شکل میں عقیدہ چاہیے، دستوری عقیدہ چاہیے،ابھی اس کا انداز علمی و جدلی ہے جبکہ ہمیں دستوری و نظریاتی انداز کے عقیدے کی ضرورت ہے۔اگر قرآن کے عقائد دیکھیں تو کسی جگہ بھی ایسا نہیں ہے،علمِ کلام جس طرح سے توحید کی بحث چھیڑتا ہے قرآن مجید اس طرح سے توحید کی بحث نہیں چھیڑتا قرآن کا اپنا الگ انداز ہے مثلاً

”قُلۡ ھُوَ اللّٰهُ اَحَد“ (سورہ اخلاص، آیت ۱)

اس آیت کے بارے میں علمِ کلام میں توحید کی ساری بحث دیکھ لیں ایک جملہ بھی اس کے مشابہ نظر نہیں آئے گا مثلاً علمِ کلام یوں بحث کرتا ہے، پہلے کہتا ہے خدا ایک ہے پھر خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل ڈھونڈتا ہے اور پھر ان دلائل میں چلا جاتا ہے۔اسی طرح ہم اگر قرآن مجید اس آیت کو لے لیں جس میں وحدانیت اس طرح ذکر ہوئی ہے

”لَوۡ کَانَ فِیۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا“ (سورہ انبیاء، آیت ۲۲)

اگر اس وحدانیت کو علمی رنگ دے دیں تو کوئی اور رنگ بنتا ہے لیکن اس کو اگر مکتبی انداز سے بیان کریں تو یہ دستوری حالت بن جاتی ہے۔پس جب ہم کہتے ہیں کہ امت سازی کے لئے پہلا مرحلہ نظریاتی مرحلہ ہے تو اس نظریاتی مرحلے کا انداز بھی مکتبی ہو۔قرآن سے علمی کام کرنا دشوار ہے جبکہ مکتبی کام کرنا آسان تر ہے چونکہ قرآن مکتب بنانے کیلئے زیادہ آمادہ ہے اور علم کے لئے اس میں زیادہ کاوش کی ضرورت ہے۔

حصولِ مکتب از قرآن:

قرآن مجید سے مکتب آسانی سے بنتا ہے چونکہ قرآن مجید ہدایت ہے۔ قرآن کا مکتبی رنگ ہے یعنی قرآن معدنِ آئیڈیالوجی ہے،قرآن کی دستوری تدوین نہیں بلکہ معدنی تدوین ہے، یہ منبع کے طور پر ہے یعنی ہدایت کا ماخذ ہے لیکن مکتب کے لئے زیادہ ہموار ہے۔اگر اس سے مکتب نکالیں تو کہیں آسان تر ہے بجائے اس کے کہ اس سے علوم نکالیں۔ابھی تک مسلمانوں نے جو زحمتیں کی ہیں وہ صرف علوم کی حد تک کی ہیں البتہ اس میں بھی ہم بہت پیچھے ہیں، وہ علوم جو قرآن متعارف کروا رہا ہے ہم نے نہیں نکالے ہیں، ابھی تک مسلمانوں نے قرآن مجید سے جو علوم لیے ہیں وہ صرف فقہ اور عقائد ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ علمِ انسان شناسی، علمِ معاشرہ شناسی، علمِ کائنات شناسی اور علمِ ہستی شناسی جو قرآن کے علوم ہیں وہ نہیں لیے ہیں، یہ معدن ابھی تک کسی نے کھولی نہیں ہے چونکہ اس معدن کا مواد نکالنے سے فائدہ اور سود کوئی نہیں

کسی نے ایران کے اندر
ایک قرآن پرنٹ کیا ہے جس کا وزن ایک ہزار کلو ہے یا مثلاً کسی شخص نے ایک پورا سپارہ چاول کے ایک دانے پر لکھا ہے، ان کے بارے میں آقای قرائتی کہتے ہیں کہ یہ دونوں قرآن کس کام آئیں گے؟ یہ ایک ہزار کلو والا قرآن جس کا ورق بھی نہیں الٹایا جا سکتا اس کا کیا فائدہ ہے؟ ابھی تک ہم نے قرآن پر سارے ثانوی کام کیے ہیں، فرعی، بارڈر، حاشیے کے کام کیے ہیں لیکن متنِ قرآن میں ابھی تک داخل نہیں ہوئے۔

ہے۔ وارا ایک عمومی تاجرانہ لفظ ہے جیسے تاجر کہتے ہیں کہ فلاں کام میں وارا نہیں ہے یعنی محنت زیادہ ہے اور نتیجہ کم نکلتا ہے، کچھ علوم ایسے ہیں جو وارا کھاتے ہیں، وارا اس طرح کھاتے ہیں کہ آپ ان میں محنت کم کریں جبکہ نتیجہ زیادہ نکلتا ہے مثلاً سارا قرآن حفظ کر لیں یہ وارا کھا تا ہے چونکہ محنت کم کرنا پڑتی ہے، سوچنا تو پڑتا ہی نہیں ہے لہٰذا حفظ کر لیں شہرت زیادہ ہوتی ہے مثلاً ایک مجتہد ایسا پیدا ہو جو قرآن سے سوشیالوجی نکالے تو اس کی کوئی تقلید نہیں کرے گا اور وہ خمس سے محروم ہوگا کیونکہ اس نے قرآن سے سوشیالوجی نکالا ہے اس لئے وارا نہیں کھاتا ہے۔ پس ابھی تک ہم نے قرآن مجید سے وہ علوم استخراج کیے ہیں جو کسی حد تک نفع بخش تھے۔ پس اول ہم نے قرآن سے فقط علوم کی حد تک استفادہ کیا ہے اور علوم میں بھی محدود علوم کی حد تک گئے ہیں، ابھی قرآن میں ایسے علوم موجود ہیں جن کا ہاتھ ہی نہیں لگایا گیا، جن پر دستِ بشر نہیں لگا ہے اس لئے قرآن مجید کا خود اپنا دعویٰ ہے کہ جب قیامت کا روز ہوگا، روزِ حشر رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کا شکوہ کریں گے کہ

"یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَھۡجُوۡرًا"

(سورہ فرقان، آیت ۳۰)

اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو مہجور رکھا، مہجور یعنی متروک رکھا، ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ حافظوں اور مفسروں کی قطاریں لگی ہوں گی پھر بھی رسول اللہ ﷺ کہیں گے کہ انہوں نے بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے، اس قرآن کے اندر اتنا کچھ پڑا ہوا ہے لیکن انہوں نے اسے پڑھا اور سمجھا نہیں ہے۔

پس ابھی تک قرآن سے جس طرح سے استخراج کا عمل ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا ہے اور ہم نے قرآن پر ثانوی کام زیادہ کیے ہیں۔ آقای قرائتی وہ تنہا بے باک آدمی ہیں جو اپنی قوم سے ساری باتیں کہہ دیتے ہیں، ان کا یہ کہنا ہے کہ ابھی ہم کیا کر رہے ہیں؟ مثلاً ایران کے اندر ایک قرآن پرنٹ کیا ہے جس کا وزن ایک ہزار کلو ہے یا مثلاً کسی شخص نے ایک پورا سپارہ چاول کے ایک دانے پر لکھا ہے، ان کے بارے میں آقای قرائتی کہتے ہیں کہ یہ دونوں قرآن کس کام آئیں گے؟ یہ ایک ہزار کلو والا قرآن جس کا ورق بھی نہیں الٹایا جا سکتا اس کا کیا فائدہ ہے؟ کیا خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کو اس لیے نازل کیا تھا کہ ہم ایک ہزار کلو کا قرآن لکھیں جس کو اٹھانے کے لئے کرین چاہیے؟ یا پھر چاول کے دانے پر جو قرآن لکھا ہے آخر یہ قرآن کس کام آئے گا؟ پس ابھی تک ہم نے قرآن پر سارے ثانوی کام کیے ہیں، فرعی، بارڈر، حاشیے کے کام کیے ہیں لیکن متنِ قرآن میں ابھی تک داخل نہیں ہوئے۔

مہجوریتِ قرآن:

اگر مسلمان متنِ قرآن میں جائیں تو اندر سے بہت سے علوم نکلیں گے چونکہ قرآن میں فراواں علوم ہیں لیکن سارے علوم اگر ہم قرآن سے استخراج کر لیں تو بھی جب تک مکتب و آئیڈیالوجی قرآن سے نہیں لیتے اس وقت تک قرآن مہجور ہے چونکہ چودہ سو سال سے قرآن نافذ نہیں ہے صرف پڑھا جا رہا ہے اور صرف پڑھایا جا رہا ہے، صرف اس پر تحقیقات کی جا رہی ہیں، صرف اس کو سنا جا رہا ہے اور سنایا جا رہا ہے، یہ قرآن مہجور ہے یعنی مکتب اور آئیڈیالوجی کے منبع سے جب تک مکتب نہیں نکلتا اس وقت مہجور و دست نخوردہ ہے مثلاً ابھی ہم تفاسیر کو دیکھیں تو آیت کے ذیل میں سوائے پیغامِ آیت کے ساری بحث ہوتی ہے، وہ بحث نہیں ہوتی جو آیت بیان کر رہی ہے باقی سب کچھ اس کے اندر لکھا ہوتا ہے، اس لیے قرآن مہجور ہے۔ پس ہمیں امت سازی کے لئے نظریاتی بنیاد چاہیے، امت سازی کے لئے پہلا عمل نظریاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنا آغاز نظریاتی بنیاد سے کیا ہے۔ امت سازی کا پہلا مرحلہ سارا نظریاتی میدان ہموار کرنا تھا یا نظریاتی عمل تھا یا آئیڈیالوجی کا نظریاتی حصہ پہلے پیش کیا اور لوگوں کے اندر پہلے نظریاتی

آمادگی ایجاد کی، یہ عمل انجام دیے بغیر کوئی اور قدم اٹھانا ناکامی ہے، اگر کوئی قوم، معاشرہ، نسل یا ملت نظریاتی مرحلہ طے نہ کرے اور اسے دوسرے میدانوں میں لایا جائے تو وہ قوم ناکام ہوتی ہے مثلاً پاکستانی ملت کے پاس نظریہ نہیں ہے لیکن اس کو مختلف ایشوز پر اکٹھا کیا جاتا ہے یعنی حادثات اور واقعات وغیرہ پر اکٹھا کیا جاتا ہے اور پھر یہ ناکام ہوجاتی ہے، ابھی ہماری حالت یہ ہے کہ ہم سارا سال منتظر رہتے ہیں تاکہ کوئی بڑا واقعہ یا حادثہ ہو اور اس پر ہم اکٹھے ہوں کیونکہ روز روز کے چھوٹے حادثوں کی وجہ سے ہماری حساسیت ختم ہوگئی ہے اگر کوئی خبر دے کہ کسی دھماکے میں پانچ آدمی مارے گئے ہیں تو ہم توجہ ہی نہیں دیتے جب تک اموات کی تعداد پچاس سے زیادہ نہ ہو اس کی خبر تک کسی کو دینا ٹائم کا ضیاں سمجھتے ہیں۔

شعوری لحاظ سے لوگوں کے گروہ:

کسی اہلِ قلم کا تجزیہ ہے کہ لوگوں کے تین زمرے ہوتے ہیں، نظریاتی طور پر سب سے کم ترین و گھٹیا طبقہ وہ ہوتا ہے جو شخصیات کو ہمیشہ زیرِ بحث رکھتے ہیں اور وہ شخصیات سے آگے نہیں بڑھتے، یہ معاشرے کا سب سے نچلا طبقہ ہوتا ہے۔ ان سے اوپر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اتفاقات و حادثات و واقعات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور معاشرے کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو شخصیات اور حادثات کو زیرِ بحث نہیں لاتا بلکہ نظریات کو زیرِ بحث لاتا ہے اور نظریات کو محور قرار دیتا ہے پس بغیر نظریاتی میدان کے قوم کو کسی بھی میدان میں اتاریں گے تو سوائے رسوائی، ناکامی اور مایوسی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ عملی میدانوں میں جانے سے پہلے نظریاتی میدان بنانا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی روش:

رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کا ایک بڑا راز اسی میں ہے کہ آپؐ نے ایک بڑا عرصہ نظریاتی میدان ہموار کرنے میں لگایا اور اس زمانے میں کوئی حکم پیش نہیں کیا، خود اپنے لئے احکام، واجبات، فرائض اور ذمہ داریاں تھیں لیکن امت کی ابھی فرائض و ذمہ داریاں نہیں تھیں چونکہ ابھی امت کا مرحلہ بھی نہیں آیا تھا۔ ہم جب تبلیغ کرنے کے لئے جاتے ہیں تو پہلے جا کر امت کے فرائض بیان کرتے ہیں جبکہ امت ہوتی ہی نہیں ہے۔ جس کے فرائض بیان کر رہے ہیں وہ امت ہی نہیں ہوتی لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے آکر اس طرح ہوا میں باتیں نہیں کیں، آتے ہی فوراً حکم جاری نہیں کیا کہ یوں کریں۔ سب سے پہلا عمل امت سازی کا کیا اور امت سازی کا پہلا عمل نظریاتی میدان سے شروع کیا مثلاً آج صورتحال دیکھ لیں کہ مسجدوں میں آگہی سب کو دیتے ہیں لیکن عمل کوئی بھی نہیں کرتا ہے، وجہ یہ ہے کہ عمل کا نظریاتی میدان ہموار نہیں کرتے ہیں۔ وہ آگہی جو قرآن عطا کر رہا ہے اور جسے تمام انبیاءؑ نے آتے ہی بشر کو متوجہ کیا اس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔

اوّلین کارِ انبیاء: آگھی و شعور پھیلانا

تمام انبیاءؑ نے آکر سب سے پہلے امت سازی کا یہ درس دیا ہے کہ خود تم جو ہو، جس عالم و کائنات میں تم رہ رہے ہو، جس آسمان کے نیچے تم رہ رہے ہو، جس منظومہ شمسی کا تم حصہ ہو، یہ سورج، چاند اور ستارے جنہیں تم روز دیکھتے ہو اور جو کچھ تمہارے اردگرد ہے، جو کچھ تمہاری محسوسات و مشاہدات میں آتا ہے ان کا ایک مالک و خالق ہے، یہ آگہی ہے۔ اگر علمی اعتبار سے دیکھیں یہ ایک خبر ہے، یہ آگہی نہیں کہلاتی، اس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا، ہم اسی حد تک عقائد بیان کرتے ہیں، علمی عقائد یہی ہوتے ہیں، اس پر پھر دلائل بھی دینے ہوتے ہیں، دلائل دے دیں لیکن یہ آگہی مکتب کی بنیاد نہیں بنتی بے شک آپ دلائل دے دیں مثلاً کائنات کا رب ہے دلیل بھی دے دیں، دلیل سمیت پھر بھی مکتب کی بنیاد نہیں بن سکتی چونکہ وہ آگہی جو مکتب کی اساس بنتی ہے وہ ایک الگ طرح کی آگہی ہے، وہ ایک جداگانہ آگہی ہے، اس آگہی سے انسان متوجہ ہوتا ہے کہ اس وقت میں کہاں کھڑا ہوں اور میں اس وقت خود کائنات میں کیسے

> بغیر نظریاتی میدان کے قوم
> کو کسی بھی میدان میں اتاریں گے تو سوائے رسوائی،
> ناکامی اور مایوسی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ عملی میدانوں
> میں جانے سے پہلے نظریاتی میدان بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا
> رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کا ایک بڑا راز اسی میں ہے کہ
> آپؐ نے ایک بڑا عرصہ نظریاتی میدان ہموار کرنے میں
> لگایا اور اس زمانے میں کوئی حکم پیش نہیں کیا۔

> امت سازی
> کیلئے سب سے
> مشکل ودشوار مرحلہ
> لوگوں کوقلعہ'لا الہ الاّ اللہ'
> بارے آگاہی دینا ہے،اس
> تعلیم کا معلم خداوند تعالیٰ نے انبیاءؑ کو
> بنایا ہے۔یہ سب سے مشکل آگہی ہے اور وہی
> الٰہی رہبر ہیں جو اپنی قوموں کو لا الہ الاّ اللہ
> سکھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جو اس کی
> تعلیم نہیں دے سکتے وہ الٰہی رہبر نہیں ہوتے ہیں۔
> امام خمینیؒ نے بھی سب سے پہلے لا الہ الاّ اللہ سکھایا۔

آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں؟

ہم دعوتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام انبیاءؑ کی دعوت کو قرآن مجید سے دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کہاں سے شروع کیا اور کس انداز سے امت سازی کا کام شروع کیا؟ سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۱،۲۲ میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت سازی کا آغاز کیسے کیا؟

''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ''

یہ بڑے نپے تلے الفاظ ہیں،قرآن جو جملے استعمال کرتا ہے وہ صرف اشارہ نہیں ہے بلکہ ان الفاظ میں حکمت کارفرما ہوتی ہے، وہ الفاظ بہت سارے حقائق کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں مثلاً اس آیہ میں ہے کہ 'یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ '' اے لوگو! اب نہیں کہا کہ

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' (سورہ بقرہ،آیت۱۰۴)

بلکہ کہا کہ اے لوگو! یعنی ابھی تم ناس ہو یعنی ابھی تم لوگ ہو امت نہیں ہو، تم نے ناس سے امت تک آنا ہے یعنی جس کو ہم عوام کہتے ہیں، عام لوگ ہو، بغیر کسی عنوان کے لوگ جب کہا جاتا ہے تو اس میں مثلاً سنی ،شیعہ،مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہوتے ہیں، اس میں نہ مذہب دخیل ہوتا ہے اور نہ ہی نظریہ دخیل ہوتا ہے، نہ تعلیم دخیل ہوتی ہے اور نہ ہی ڈگری دخیل ہوتی ہے۔لوگوں میں سب آجاتے ہیں، بعد میں کہیں گے کہ اے مومنین ،لفظ بدل جائے گا لیکن اب لوگوں کے مرحلے سے آگے نہیں بڑھے ہیں پس اب صرف ناس ہیں اور اس ناس سے انھیں امت بنانا ہے

'اُعْبُدُوْ' کا حقیقی مفہوم:

کیا امت بنانی ہے؟

''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ'' (سورہ بقرہ،آیت۲۱)

اب دیکھیں کہ یہاں پر علمِ کلام کی طرح بات نہیں ہو رہی بلکہ یہ ہدایت کا جملہ ہے، دستوری و مکتبی لہجہ ہے۔اس کا مترجمین اور مفسرین یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ ''اے لوگو! عبادت کرو' اور عبادت کا نام آتے ہی فوراً نماز ذہن میں آجاتی ہے یعنی اٹھو، وضو کرو اور نماز پڑھو، یہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، جب بھی قرآن مجید میں یا دین کی تعلیمات میں ''اعبدو' کا لفظ آتا ہے تو فوراً ذہن میں عبادت اور عبادت میں بھی نماز ذہن میں آتی ہے۔یہ وہی بات ہے کہ مصادیق ہمارے ذہنوں کو اغواء کر لیتے ہیں، ہمارے ذہن کو مصادیق کہیں اور اٹھا کے لے جاتے ہیں جس کی وجہ سے یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ بات کیا ہو رہی ہے مثلاً یہ کہ قرآن کہنا کیا چاہ رہا ہے؟

''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا''

یہ نظریاتی مرحلہ ہے

''اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ''

(سورہ بقرہ،آیت ۲۱)

یہاں ہمیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ جس کائنات میں تم رہ رہے ہو اس کا مالک، خالق اور رب ہے یعنی ''عبادت کرو' نہیں بلکہ ''بندگی اختیار کرو'، بندگی یعنی وہ چیز جس پر دین استوار ہونا ہے یعنی امت سازی کا پہلا مرحلہ بندگی ہے یعنی اپنے آپ کو، اس جہان کو اور اپنے خالق کو پہچانو اور اپنے رب کی تصدیق کرو۔

''اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'' (سورہ بقرہ،آیت۲۱،۲۲)

''اے لوگو! اپنے پروردگار کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے والوں کو بھی پیدا کیا ہے تاکہ تم متقی بنو'۔''زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، آسمان سے تمہارے لیے پانی اتارا ہے اور اس سے پھل نکالے ہیں، رزق نکالا ہے، یہ ساری چیزیں جو تم صبح شام تناول کر رہے ہو، جو رزق تم تک

پہنچ رہا ہے یہ اسی کی طرف سے ہے پس تم اس کی بندگی اختیار کرو۔''

اساسِ مکتب الٰھی:

اسلامی مکتب و اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد و اساس ''لا الہ الاّ اللہ'' ہے۔ ''لا الہ الاّ اللہ'' فقط جملہ نہیں ہے بلکہ بنیادی آگہی ہے، ہم ''لا الہ الاّ اللہ'' پڑھتے بھی ہیں، اس کے بینر بھی بناتے ہیں، نعرے بھی لگاتے ہیں اور روز نماز کے بعد لا الہ الاّ اللہ پڑھتے ہیں چونکہ یہ تعقیبات نماز میں ہے۔ پس یہ بنیادی آگہی ہے اس کے بارے میں قرآن مجید کا یہ فرمانا ہے کہ اگر یہ آگہی تمہارے ہاتھ آگئی اس وقت تمہیں ایک مضبوط سہارا مل جائے گا۔

''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ......'' (سورہ بقرہ، آیت ۲۵۶)

''دین میں جبر نہیں ہے......''

''قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ......'' (سورہ بقرہ، آیت ۲۵۶)

''کہ درست راستہ، کج راستے سے کاملاً جدا ہو چکا ہے، روشن اور واضح ہو چکا ہے......'' رشد و غی یہ وہ چیزیں ہیں جو ترجموں میں دقیقاً منتقل نہیں ہوتیں، عموماً اس کا صحیح و غلط راستے یا حق و باطل معنیٰ کر دیتے ہیں۔ رشد و غی کا معنیٰ حق و باطل نہیں ہے۔ رشد سے مراد درست اور رشادت کا راستہ ہے اور غی سے کج اور ٹیڑھا راستہ۔ یہ دونوں الگ ہو چکے ہیں یعنی آگہی اتنی پہنچ چکی ہے، نظریاتی عمل اتنا انجام پا چکا ہے کہ درست راستہ اور نادرست ممتاز ہو چکے ہیں، ان میں فرق واضح ہو چکا ہے، دونوں بالکل روشن ہو چکے ہیں،

''فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ''''

(سورہ بقرہ، آیت ۲۵۶)

یعنی اب جس کو ''لا الہ الاّ اللہ'' کے بارے میں آگہی مل گئی ہے یعنی اگر انسان نے اس کی تصدیق کر لیا ہے، لا الہ اور الاّ اللہ عملی ہو گئے ہوں تو درحقیقت عروۃ الوثقیٰ اس کے ہاتھ آیا ہے یعنی مضبوط سہارا جس میں شکستگی نہیں ہے جو ٹوٹنے اور جدا ہونے والا نہیں ہے، جس کے بعد ہلاکت کی کوئی گنجائش و امکان ہی نہیں ہے وہ انسان کے ہاتھ آیا ہے۔ پس پہلی آگہی لا الہ الاّ اللہ ہے۔

معلمین الٰھی کا بنیادی فریضه:

حدیثِ قدسی میں ہے کہ

''كلمة لا اله الّاالله حصنى''

خدا نے فرمایا ہے کہ کلمہ ''لا الہ الاّ اللہ'' میرا قلعہ ہے، یہ میری امن و پناہ کی جگہ ہے۔

''فمن دخل حصنى امن من عذابى''

''جو اس قلعے میں داخل ہو گیا وہ امن میں ہے''۔ امت سازی کیلئے سب سے مشکل و دشوار مرحلہ لوگوں کو اس قلعے کے بارے میں آگاہی دینا ہے، اس تعلیم کا معلم خداوند تعالیٰ نے انبیاءؑ کو بنایا ہے، خداوند تبارک و تعالیٰ نے اتنے اعلیٰ اور کوالیفائیڈ معلم مقرر کیے تا کہ بشر کو صرف یہ چیز سکھائیں۔ پس یہ سب سے مشکل آگہی ہے اور وہی الٰہی رہبر ہیں جو اپنی قوموں کو لا الہ الاّ اللہ سکھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جو اس کی تعلیم نہیں دے سکتے وہ الٰہی رہبر نہیں ہوتے۔ امام خمینیؒ نے بھی سب سے پہلے لا الہ الاّ اللہ سکھایا۔ ایک فقیہ وہی ہوتا ہے جو اپنے پیروکاروں کو لا الہ الاّ اللہ باور کرا دے۔

بغیر نظریاتی میدان کے قوم کو کسی بھی میدان میں اتاریں گے تو سوائے رسوائی، ناکامی اور مایوسی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ عملی میدانوں میں جانے سے پہلے نظریاتی میدان بنانا ضروری ہے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی کا ایک بڑا راز اسی میں ہے کہ آپؐ نے ایک بڑا عرصہ نظریاتی میدان ہموار کرنے میں لگایا اور اس زمانے میں کوئی حکم پیش نہیں کیا۔

حقیقت اور احساساتِ کاذب:

علم، ایمان اور نفسیاتی حالت انسانوں میں پائے جانے والے تین مختلف قسم کے احساسات ہیں۔ ابھی ہم جو مسلمان ہیں، ہم علمِ اسلام کی وجہ سے اسلام نہیں رکھتے بلکہ اسلام ہماری نفسیاتی حالت ہے۔ نفسیاتی حالت انسان تلقینات کے نتیجے میں سنتا رہتا ہے، تلقینات سن سن کے اس کی روانی حالت، نفسیاتی حالت بن جاتی ہے، انسان کے اندر یہ خصلت ہے کہ خلافِ واقع انسان کی ایک نفسیاتی حالت بنا دی جاتی ہے کہ اپنے نفس کے اندر کچھ خیالات، کچھ اوہام اور کچھ تلقینات کا اپنے

اندر احساس کرتا ہے مثلاً اگر کسی تندرست شخص کو آپ چند دن مسلسل کہیں کہ آپ بیمار ہیں وہ واقعاً بیمار ہو جائے گا اور وہ اس وجہ سے کہ اس کی ایک نفسیاتی حالت بن چکی ہے۔ نفسیاتی حالت سے مراد یعنی ایک اندرونی احساس انسان کے دل میں تلقینات یا تأثرات کے نتیجے میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کو ایمان اور علم نہیں کہتے بلکہ یہ حالتِ نفسیاتی ہے۔ ہم اپنے بارے میں یہ نفسیاتی حالت رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے انسان ہیں یا ہم بڑے عالم ہیں، بہت سارے لوگ اس نفسیاتی حالت میں مبتلا ہیں، پاگل وہ ہوتا ہے جو کھل کے کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔

جب ہندوستان اور پاکستان تقسیم ہوا تھا اس وقت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم تھے، انہوں نے وزارتِ عظمٰی کی پوسٹ سنبھالی ہوئی تھی اور وہ ہر جگہ کے دورے کرتے تھے، ایک دن انہوں نے پاگل خانے کا دورہ کیا کہ دیکھیں کہ ملک میں پاگل خانوں کی کیا حالت ہے؟ جب دورہ کرنے گئے تو اس پاگل خانے کا جو ذمہ دار آدمی تھا اس سے پوچھا کہ بھائی آپ کیا کرتے ہو، انہوں نے کہا ہم پاگلوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ آج تک کوئی ٹھیک کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آج ہی ایک آدمی ٹھیک ہو کے یہاں سے جا رہا ہے۔ نہرو صاحب کو جو ٹھیک ہوا تھا اُس سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ جب اس کو بلایا گیا تو نہرو صاحب نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اس سے پوچھا کہ تم پاگل تھے؟ اس نے کہا ہاں میں پاگل تھا، اس نے کہا اب ٹھیک ہو گئے؟ انھوں نے کہا ہاں اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں، کہا بالکل ٹھیک ہو، اُس نے کہا اس وقت بالکل نارمل ہوں، اب کوئی مشکل نہیں ہے تو نہرو صاحب نے کہا مجھے پہچانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ اس نے کہا کہ نہیں میں آپ کو نہیں پہچانتا، انہوں نے کہا میں جواہر لعل نہرو، ہندوستان کا وزیر اعظم ہوں تو اس پاگل نے کہا کہ ٹھیک ہو جاؤ گے کیونکہ میں بھی جب آیا تھا تو ہندوستان کا صدر تھا۔ پس کچھ لوگوں میں نفسیاتی حالت آ جاتی ہے جن کو اپنی شخصیت کا احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

علمی یقین اور نفسیاتی حالت میں فرق:

آج انسانوں پر مختلف درجوں کے نفسیاتی حالات طاری ہیں، اگر سلامتی کا صحیح معیار قائم کر کے انسانوں کا سروے کریں تو وحشت ناک نتائج نکلیں گے، اسّی فیصد لوگ نارمل نہیں ہیں، نفسیاتی الجھنوں اور نفسیاتی حالات کا شکار ہیں مثلاً قم میں ایک بزرگوار سید تھا جو بہت بڑا عمامہ باندھتا تھا، ہاتھ میں عصا رکھتا تھا اور انہیں یہ احساس تھا کہ میں آیت اللہ اور بہت بڑی شخصیت ہوں۔ وہ جب حرم کے دروازے پر پہنچتے تھے تو پہلے دائیں کھڑے ہو کر بائیں طرف اپنے آپ سے کہتے تھے کہ پہلے آپ چلیں آپ آیت اللہ ہیں، پھر بائیں جا کر کھڑا ہو کر دائیں طرف منہ کر کے اپنے آپ سے کہتے تھے کہ آپ پہلے تشریف لے جائیں آپ آیت اللہ ہیں یعنی اپنا احترام وہ خود کرتے تھے یعنی اپنے ہی بارے میں وہ نفسیاتی حالت کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ نفسیاتی حالت ہے اس کو علم نہیں کہتے بلکہ یہ ایک بیماری ہے، نفسیاتی حالت انسان کے لئے ایک بیماری ہے، نفسیاتی حالت کے نتیجے میں اچھے احساس بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور برے احساس بھی پیدا ہو جاتے ہیں، بہت سارے ایسے لوگ ہیں کہ جن کو اپنے بارے میں اچھے یا بُرے احساسات ہیں، یہ علمی یا ایمانی یقین نہیں ہے بلکہ یہ روانی اور نفسیاتی یقین کہلاتا ہے۔

ہم جب لا الہ الاّ اللہ کہتے ہیں تو پہلے یہ دیکھیں کہ ہمیں آگہی بھی حاصل ہوئی ہے یا نہیں ہوئی؟ ہم نے اپنے آپ کو تلقین کر دیا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، لا الہ الاّ اللہ کے پیروکار ہیں، دراصل یہ ہم نے اپنی روانی حالت بنالی ہے، پس یہ لا الہ الاّ اللہ نہ علم ہے اور نہ ایمان ہے بلکہ یہ لا الہ الاّ اللہ ہماری نفسیاتی حالت ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک شیعہ تھا وہ خلفاء کو صحیح الفاظ سے یاد نہیں کرتا تھا اس کے خلاف اہل سنت نے عدالت میں کیس شروع کیا کہ یہ خلفاء کی توہین کرتا ہے، ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے، جج نے اس کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تم یہ کام کرتے ہو؟ اس کے گھر والوں نے کہا کہ یہ آدمی تو پاگل ہے، ڈاکٹر سے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی بنوا کر لے آئے کہ یہ تو کافی عرصے سے پاگل ہے۔ اب جج نے کہا کہ اگر یہ پاگل ہے تو پھر اس پر مقدمہ نہیں چل سکتا، وہاں پر ایک سنی

ایمان آگہی بھی ہے اور اعتقاد بھی ہے لیکن اعتقادِ علمی اور اعتقادِ نفسیاتی نہیں ہے۔ یہی وہ باریکیاں ہیں جس کی وجہ سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم پر بہت سی نفسیاتی حالتیں طاری ہیں، کوئی اپنے آپ کو مجاہد سمجھ رہا ہوتا ہے، کوئی کمانڈو سمجھ رہا ہوتا ہے، کوئی لیڈر سمجھ رہا ہوتا ہے، کوئی رہبر سمجھ رہا ہوتا ہے۔ امت سازی کیلئے پہلے ان کو اس نفسیاتی حالت سے باہر لانا ہوگا۔

> قرآن مجید کو پڑھنے کا ادب یہ ہے کہ جب سرزنش اور ملامت کی آیات آتی ہیں تو یہ نہ کہو کہ یہ دوسروں کے بارے میں ہیں، اس کو اس طرح سے پڑھو کہ یہ آیت مجھ سے ہی مخاطب ہے، قرآن کے مخاطب بنو اور یہ کہو کہ یہ آیت مجھ سے ہی مخاطب ہے اور جب بھی کوئی فضیلت بیان ہو رہی ہو تو یہ سمجھو کہ یہ دوسروں کے بارے میں ہے، اپنے آپ کو قرآن کا اس طرح مخاطب بنائیں۔

کھڑا ہوا اور کہا کہ اگر یہ پاگل ہے تو پھر چاروں خلفاء کی توہین کرنی چاہیے پھر یہ صرف شروع کے تینوں کی کیوں کرتا ہے؟ تب وہ پاگل اٹھ کے کھڑا ہوا اور کہا کہ میں تو شیعہ پاگل ہوں میں کوئی سنی پاگل تھوڑی ہوں۔ یہ انسان کی نفسیاتی حالت ہے۔ بعض اوقات یہ نفسیاتی حالت انسان پر طاری ہوجاتی ہے اور یہ ایمان یا علم بھی نہیں ہے، اگر ہم اس پر تحقیق و جستجو کریں تو پتہ چل جائے گا کہ یہ نفسیاتی حالات، توہمات اور خیالات ہمارے ذہنوں میں جم گئے ہیں اور ایمان بن گئے ہیں، انھوں نے آکر دین کی جگہ آ کر لے لی ہے۔

جہلاء کو احساسِ اعلمیت ہونا:

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ اگر جہلاء خاموش ہوجائیں، فقط خاموشی اختیار کرلیں اور کچھ بھی نہ کریں تو دنیا کے آدھے مسائل حل ہوجائیں گے، آدھے مسائل جہلاء کے خاموش ہونے سے حل ہوتے ہیں اور آدھے مسائل علماء کے بولنے سے حل ہوتے ہیں۔ اگر یہ دونوں طبقے ایک خاموش ہوجائیں اور دوسرا بولنا شروع کردیں تو دنیا کے سارے مسائل حل ہوجاتے ہیں لیکن جن کو بولنا چاہیے وہ خاموش ہوتے ہیں اور جن کو نہیں بولنا چاہیے وہ بول رہے ہوتے ہیں۔

نفسیاتی مسلمان:

پہلا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم مسلمان اور مومن ہونے کے بارے میں اپنے اس تو ہم کا شکار ہوگئے ہیں کہ ہم موحد ہیں، ہم خدا کو مانتے ہیں یہ روانی اور نفسیاتی حالت ہے، نہ یہ علم ہے اور نہ ہی ایمان ہے۔ نفسیاتی حالت انسان کے عمل اور تصدیق میں تبدیل نہیں ہوتی ہے، نفسیاتی حالت قلب تک نہیں جاتی کیونکہ یہ ذہنی حالت ہوتی ہے۔ نفسیات کا تعلق فقط ذہنِ انسان سے ہوتا ہے اور ذہن میں بھی توہّم اور خیال سے تعلق ہوتا ہے۔ پس وہ نفسیاتی مسلمان جو نفسیاتی طور پر لا الہ الاّ اللہ کے ماننے والے ہیں وہ الگ ہوگئے اور یہ امت نہیں بن سکتے چونکہ امت سازی کی بنیاد نظریہ اور آگہی ہے اور ان کا پہلا باب لا الہ الاّ اللہ ہے۔

علمی آگاہی:

دوسرے درجے پر علمی آگاہی آجاتی ہے مثلاً علمِ کلام میں جو آگہی دی جاتی ہے یہ علم ہے جس پر دلیل بھی ہے، جسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، جسے لکھتے ہیں اور مناظرہ کرتے ہیں یہ علم ہے، جب لا الہ الاّ اللہ کے بارے میں معلومات ہوں، علم ہو، اس پر دلائل اور مناظرے ہوں اگر انسان یہ سارے کام کرے یہ بھی مکتب کی بنیاد نہیں بن سکتی، اس کے اوپر امت سازی کا کام نہیں ہوسکتا، یہ لوگ جو فقط لا الہ الاّ اللہ کا علم و معلومات رکھتے ہیں، یہ کبھی بھی امت نہیں بن سکتے، بے شک یہ علماء ہی ہوں۔ صدیاں گزر گئیں لا الہ الاّ اللہ کے بڑے بڑے مؤلف و مصنف رہے ہیں لیکن نہ وہ خود امت بنے ہیں اور نہ ہی ان کے ہاتھوں سے کوئی امت بنی ہے۔

ایمانی آگاہی:

لا الہ الاّ اللہ کے بارے میں تیسری آگاہی ایمانی آگاہی ہے۔ ایسی آگہی جو ایمان کی شکل میں ہو، ایمان آگہی بھی ہے اور اعتقاد بھی ہے لیکن اعتقادِ علمی اور اعتقادِ نفسیاتی نہیں ہے۔ یہی وہ باریکیاں ہیں جس کی وجہ سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، اگر یہ کھل جائیں، یہ ظرافتیں انسان کو سمجھ آجائیں تو انسان کم از کم اپنے آپ کو درست راہ پر لا سکتا ہے۔ ایمان اعتقاد ہے لیکن علمی اعتقاد کا نام نہیں ہے ایمان اور نفسیاتی حالت کا نام بھی ایمان نہیں ہے اس وقت اکثر نفسیاتی مومن ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔ قم میں طالبعلم تھا، ان کا دماغی توازن خراب ہوگیا تھا، انہوں نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور درس میں نہیں جاتا تھا، جب اُن کے دوست پوچھتے تھے کہ آپ درس میں کیوں شرکت نہیں کرتے؟ وہ یہ کہتا تھا کہ میرا علم زیادہ ہوگیا ہے اور عمر کم ہے اس لئے میں نے علم روک دیا ہے تاکہ عمر بڑھے اور دونوں برابر ہوجائیں، انسان کبھی ایسی الجھن کا شکار ہوجاتا ہے،

امت سازی کے لئے پہلا مرحلہ نظریاتی اوراعتقادی مرحلہ ہے،اعتقادی مرحلے میں دو محور ہیں،ایک جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے بارے میں آگاہی ہواور دوسرا انسان کو خود اپنے بارے میں آگاہی ہونی چاہئیں۔یہ آگاہی انسان کونفسیاتی حدتک حاصل نہیں ہو بلکہ ایمانی حد تک جو آگاہی ہوگی وہی مکتب کی بنیاد بنتی ہے۔

اس کو مالی خولیا کہتے ہیں، یہ روانی حالت ہے یعنی جس کوابتدائی یا پرائمری پاگل پن کہا جاتا ہے، یہی بڑھ کر بعض اوقات جنون میں بدل جاتا ہے، یہ روانی اور نفسیاتی حالتیں ہم پر بہت طاری ہیں،کوئی اپنے آپ کومجاہد سمجھ رہا ہوتا ہے،کوئی کمانڈو سمجھ رہا ہوتا ہے،کوئی لیڈر سمجھ رہا ہوتا ہے،کوئی رہبر سمجھ رہا ہوتا ہے۔ایسے لوگ جوخواب دیکھتے ہیں وہ بھی عجیب وغریب خواب ہوتے ہیں کہ خواب میں مثلاً ان کا استقبال ہو رہا ہوتا ہے چونکہ یہ روانی اورنفسیاتی حالت ہے جو انسان کے اوپر چھائی ہوئی ہے۔جوخلوت نشین لوگ ہوتے ہیں یہ جب کسی اجتماع میں ہوتے ہیں تو یہ عالمِ خیال میں اسی قسم کے خیالات میں مبتلا ہوتے ہیں کہ میں تو ان معمولی لوگوں جیسا نہیں ہوں میں کدھر آ گیا ہوں، میں تو نظریاتی طور پر کوئی مافوق چیز ہوں۔اس طرح کا گمان بعض اوقات لوگوں کو ہوتا ہے اور پھر یہی چیز غرور وتکبر کی بنیاد بن جاتی ہے،بعض اوقات انسان یہ دیکھتا ہے کہ میں تو ان سے کہیں بہتر ہوں۔ یہ مالی خولیا ہے جو انسان کے ذہن میں بعض اوقات بیٹھ جاتا ہے، یہ مالی خولیائی مومن یا مسلمان امت نہیں بن سکتے ان کو اس نفسیاتی حالت سے باہر لانا ہے،تلقینات کے نتیجے میں جوتوہمات کا شکار ہوگئے ہیں یہ طلسمات توڑیں اور ختم کریں۔

تاریخ میں نفسیاتی حالت کے لوگ:

قریش اس قسم کی روانی حالت ونفسیاتی حالت کا شکار تھے جب رسول اللہؐ مکہ میں تشریف لائے تو قریش اس وقت اس حالت میں مبتلا تھے، وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے تھے۔اسی طرح فرعون اسی حالت میں مبتلا تھا اور کہتا تھا کہ ''انا ربکم الاعلیٰ''۔فرعون اپنے آپ کو رب کہتا تھا حضرتِ موسیٰؑ نے بہت زحمت ومحنت کی کہ اس کی نفسیاتی حالت ختم کی جائے، یہ توہمات سے باہر آ جائے لیکن وہ نہیں آیا اور آخر میں غرق ہوا۔ بنی اسرائیل بھی اس توّہم میں مبتلا تھے قرآن مجید میں آیا ہے وہ کہتے تھے کہ

''نحن ابناء اللہ،نحن احباء اللہ،نحن اولیاء اللہ''

یہ سارے ان کے اپنے عقائد تھے جنھیں قرآن بیان کر رہا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ ہم خدا کے پیارے، لاڈلے، ولی اور برگزیدہ ہیں بلکہ یہاں تک کہتے تھے کہ معاذاللہ ہم تو خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کی نفسیاتی حالت تھی جو ان پر طاری ہوئی تھی۔حضرتِ عیسیٰؑ کو ابناءاللہ کہنا علمی یا ایمانی حالت نہیں ہے بلکہ یہ ایک نفسیاتی حالت اور کاذب آگاہی ہے جوتلقینات کے نتیجے میں داخل ہوئی ہے۔آج مسلمان ان حالتوں میں بہت زیادہ مبتلا ہیں،مسلمانوں کے سارے فرقے ان نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہیں اور شاید ہم خود بھی ہوں۔

مخاطبِ قرآن بننا:

قرآن مجید کو پڑھنے کا ادب یہ ہے کہ جب سرزنش اور ملامت کی آیات آتی ہیں تو یہ نہ کہو کہ یہ دوسروں کے بارے میں ہیں،اس کو اس طرح سے پڑھو کہ یہ آیت مجھ سے ہی مخاطب ہے،قرآن کے مخاطب بنو اور یہ کہو کہ یہ آیت مجھ سے ہی مخاطب ہے اور جب بھی کوئی فضیلت بیان ہو رہی ہو تو یہ سمجھو کہ یہ دوسروں کے بارے میں ہے،اپنے آپ کو قرآن کا اس طرح مخاطب بنائے۔پہلے انسان یہ دیکھیں کہ کہیں ہم خود تو انہیں حالات کا شکار نہیں ہیں؟ کہیں ہم خود ان نفسیاتی مسائل کا شکار نہیں ہیں؟چونکہ ہم مالی خولیائی ہیں لہٰذا ہماری ہدایت کا امکان کم ہو جائے گا۔بنی اسرائیل نے رسول اللہ ﷺ پر اس لئے ایمان نہیں لایا کیوں کہ یہ مالی خولیائی تھے،ان کے اندر یہ روانی حالت تھی، وہ یہ خیال کرتے تھے کہ نبی صرف بنی اسرائیل سے ہوگا کیونکہ ہم برگزیدہ ہیں،ہمیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی

''لَن تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً'' (سورہ بقرہ،آیت۸۰)

ہم جہنم میں بالکل نہیں جائیں گے۔یہود ونصاریٰ کی آپس میں یہ جنگ تھی کہ یہود کہتے تھے کہ ہم جنت میں جائیں گے اور نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم جنت میں جائیں گے جبکہ قرآن مجید نے کہا کہ

''لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ'' (سورہ المائدہ،آیت ۶۸)

تم دونوں کچھ بھی نہیں ہو لہٰذا تم دونوں جہنم میں جاؤ گے

یعنی یہودی نفسیاتی مومن ہیں، یہودی ابھی بھی روئے زمین پر کسی کو بھی اپنے برابر نہیں سمجھتے ہیں، وہ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی نہیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ہم ان کو یہود بنائیں، پس یہود اس نفسیاتی حالت کا شکار ہیں اس لئے قابلِ ہدایت بھی نہیں ہیں، مسیحی مسلمان ہو جاتا ہے لیکن یہودی کبھی بھی نہیں ہوتا۔ بعض مسلمان فرقوں کے اندر اگر دیکھیں جیسے یہ جو دہشت گردی کے اوپر مذہبی رنگ چڑھا دیا گیا ہے یہ بھی نفسیاتی حالت ہے مثلاً یہ خودکش بمبار کیسے بنا لیتے ہیں؟ ایک آدمی اپنی جان کیسے قربان کر دیتا ہے؟ نہ یہ علم ہے اور نہ ہی ایمان ہے بلکہ خودکش حملوں کے جو ماہرین ہیں یہ قاری، حافظ وغیرہ ہوتے ہیں ان کو اتنی مہارت ہوتی ہے کہ نابالغ بچوں کی نفسیاتی حالت بنانے کے ماہر ہوتے ہیں، ان بچوں کو آگہی نہیں دیتے بلکہ تلقین کرتے ہیں اور انسان تلقین پذیر ہے، تلقین قبول کرتا ہے، تلقینات کے نتیجے میں ایسی ذہنی حالت اس کی بنا دی جاتی ہے کہ وہ ایک خاص قسم کے توہّم کا شکار ہو جاتا ہے اور اسی میں وہ جان بھی دے دیتا ہے مثلاً جو خودکش حملہ کرتا ہے شاید اس کو اللہ کا نام لکھنا بھی نہ آتا ہو، نماز پڑھنا بھی نہ آتی ہو لیکن وہ دین کے لئے اور جنت کے لئے خودکش کر رہا ہے۔ منبروں پر عموماً یہ کام ہوتا ہے، تلقین ہوتی ہے اور نفسیاتی حالت بنائی جاتی ہے اور وہ بھی ایمان کے مشابہ نفسیاتی حالت پیدا کی جاتی ہے۔ توہّم ایجاد کیا جاتا ہے، پھر عوام منبروں سے تلقینات سن سن کر توہّم زدہ ہو جاتے ہیں، عوام میں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ صفات ہمارے اندر پائی جاتی ہیں اور یہی درست راستہ ہے۔

پس امت سازی کے لئے پہلا مرحلہ نظریاتی اور اعتقادی مرحلہ ہے، اعتقادی مرحلے میں دو محور ہیں، ایک جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے بارے میں آگاہی ہو اور دوسرا انسان کو خود اپنے بارے میں آگاہی ہونی چاہئیں۔ یہ آگاہی انسان کو نفسیاتی حد تک حاصل نہیں ہو بلکہ ایمانی حد تک جو آگاہی ہوگی وہی مکتب کی بنیاد بنتی ہے اور مکتبِ اسلامی یا امت سازی کا پہلا مرحلہ ''لا الہ الاّ اللہ'' ہے، اس لئے کہا تھا کہ دشوار ترین مرحلہ یہی ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اچھی اچھی تقریریں، تلقینات، شاعری اور خطابت کر کے لوگوں کے احساسات اور جذبات ابھار کر لا الہ الاّ اللہ کے متعلق کسی کی نفسیاتی حالت بنا دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لا الہ الاّ اللہ کے بارے میں لوگوں کو فراوان معلومات دے کر، ایک ذخیرہ بنا دیں۔ جس طرح کہ بہت سارے لوگ ہیں جو متخصصِ علمِ کلام ہیں، یہ ماہرینِ علمِ کلام ہیں، یہ صدر المتکلمین ہیں کیونکہ ان کو اگر کسی نے علم کلام میں ایک جملہ بھی کہا ہے تو وہ بھی ان کو پتہ ہے۔

جزوِ امت بننے کا راز:

امت سازی کیلئے صرف نفسیاتی آگاہی کافی نہیں ہے، اس آگاہی سے مناظرہ ہو سکتا ہے، فرقہ بنایا جا سکتا ہے لیکن امت نہیں بنائی جا سکتی۔ وہ آگاہی جس کی قرآن بات کر رہا ہے، جسے رسول اللہ ﷺ، انبیاءؑ اور آئمہؑ نے اپنے پیروکاروں کو عطا کیا ہے یہ سب سے مشکل کام ہے اور وہ ایمانی آگاہی ہے، یعنی درجۂ ایمان تک آگاہی دینا ہے جو ذہن کی حد تک نہ ہو بلکہ دل کی حد تک اس آگاہی کو پہنچا دینا ہے، انسان کو باور ہو جائیں اور یہی امت سازی کی پہلی اینٹ ہے۔ اگر کوئی یہ مرحلہ طے نہیں کر سکتا وہ جزءِ امت نہیں بن سکتا ہے، وہ عالم، پروفیشنل اور ذہنی مومن بن سکتا ہے، نفسیاتی مومن بن سکتا ہے و بہت ساری اور چیزیں بن سکتا ہے لیکن وہ امت کا جزء نہیں بن سکتا ہے۔ امت میں جزئیت کے لئے اس پہلے مرحلے کو حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔

ربوبیتِ خدا و عبودیتِ انسان:

ایمانی آگاہی میں بھی دو بہت اہم چیزیں ہیں جن پر قرآن زیادہ تاکید کرتا ہے، ان میں سے ایک ربوبیتِ خداوند تبارک و تعالیٰ ہے اور دوسرا عبودیتِ انسان ہے۔ عبودیتِ انسان آگاہی بھی ہے اور انسان کی ایک صفت بھی ہے یعنی آگاہی صفت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ صدر المتألھین فرماتے ہیں کہ عبودیت آگاہی سے شروع ہوتی ہے اور حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے پھر عبودیت سے بڑھ کر یعنی صفت سے بڑھ کر خودِ انسان بن جاتی ہے یعنی

ایمانی آگاہی میں بھی دو بہت اہم چیزیں ہیں جن پر قرآن زیادہ تاکید کرتا ہے، ان میں سے ایک ربوبیتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے اور دوسرا عبودیتِ انسان ہے۔ عبودیتِ انسان آگاہی بھی ہے اور انسان کی ایک صفت بھی ہے یعنی آگاہی صفت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

انسان مترادفِ باعبودیت ہو جاتا ہے۔

اس لا الہ الاّ اللہ میں دو محور ہیں، ایک ربوبیتِ خداوند تعالیٰ اور ایک عبودیتِ انسان ہے۔ یہ دونوں محور سب سے دشوار کام ہے، انبیاءؑ یہ دشوار مرحلہ طے کرتے تھے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اگر کوئی شخص آتا تو آپؐ اتنے لمبے چوڑے دروس نہیں پڑھاتے تھے، کسی نبی نے کوئی مدرسہ نہیں بنایا لیکن بہترین مومن بنائے ہیں چونکہ ہم علم کے ذریعے سے یہ کام حاصل کرنا چاہ رہے ہیں مگر وہ ایمان کے ذریعے سے یہ کام حاصل کرتے تھے، وہ آگاہی آسان تر تھی ہم نے آکر اس کو پیچیدہ بنا دیا ہے، چونکہ ہم نے علوم کو مکتب کا جانشین بنا دیا ہے، مکتب کی جگہ علوم سیکھتے ہیں، ہم ڈگریاں لیتے ہیں، پی ایچ ڈی کرتے ہیں، پروفیسر بنتے ہیں، سکالر بنتے ہیں حتیٰ فقیہِ علم بنتے ہیں لیکن فقیہِ مکتب نہیں بنتے۔ امام خمینیؒ نے دونوں کام کیے ہیں فقیہِ علم بھی تھے اور فقیہِ مکتب بھی تھے، فقیہِ علم میں امامؒ کے شاگرد موجود ہیں جو ابھی مجتہد ہیں خود فقیہ ہیں اور امامؒ نے مکتب کے تحت جوامت بنائی وہ بسیج ہے۔ بسیج امام خمینیؒ کا نمونہ ہے۔

> **رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اگر کوئی شخص آتا تو آپ اسے لمبے چوڑے دروس نہیں پڑھاتے تھے، کسی نبی نے کوئی مدرسہ نہیں بنایا لیکن بہترین مومن بنائے ہیں چونکہ ہم علم کے ذریعے سے یہ کام حاصل کرنا چاہ رہے ہیں مگر وہ ایمان کے ذریعے سے یہ کام حاصل کرتے تھے۔ امام خمینیؒ نے دونوں کام کیے ہیں۔ فقیہِ علم بھی تھے اور فقیہِ مکتب بھی تھے۔ امامؒ نے مکتب کے تحت جوامت بنائی وہ بسیج ہے۔**

محورِ اُمت، اقبالؒ کی نظر میں:

علامہ اقبالؒ کی نظر میں امت سازی کا یہی منشور ہے، انہوں نے لا الہ الاّ اللہ کو ہی مرکز قرار دیا ہے کہ یہیں سے سب کچھ حاصل ہوگا۔ ہم لا الہ الاّ اللہ کو کس طرح سے لیں؟ کیا نقشہ ہمارے ذہن میں ہو؟ اقبال کے بقول کہ

زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اذان میں صبح وشام ہم ''اللہ اکبر، اشھد ان لا الہ الاّ اللہ'' کہہ دیتے ہیں، بعض فقط سُر لگانے کے لئے اذان دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ میری آواز کیسی ہے؟ یہ رسمِ اذان ہے، یہ گواہی نہیں ہے، یہ ''اشھد ان لا الہ الاّ اللہ'' نہیں ہے۔ ہمیں اُس گواہی تک پہنچنے کی ضرورت ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ زبان، عمل، سوچ، فکر، رویہ، اخلاق، اعضاء وجوارح اور ہر چیز'' اشھد ان لا الہ الاّ اللہ'' کی گواہی دیں۔ ابھی ہم زبان سے لا الہ الاّ اللہ کہتے ہیں یہ ہماری نفسیاتی حالت ہے۔ اس کو علمی آگاہی میں بدلنا ہے اور پھر علمی آگاہی سے ایمانی آگاہی یعنی حقیقی آگاہی تک جانا ہے جس سے انسان اور مکتب کی بنیاد بنتی ہے اور جس پر امت استوار ہوتی ہے۔

امت سازی ازنظر قرآن ۸

گروہ معارف

”وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ اُمَّةٌ“ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولَٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ“ عَظِيْمٌ“““

(سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

اُمت سازی کا آغاز:

رسول اللہ ﷺ نے امت سازی کا پہلا مرحلہ مکہ میں شروع کیا تھا اور مکی دور نظریاتی اور اعتقادی مرحلہ تھا، مکی لوگوں اور مکی ذہنیتوں میں جہاں پر کسی قسم کی آئیڈیالوجی، مکتب اور نظریہ موجود نہیں تھا بلکہ صرف اور صرف جاہلیت اور رسومات تھیں، اس جاہلیت کے دور میں آ کر کوئی نظریاتی قدم اٹھانا اور اس کے اندر نظریاتی بیج بونا یہ دشوار ترین کام اور دشوار ترین مرحلہ تھا خصوصاً جس نظریے اور اعتقاد کا آپؐ پرچار کر رہے تھے اُس میں اور جو ان کی موجودہ حالت تھی اُس میں ایک سو اسّی درجے کا فاصلہ تھا یعنی ان لوگوں کو جو کچھ چھوڑنا تھا اور جو کچھ اپنانا تھا اس میں اتنا زیادہ فاصلہ تھا کہ بہت ذہین لوگوں سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اتنی جلدی یہ فاصلہ طے کر سکیں گے۔

امت سازی میں حضرت خدیجہؑ کا کردار:

اس مشکل ترین مرحلے میں حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا۔ اس پیغام کو سن کر آپ سلام اللہ علیہا نے معجزہ طلب نہیں کیا بلکہ دعوت سنتے ہی آپ سلام اللہ علیہا کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کی دعوت ہے اور یہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ شوہر کہہ رہے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ دعوت شناس و پیغام شناس تھیں، آپ سلام اللہ علیہا کو بعد میں آنے والے مشکلات کا بھی اندازہ تھا، وہ جانتی تھیں کہ بت پرستی، شرک اور جاہلیت سے بھرے معاشرے میں ہدایت کا راستہ کھولنا کتنا مہنگا پڑے گا اور آپ سلام اللہ علیہا کو یہ بھی معلوم تھا کہ جو لوگ مغرب کی طرف جا رہے ہیں اُن کو مشرق کی طرف پلٹانے یا جو مشرق کی طرف جا رہے ہوں اُن کا رخ مغرب کی طرف کرنے میں کس قدر دشواریاں اور سختیاں ہوں گی اور کس طرح کے مصائب درپیش ہوں گے، حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کو بخوبی علم تھا اور عالمانہ و آگاہانہ طور پر اس عمل میں شریک ہوئیں، باقی ازواجِ رسول اللہ ایک بنے بنائے مکتب کے زیرِ سایہ آئیں اور انہوں نے اس کے زیرِ سایہ استفادہ کیا لیکن آپ سلام اللہ علیہا رسول اللہ ﷺ کی وہ جانثار زوجہ ہیں جنھوں نے بے حساب قربانیاں دیں۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے درحقیقت اہم ترین، نازک ترین اور حساس ترین مرحلے میں اس نہضت میں شمولیت اختیار کی اور ذمہ دار بنیں، ذمہ داریاں اپنے دوش پر لیں اور بھی کوئی چھوٹی ذمہ داریاں یا حاشیے کی ذمہ داریاں نہیں تھیں بلکہ اصلی ذمہ داریاں اپنے دوش پر لیں لہٰذا نہضت اسلام میں جن شخصیات کا اہم کردار رہا ہے ان میں آپ سلام اللہ علیہا سرِ فہرست ہیں۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کو بخوبی علم تھا اور عالمانہ و آگاہانہ طور پر اس عمل میں شریک ہوئیں، باقی ازواجِ رسول اللہؐ ایک بنے بنائے مکتب کے زیرِ سایہ آئیں اور انہوں نے اس کے زیرِ سایہ استفادہ کیا لیکن آپ سلام اللہ علیہا رسول اللہ ﷺ کی وہ جانثار زوجہ ہیں جنھوں نے بے حساب قربانیاں دیں۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے درحقیقت اہم ترین، نازک ترین اور حساس ترین مرحلے میں اس نہضت میں شمولیت اختیار کی اور ذمہ دار بنیں

دورِ جدید میں قوّتِ ادراک کی کمی:

ظہورِ اسلام کے چودہ سو سال بعد آج کے اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں رسول اللہ ﷺ کا پیغام پیش کریں تو لوگوں کو اس پیغام کو سمجھنے میں مشکل پیش آرہی ہے، آج جبکہ اسلامی تعلیمات عام ہو چکی ہیں، قرآن اور عبادات سے لوگ مانوس ہو چکے ہیں، لوگ پیدائشی و موروثی طور پر دین سے آشنا ہیں پھر بھی جب روحِ پیغامِ رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے پیش کی جائے تو ان کو درک کرنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے لیکن حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا ایک ایسے معاشرے کی خاتون تھی جس کا پہلے اسلام سے کوئی سابقہ نہیں تھا، کسی قسم کی آمادگی نہیں تھی جب اُس وقت پیغامِ دین سامنے آیا تو یہ خاتون فوراً اس کو سمجھ گئیں، اپنا بھی لیا، عملاً اس میں شریک بھی ہو گئیں اور ہر قسم کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے اس راہ میں جان بھی دے دی۔ پس حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی وفات درحقیقت شہادت ہے چونکہ یہ شعبِ ابی طالبؑ میں وفات پا گئی ہیں اگرچہ قتال، جنگ یا نبرد نہیں تھی لیکن نہضت اور مبارزہ تھا اس مبارزے کے دوران آپ سلام اللہ علیہا کی رحلت ہوئی ہے لہٰذا آپ کی موت شہادت ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہی پیغام جو حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کو اس حالت میں ملا اور انہوں نے قبول کر لیا، آج اگر وہی پیغام علمائے دین کے سامنے بھی رکھیں تو ان کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، جنہوں نے دین کا اتنا سلیبس پڑھا ہوا ہے، جنہوں نے قرآن اتنا پڑھا ہوا ہے، قرآن حفظ کیا ہوا ہے، دین کی اتنی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں لیکن وہ نکتہ جو آپ سلام اللہ علیہا کو سمجھ میں آیا آج وہ بڑے بڑے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا یا نہیں آرہا ہے چونکہ امت سازی کا نظریاتی مرحلہ سب سے دشوار مرحلہ ہے اور یہی اساس و بنیاد ہے۔ آپ سلام اللہ علیہا ان چار ہستیوں اور شخصیات میں شمار ہوئیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ ارکانِ اسلام و ارکانِ دین ہیں، ہم بہت ہی فرعی مسائل ان عظیم شخصیات کے بارے میں جانتے ہیں اور انہیں اہمیت دیتے ہیں جبکہ ان کے اصلی کارنامے کی طرف توجہ نہیں ہے کہ ان کی اصلی خوبی کیا تھی؟ رسول اللہ ﷺ کیوں ان کو اتنا مقام اور اتنی اہمیت دیتے تھے؟ اگر آج بھی کوئی ان ہستیوں کا کارنامہ کر کے دکھائے تو اس کا مقام عظیم ہوگا، آج کے حالات اُس زمانے کے حالات سے بہت ہی مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود اگر آج بھی کوئی مرد وہ مرحلہ انجام دے تو وہ بھی بہت باعظمت کہلائے گا یعنی پیغامِ وحی کو درست طور پر سمجھ جائے اور اس پر ایمان لے آئے، اتنا ایمان لے آئے کہ پھر وہ اس کی زندگی کا حصہ بن جائے۔

نظریاتی مرحلے کا پہلا قدم اور حقیقت:

نظریاتی مرحلے میں پہلا قدم جو رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا وہ یہ تھا کہ اس کائنات کا خالق، مالک اور رب ہے جس سے لوگ بالکل آشنا نہیں تھے، لوگوں نے سنا بھی نہیں تھا، وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت ہی ہیں جنھوں نے سب کچھ بنایا ہے۔ یہ بھی نفسیاتی حالت ہوتی ہے کہ وہ بت جو انہوں نے خود گھڑے تھے، بنانے کے بعد یہ عقیدہ بنا لیا کہ یہ بت ہی ہمیں سب کچھ دیتا ہے، یہ ذہنی طور پر اتنے گرے ہوئے تھے کہ معمولی سی بات کو بھی درک کرنے سے عاجز تھے کہ جو مورتی ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے وہ مورتی کیونکر ہمارے اوپر اثر انداز ہو سکتی ہے اور وہی جاہلیت ابھی تک برقرار ہے، لوگ آج بھی پہاڑی سے جا کر قیمتی پتھر نکال کر مشینوں سے تراشتے ہیں پھر چاندی کی انگشتر بنا کر اُس میں لگا کر انگوٹھی بنا کر پہنتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس انگوٹھی نے رزق بڑھا دیا ہے، یہ وہی جاہلیت ہے۔ جب انسان اتنا بے شعور ہو جائے، اس قدر پست ہو جاتا ہے کہ جو چیز خود اس نے بنائی ہے اس کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ مجھے کچھ عطا کر رہی ہے، اس کی وجہ سے مجھے کچھ خیر مل رہا ہے، یہی اس معاشرے کی نظریاتی پستی ہے اور حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا ایک ایسے ہی معاشرے میں رہ رہی تھیں لیکن بہت اعلیٰ شعور کی مالک تھیں۔ اُس معاشرے کے لوگوں اور آپ سلام اللہ علیہا میں بہت زیادہ نظریاتی فاصلہ تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ جونہی رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ عام کی آپ سلام اللہ علیہا نے بغیر کسی چوں چرا کے اس کو قبول کر لیا چونکہ وہ سمجھ گئی تھیں کہ یہ درست اور الٰہی بات ہے، یہ کوئی زمینی اور بشری بات

نہیں ہے اور حتیٰ آپ سلام اللہ علیہا یہ سمجھ گئیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا کلام نہیں ہے چونکہ آپؐ کے ساتھ زندگی بسر کر چکی تھیں، ہر روز آپؐ کی باتیں سنتی تھیں اور یہ باتیں سن کر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ ان کی اپنی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ میاں بیوی روزانہ ہر موضوع پر آزاد گفتگو کرتے ہیں اور مرد کی نفسیات سے بیوی آشنا ہوتی ہے پس جیسے ہی آپؐ نے ایک انوکھی بات کی آپ سلام اللہ علیہا نے کہا کہ یہ بات یقیناً عالمِ غیب یا کسی اور منبع سے ہے۔ پس یہ چیز اعلیٰ شعور مانگتی ہے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں کے لئے خدا فراموش تھا اس کی جگہ شیطان معبود تھا، معبودیتِ شیطان اس معاشرے کے اندر باقاعدہ مذہب بن چکی تھی اور لوگ شیطان کی پرستش کر رہے تھے اس معاشرے میں ایک خاتون جو اُس معاشرے میں نظرانداز مخلوق تھی، انسانیت میں شمار نہیں ہوتی تھی اُس معاشرے میں ایک خاتون اعلیٰ شعور کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور وہ بھی نہضت کے سخت ترین مرحلے میں سب سے سبقت لے جاتی ہے۔ آج چودہ سو سال بعد بھی اگر کوئی شخص اس نظریاتی مرحلے میں دوسروں پر سبقت لے جائے تو درحقیقت اس نے سیرتِ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا پر عمل کیا ہے جو یہ تشخیص دینے میں کامیاب ہو جائے کہ یہ خدا کا دین ہے اور یہ مکتب اللہ کی طرف سے ہی ہے اور یہ کوئی بشری بات نہیں ہے۔

سابقین:

آج ہمارے پاس بشری باتیں بہت ہیں، مثلاً اس طرح کہنا کہ فلاں فرقہ اُدھر جا رہا ہے، فلاں اِدھر جا رہا ہے، فلاں بزرگ یوں کرتے تھے، بڑے یوں کرتے تھے،، علماء یوں کہتے ہیں یہ سب نظریات ابھی بھی ہمارے پاس موجود ہیں، ان نظریات کے اندر خداوند تعالیٰ کا مسلک تشخیص دینے کیلئے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا جیسا ذہن چاہیئے، اتنا اعلیٰ شعور چاہیے جس میں انسان یہ تشخیص دے سکے کہ انسانی ذہن کی بنائی ہوئی بات کونسی ہے اور آسمانی تعلیم کیا کہہ رہی ہے؟ آج بشر کی بنی ہوئی بہت ساری چیزیں ہمارے سامنے ہیں جن میں ہم خود موجود ہیں، ہم ایک ایسے سیاسی نظام میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو بشری نظام ہے، ہم حتیٰ ایک ایسے مذہب کے پیروکار ہیں جو بشر نے بنایا ہے، ہم بشری مذہب کے پیروکار ہیں، آج چودہ سو سال بعد جب ہم قرآن سے مانوس اور آشنا ہو چکے ہیں اس کے باوجود بھی اگر کوئی تشخیص دینے میں کامیاب ہو جائے وہ بھی سابقین میں سے ہی شمار ہوگا اور قرآن مجید نے سابقین کا درجہ محفوظ رکھا ہے کہ

"وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۔اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ" (سورہ واقعہ، آیت ۱۰،۱۱)

ہم مقربون کا مطلب تعلقاتی کرتے ہیں، جن کے تعلقات اللہ سے ہیں یہ معنی غلط ہے، مقربون سے مراد منزل کے قریب ترین لوگ ہیں جو منزل کے بالکل دہلیز پر پہنچے ہوئے ہوں اور جو اس سفر میں منزل کے بالکل قریب ترین منزل تک پہنچ چکے ہوں وہ سابقین کہلاتے ہیں۔ سبقت سے مراد زمانے کے لحاظ سے سبقت لے جانا نہیں ہے مثلاً فرض کریں کہ آج ہم انقلابِ اسلامی کے تینتیس سال بعد بیٹھ کے امامؒ کے افکار پیش کرتے ہیں ایرانی قوم نے تینتیس سال پہلے امامؒ کے افکار کو قبول کیا۔ پاکستان میں اگر تینتیس سال بعد ایک قوم اٹھے اور امامؒ کے افکار کو لے کر ایرانیوں سے بہتر کارکردگی دکھائے تو خدا کی بارگاہ میں یہ سابقین میں سے شمار ہوں گے، یہ اُن پر سبقت لے جائیں گے، اگرچہ زمانے کے لحاظ سے انہوں نے کام پہلے شروع کیا ہے لیکن یہ سبقت لے جائیں گے۔ اس وقت بہت سارے میدانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ حزب اللہ بہت سارے شعبوں میں سبقت لے گئی ہے، لبنانی مومنین سبقت لے گئے ہیں۔

عالم اور جاہل میں فرق:

علمِ فلسفہ میں سبقت کی پانچ قسمیں مشہور تھیں ان میں سے ایک کسی پر زمانے کے لحاظ سے سبقت لے جانا ہے اور زمانے کی سبقت فضیلت، قدر یا ویلیو شمار نہیں ہوتی جب کہ باقی سبقتیں ویلیوز کا حصہ ہیں۔ ایک سبقت اہلِ علم کی غیر اہل پر سبقت ہے یعنی جہلاء پر علماء کی سبقت ہے مثلاً فرض کریں کہ غیر عالم سو سال کا ہے جبکہ عالم بیس سال کا ہے، یہاں پر دین کی تعبیر کے مطابق بیس سالہ عالم سو سالہ غیر عالم پر سبقت رکھتا ہے، یہ سابقین میں سے شمار ہوگا۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا ایک ایسے معاشرے کی خاتون تھی جس کا پہلے اسلام سے کوئی سابقہ نہیں تھا، کسی قسم کی آمادگی نہیں تھی جب اُس وقت پیغامِ دین سامنے آیا تو یہ خاتون فوراً اس کو سمجھ گئیں، اپنا بھی لیا، عملاً اس میں شریک بھی ہو گئیں اور ہر قسم کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے اس راہ میں جان بھی دے دی۔ پس حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی وفات درحقیقت شہادت ہے

علم ودانش کے بارے میں ایک فارسی شعر ہے

آن را کہ فضل ودانش وتقویٰ مسلم است

ہر جا قدم نہد قدمش خیر مقدم است

وہ شخص جس کے پاس علم، فضل، دانش اور تقویٰ ہے یہ جہاں بھی قدم رکھے اسے انسان، ملائکہ اور ہر مخلوق خیر مقدم کہتی ہے۔ یہ روایت میں ہے کہ طالب علم واہلِ علم وہ ہے جس کیلئے کائنات کی ہر مخلوق اور ہر ذرہ خداوندمتعال سے دعا ومغفرت طلب کرتا ہے حتیٰ سمندر کی مچھلیاں بھی طالب علم کے لئے دعا کرتی ہیں، اس لیے اہلِ علم واہل دانش جہاں بھی قدم رکھے اس کا مقام ارجمند ہے۔

در پیشگاہِ علم مقامِ عظیم نیست

از ہر مقام ومرتبہ ای علم اعظم است

علم کے مقابلے میں کوئی مقام ومرتبہ نہیں ہے سب سے اعلیٰ مقام ومرتبہ انسان کے لئے علم ہے۔

جاہل اگرچہ یافت تقدم مؤخر است

عالم اگرچہ زاد مؤخر مقدم است

جاہل کو اگرچہ زمانے کے لحاظ سے تقدم وسبقت مل گئی ہے لیکن دراصل یہ بہت پیچھے ہے، عالم اگرچہ بعد میں پیدا ہوا ہے لیکن پھر بھی جاہل پر تقدم وسبقت رکھتا ہے مثلاً اگر جاہل بس کی پہلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے اور عالم وفاضل بس کی آخری سیٹ پر بیٹھا ہوا ہو، اب اگر سیٹ کے لحاظ سے دیکھیں تو جاہل مقدم ہے اور عالم مؤخر ہے لیکن درحقیقت یہ آخری سیٹ پر بیٹھ کر بھی اس پر مقدم ہے اور اس سے سبقت رکھتا ہے۔ جاہل کا گھر بڑا وسیع وعظیم ہو مگر عالم کے پاس ایک جھونپڑا ہو یہ پھر بھی اس پر مقدم ہے۔ جاہل کے پاس ساری دنیا آجائے لیکن عالم کے پاس کچھ بھی نہ ہو یہ پھر بھی اس پر مقدم ہے اور جاہل اگر سو سال پہلے پیدا ہوا ہے جبکہ عالم آج پیدا ہوا ہے عالم پھر بھی اس پر مقدم ہے۔

جاہل بہ روز فتنہ رہِ خانہ گم کند

عالم چراغ جامع وچشمِ عالم است

جب فتنہ، تاریکی اور ظلمت آتی ہے تو جاہل اپنا گھر بھی بھول جاتا ہے اور عالم نہ صرف گھر نہیں بھولتا بلکہ وہ خود روشنی کا چراغ بن کر دوسروں کو بھی روشنی عطا کرتا ہے اور پورے عالم کو نورانی کر دیتا ہے۔

حضرت خدیجہؑ کی سبقت:

سبقتیں بہت ساری ہیں بعض علماء نے سبقت کی اقسام دس تک ذکر کی ہیں جن میں سے ایک حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی سبقت ہے اور اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ سلام اللہ علیہا کا زیادہ احترام کرتے تھے کیونکہ جو اس میدان میں سبقت لے جائے وہ اتنا ہی محترم ہوتا ہے، بے شک آج چودہ سو سال بعد کوئی اس معنی اور مفہوم کو دریافت کرنے میں سبقت لے جائے وہ سابقین کے ساتھ ہی شمار ہوگا یعنی ''لا الہ الاّ اللہ'' کو سمجھنے میں جو سبقت لے جائے، جو بنیاد دین، بنیاد مکتب اور بنیادِ امت ہے۔ نظریاتی مرحلے میں پہلا کام لا الہ الاّ اللہ ہے۔ لا الہ الاّ اللہ کا مطلب یعنی یہ کائنات بغیر خالق کے نہیں ہے اس کو ہم نے نفسیاتی حالت یعنی توھّم کے طور پر ذہن میں نہیں رکھنا بلکہ اس کو تصدیق تک لے آئیں کہ کائنات کا کوئی خالق ہے مثلاً ہم شہر میں جاتے ہیں، ہمارے دائیں بائیں بہت سارے گھر بنے ہوئے ہوتے ہیں اور گھروں کے دروازے بھی کھلے ہوتے ہیں لیکن ہم کسی گھر میں داخل نہیں ہوتے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اس گھر کا کوئی مالک ہے اور گھر کے اندر اس کی ناموس ہے جو ہمارے لئے نامحرم ہے۔ یہ آپ کی آگاہی ہے۔ گھر میں داخل ہونے سے جو چیز روک رہی ہے وہ یہی آگاہی ہے کہ یہ ایک گھر ہے جس کا کوئی مالک ہے پس ہم اس میں داخل نہیں ہوتے۔ پس ہمارے ذہنوں میں آگاہی موجود ہے یعنی ایسی آگاہی

لوگ آج بھی پہاڑی سے جا کر قیمتی پتھر نکال کر مشینوں سے تراشتے ہیں پھر چاندی کی انگشتر بنا کر اُس میں لگا کر انگوٹھی بنا کر پہنتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس انگوٹھی نے رزق بڑھا دیا ہے، یہ وہی جاہلیت ہے۔ جب انسان اتنا بے شعور ہو جائے، اس قدر پست ہو جاتا ہے کہ جو چیز خود اس نے بنائی ہے اس کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ مجھے کچھ عطا کر رہی ہے، اس کی وجہ سے مجھے کچھ خیر مل رہا ہے، یہی اس معاشرے کی نظریاتی پستی ہے

ایک خاتون جو اُس معاشرے
میں نظر انداز مخلوق تھی، انسانیت میں شمار نہیں ہوتی تھی
اُس معاشرے میں ایک خاتون اعلیٰ شعور کے ساتھ پیدا ہوتی ہ
ے اور وہ بھی نہضت کے سخت ترین مرحلے میں سب سے سبقت
لے جاتی ہے۔ آج چودہ سو سال بعد بھی اگر کوئی شخص اس نظریاتی
مرحلے میں دوسروں پر سبقت لے جائے تو درحقیقت اس ن
ے سیرتِ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا پر عمل کیا ہے جو یہ تشخیص دینے میں
کامیاب ہو جائے کہ یہ خدا کا دین ہے اور یہ مکتب اللہ کی
طرف سے ہی ہے اور یہ کوئی بشری بات نہیں ہے۔

جس میں انسان ذہن میں تصور بھی رکھتا ہے کہ یہ کسی کا گھر ہے اور دل کے اندر بھی انسان کا یہ ایمان ہے کہ یہ کسی کا گھر ہے اور عمل، جوارح اور اعضاء بھی اس بات کی تائید کر رہے ہیں کہ اس کا کوئی مالک ہے یعنی یہ بات کہ یہ کسی کا گھر ہے اور اس میں کوئی رہ رہا ہے یہ آگاہی فقط ذہنی حالت کا نام نہیں ہے، یہ فقط ایک علم نہیں ہے، یہ آگاہی علم سے بڑھ کر ہے، یہ ایمان ہے، اس آگاہی نے وجود کے اندر جو مرکز ہے اس کو سنبھال لیا ہے اب اعضاء و جوارح اس آگاہی کے مطابق چلیں گے یعنی اعضاء و جوارح کو جو فرمان اور دستور ملے گا وہ فرمان اس آگاہی کی طرف سے صادر ہوگا، یہ اتنی راسخ آگاہی ہے جو فقط انسان کے کان میں نہیں پڑی بلکہ کان سے ذہن میں گئی، ذہن سے دل میں گئی اور دل سے سراپا وجود میں چلی گئی، جب انسان کے سراپا وجود میں یہ آگاہی چلی جاتی ہے تو انسان کا معمولی عضو بھی اس آگاہی کے برخلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا چونکہ یہ معلوم ہے کہ یہ کسی کا گھر ہے اور اس کے اندر کوئی اور رہتا ہے۔

مالکِ کائنات سے آگاہی:

جس کائنات میں ہم پیدا ہوئے ہیں اس کا کوئی مالک ہے، ہمارے رویے بتاتے ہیں کہ ہم کس طرح اس کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ رویے بتاتے ہیں کہ ہماری آگاہی ہے یا نہیں ہے؟ اگر ہم بے باک ہو کر رہتے ہیں، اگر ہم چور اور ڈاکوؤں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جو ہر گھر میں گھس جاتے ہیں انہیں اس چیز کی پرواہ نہیں ہے کہ یہ کس کا گھر ہے پھر ہم میں مالکِ کائنات کے بارے میں آگاہی نہیں ہے۔ جس انسان میں کائنات کے مالک کے بارے میں آگاہی ہو اُس کے اعمال، حرکات، سکنات، تفکرات، رجحانات، تمایلات، خیالات اور خواہشات سب کے سب اس آگاہی کے زیرِ اثر آجاتے ہیں۔ مالک سے مراد وہ مالکیت نہیں ہے جو انسان کی زمین پر مالکیت ہے۔ اسی لئے یہ مرحلہ سب سے زیادہ دشوار ہے، ہم علمی اعتقاد رکھتے ہیں، عقیدہ علم کی شکل اختیار کر گیا ہے، ہم عقائد کی کتابیں پڑھتے ہیں کلاس میں استاد درس دیتا ہے ہم سن لیتے ہیں اور اس کو لکھ لیتے ہیں جس سے ہمارا عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے لیکن عمل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اس کو سو دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں کہ خدا ہے لیکن یہ خدا ایک علمی جملے کے طور پر ہے ہمارے حافظے میں پڑا ہوتا ہے حافظے سے نکل کر وجود کے باقی حصوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا مثلاً قرآن حفظ کر لیتے ہیں، قرآن حفظ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا حافظہ ہے، ہم قرآن کو اس میں ڈال دیتے ہیں، صرف حافظے میں پڑا ہوا ہے لیکن حافظے کے علاوہ جو وجود کے باقی حصے ہیں ان سے اس فائل کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ صرف ریکارڈ کے طور پر رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ پس معلومات وہ آگاہی شمار نہیں ہوتیں جن کی بنیاد پر ہمیں امت بنانی ہے، جس نظریے کی بنیاد پر امت کا وجود بنتا ہے۔

درست آگاہی:

مالکِ کائنات سے آگاہی الگ طرح کی آگاہی ہے، یہ آگاہی انبیاءؑ ہی دوسرے لوگوں کو دینے کے ماہر ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے انبیاءؑ سے سیکھا ہے وہ ہی لوگوں کے دلوں میں یہ آگاہی ڈال سکتے ہیں لیکن کلاسک آگاہی صرف انسان کی میموری میں ڈالی جاتی ہے تاکہ حافظے میں ایک چیز رہے اور حافظے سے بڑھ کے وجود کے دوسرے حصوں میں سرایت نہ کرے مثلاً علمِ کلام میں جو عقائد پڑھائے جاتے ہیں یہ صرف ہمارے حافظے میں ہیں، حافظے سے ہماری سوچ، فکر، ارادے اور ہمارے فیصلوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے جیسے مذہبی لوگ کمپیوٹر میں مذہبی باتوں کو ڈیزائن کر کے وال پیپر بنا کر سکرین پر لگاتے ہیں۔ جس قسم کا آدمی ہے اس نے اپنے کمپیوٹر کی سکرین پر ویسا ہی وال پیپر لگایا ہوتا ہے، اسی طرح جیسے موبائل کی ٹون اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ انسان کس مزاج کا ہے؟ کسی نے گانا، کسی نے قوالی، کسی نے میوزک اور کسی

نے نوحہ لگایا ہوا ہوتا ہے، یہ نوحہ جو لگتا ہے یہ فقط ایک ٹون ہے، یہ رونے اور سوگواری کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ اس لئے ہے کہ جب کسی کی کال آئے تو پتہ چل جائے لہٰذا جب نوحے کا جملہ موبائل پر بجتا ہے تو لوگ ماتم کرنا شروع نہیں کر دیتے، اگر کسی محفل میں اچانک کال آئے اور نوحہ لگا ہوا ہو تو کسی کا اس پر آنسو نہیں نکلتا، کوئی اس پر سوگوار نہیں ہوتا چونکہ سب کو یہ پتہ ہے کہ یہ سوگ کا نوحہ نہیں ہے بلکہ یہ ٹون کا نوحہ ہے۔ اسی طرح کمپیوٹر کی سکرین پر اللہ اکبر کا وال پیپر لگا ہوتا ہے لیکن کمپیوٹر کے جو دوسرے حصے ہیں ان میں اللہ اکبر نہیں ہے انتہائی غیر شرعی چیزیں رکھی ہوئی ہوتی ہیں، کوئی ویب سائٹ کھولتے ہیں جو انتہائی اوٹ پٹانگ چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ وال پیپر اس سائٹ کی طرف کوئی تاثیر نہیں رکھتا کیونکہ ایک الیکٹرانک فائل ہے جو ایک خاص حصے میں پڑی ہوئی ہے اور دوسری فائل سے لاتعلق واجنبی ہوتی ہے، اس کا دوسرے حصے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پس ہماری جو دینی رسومات ہیں عموماً نفسیاتی حالت اور روانی حالت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جن کو ہم عقیدت کہتے ہیں۔

عقیدہ و عقیدت:

عقیدہ و عقیدت میں لغت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے لیکن عملاً اس میں فرق ہے۔ عقیدت نفسیاتی حالت ہوتی ہے اور عقیدہ علمی حالت کا نام ہے۔ جب یہ علم ہو کہ خدا ایک ہے یہ ایک علمی فائل ہے جو ہمارے حافظے میں پڑی ہوئی ہے، اس جملے کا ہمارے وجود کے دوسرے حصوں سے کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً کسی کے ذہن میں یہ ہو کہ اللہ ہے لیکن اُس کے ارادوں میں اس جملے کا کوئی تعلق نہ ہو، ارادے میں اور چیزیں بیٹھی ہوئی ہوں، ارادے کے محرکات کچھ اور چیزیں ہوں یعنی یہ شخص وہ ارادے نہیں کرتا ہو جو خدا سے شروع ہوتے ہیں، اس کے ارادے کی ابتداء اُس کی اپنی خواہش سے شروع ہوتی ہو، ہوس، غضب اور حبِ نفس سے شروع ہوتی ہو، درعینِ حال کہ اس کے ذہن میں یہ جملہ بیٹھا ہوا ہو کہ خدا ہے۔ خواہشات میں پھنسے ہوئے لوگوں کی دینی اور مذہبی معلومات بہت زیادہ ہوتی ہیں مثلاً مشرق شناس لوگوں کو مذہب کی اتنی معلومات ہیں کہ مسلمانوں کو بھی اتنی نہیں ہیں، قرآن کے حروف اور حرکات تک گنے ہوئے ہوتے ہیں حتیٰ یہ بھی گنے ہوئے ہوتے ہیں کہ قرآن میں الف کتنی مرتبہ استعمال ہوا ہے، وہ یہ ساری معلومات رکھتے ہیں، نہج البلاغہ کے بارے میں فراوان معلومات رکھتے ہیں، کئی کتابیں ایسی ہیں جو انہوں نے نہج البلاغہ کے نسخوں کو چھان بین کر کے تحقیق کر کے لکھی ہوئی ہیں، ان کو نشر کرنے کا کام شیعوں نے بہت بعد میں شروع کیا ہے پہلے دوسروں نے شروع کیا ہے۔

آگاهی امت کے وجود کا ذریعہ:

علمی اور مذہبی معلومات آگاہی شمار نہیں ہوتیں جو امت کے وجود کا ذریعہ بنتی ہیں یا جس کی بنیاد پر امت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ وہ عقیدہ و نظریہ آگاہی نہیں ہے، وہ آگاہی ضروری ہے جو انسان کے وجود میں رچ بس جائے، اس آگاہی کو انسانوں کے اعضاء و اعمال میں رچا دینا انبیاءؑ کا ہی ہنر ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ گوش گزار کرتے ہیں یا ذہن نشین کرتے ہیں اس سے زیادہ ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا اور ہم پر اتنا ہی واجب تھا یا زیادہ سے زیادہ دقت کر کے مثلاً منبروں اور کلاسوں میں ذہن نشین کرتے ہیں، کلاسوں میں پڑھ کے ہم فارغ التحصیل بھی ہو جاتے ہیں لیکن کوئی چیز دل نشین نہیں ہوتی، کوئی چیز دل میں نہیں جاتی سب کی سب ذہن میں ہی ہوتی ہیں، ہم سب کچھ حافظے کے سپرد کرتے جاتے ہیں، حافظہ مقامِ معرفتِ دینی نہیں ہے، حافظہ ایمان کی جگہ نہیں ہے، حافظے کو خداوند تعالیٰ نے آگاہی کا مرکز نہیں بنایا بلکہ حافظہ معلومات کا مرکز ہے، ایمان کا مرکز اور ہے وہاں تک بات پہنچانی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو بات اس مرکز تک پہنچانی ہے اس کو پھر الگ طرح سے بنانا ہوگا۔ چونکہ کان میں جو بات پہنچانی ہے اس کو انسان الگ طریقے سے بناتا ہے، آنکھوں تک جو بات پہنچانی ہے اس کو انسان الگ طریقے سے تشکیل دیتا ہے مثلاً آپ نے آنکھ تک کوئی بات پہنچانی ہے تو

> بے شک آج چودہ سو سال بعد کوئی اس معنی اور مفہوم کو دریافت کرنے میں سبقت لے جائے وہ سابقین کے ساتھ ہی شمار ہوگا یعنی ''لا الہ الاّ اللہ'' کو سمجھنے میں جو سبقت لے جائے، جو بنیاد دین، بنیاد مکتب اور بنیادِ امت ہے۔ نظریاتی مرحلے میں پہلا کام لا الہ الاّ اللہ ہے۔ لا الہ الاّ اللہ کا مطلب یعنی یہ کائنات بغیر خالق کے نہیں ہے اس کو ہم نے نفسیاتی حالت یعنی توھّم کے طور پر ذہن میں نہیں رکھنا بلکہ اس کو تصدیق تک لے آئیں کہ کائنات کا کوئی خالق ہے

> آج ہم انقلابِ اسلامی کے تینتیس سال بعد بیٹھ کے امامؒ کے افکار پیش کرتے ہیں ایرانی قوم نے تینتیس سال پہلے امامؒ کے افکار کو قبول کیا۔ پاکستان میں اگر تینتیس سال بعد ایک قوم اٹھے اور امامؒ کے افکار کو لے کر ایرانیوں سے بہتر کارکردگی دکھائے تو خدا کی بارگاہ میں یہ سابقین میں سے شمار ہوں گے، یہ اُن پر سبقت لے جائیں گے، اگرچہ زمانے کے لحاظ سے انہوں نے کام پہلے شروع کیا ہے

اس کو لکھیں گے یا اس کی تصویر بنائیں گے تا کہ آنکھوں تک یہ پیغام پہنچ جائے، کانوں تک پیغام پہنچانے کے لئے اس کو آواز بنائیں گے تا کہ یہ بات کانوں تک پہنچ جائے، ذہن تک پہنچانے کے لئے اس کا مفہوم پہنچائیں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں یا دین کی عکاسی، لفاظی اور دین کی مفہوم سازی کر سکتے ہیں۔ ابھی تک جو کام ہم لوگوں نے کیا ہے وہ یہی کیا ہے، دینی محفل سجاتے ہیں، دینی ماحول بناتے ہیں، دینی رنگ جماتے ہیں جو دینی معلومات کی عکاسی ہیں، آوازوں کی مدد سے دینی تعلیمات پڑھتے ہیں جیسے ہم دعائیں، اذانیں اور نمازیں پڑھتے ہیں، ہم ساری چیزیں پڑھتے ہیں، صرف لفاظی کرتے ہیں یا پھر بعض اوقات ان کی مفہوم سازی کرتے ہیں یعنی انہیں چیزوں کو مفاہیم بناتے ہیں اور مفاہیم کو ذہنوں، حافظوں اور کتابوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اب مفاہیم تو ذہن سے آگے نہیں جاتے مثلاً سانس پھیپھڑے میں جاتی ہے جبکہ غذا معدے میں جاتی ہے اگر آپ غلطی سے بھی یہ کام کرنا چاہیں کہ یہ غذا پھیپھڑے میں پہنچانا چاہیں تو آکسیجن معدے میں نہیں جاتی۔ مفاہیم صرف حافظے میں جاتے ہیں وہاں سے آگے کہیں بھی نہیں جاسکتے، دل میں لے جانے کے لئے مفاہیم کو مزید بنانا پڑیگا، کسی اور حالت میں تبدیل کرنا پڑیگا، جس طرح پہلے لفظ بنایا، لفظ سے آواز بنائی، آواز سے مفہوم نکالا، یہ اب ہر حصے کے لئے ہے، ایک کان کے لئے، ایک بصارت کے لئے، ایک ذہن کے لئے، ایک حافظے کے لئے ہے ان تمام مراحل کے بعد اب اس کو کچھ اور بنانا ہے یعنی اس کو درد بنانا ہے، اس آگاہی کو درد آلود کرنا ہے چونکہ دل میں فقط درد جاتا ہے جو تحریک کرتا ہے یعنی آگاہی درد، آرزو، تمنا، اضطراب، تڑپ اور بےتابی بن جائے۔

آگاھی کو درد اور آرزو میں تبدیل کرنا:

وہ آگاہی آئیڈیالوجی اور امت سازی کی بنیاد ہے جو درد بن جائے پھر وہ دل میں جانے کے قابل ہوگی ورنہ دل مفاہیم کو قبول ہی نہیں کرتا، دل سے مراد بھی یہ پمپ نہیں ہے جو خون کا مرکز ہے، دل یعنی جو روح کا مرکز ہے، روحِ انسان کا مرکز دل کہلاتا ہے، اس دل میں خاص چیزیں ہیں وہ خاص امور کے لئے بنایا گیا ہے، جب تک آپ اپنی آگاہی کو وہ شکل نہیں دیتے یعنی جب تک اس کو درد بنا کر کسی کے اندر منتقل نہیں کرتے ہیں جو انسان کو تڑپاتی، اکساتی ہے اور اٹھاتی ہے یہ روحانی دل اس کو قبول نہیں کرتا ہے۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے ذہن میں رسول اللہ ﷺ نے جو دین کی آگاہی ڈالی وہ صرف الفاظِ وحی یا مفاہیم نہیں تھے جو حافظۂ خدیجہ سلام اللہ علیہا میں جا بیٹھے ہوں، جس چیز نے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کو اتنا باعظمت، مقاوم اور مبارز بنایا وہ ایک خاص آگاہی تھی جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو عطا فرمائی اور سب سے پہلے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کو وہ آگاہی دی، پس حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا سابقون میں سے ہے جو سب پر سبقت لے گئیں ورنہ مفاہیم تو انسان کو تحریک نہیں کرتے، اگر مفاہیم تحریک کرتے تو سب سے زیادہ کمپیوٹر کو تحریک کرتے چونکہ اس کے اندر بہت سارے مفاہیم پڑے ہوئے ہیں، مفاہیم اگر تحریک کرتے تو الفاظ کو تحریک کرتے چونکہ الفاظ کے اندر بند ہیں، مفاہیم اگر تحریک کرتے تو جتنے یہ اہلِ علم ہیں وہ سب کے سب اہلِ عمل ہوتے، پس اس آگاہی کو ایک اور مرحلے سے گزارنا ہے۔ یہ آگاہی نفسِ رسول اللہ ﷺ سے گزرتی ہے اور جب آپؐ کے وجود سے گزر کر یہ باہر آتی ہے تو یہ آگاہی درد، آرزو اور تمنا بن جاتی ہے۔

دلِ تمنّا ساز:

یہ وہ تعبیرات ہیں جو علامہ اقبالؒ نے استعمال کی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

علامہؒ دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ علم جو حافظے میں بیٹھا ہوا ہے اس کو زندہ تمنا بنا دے اور وہ تمنا جو قلب کو گرما دے۔ یہ مفاہیم حافظوں میں نہیں ہوتے۔ آج کل ہمارا جو تعلیمی نظام ہے اس میں مطلب کتاب سے

> ہم علمی اعتقاد رکھتے ہیں، عقیدہ علم کی شکل اختیار کر گیا ہے، ہم عقائد کی کتابیں پڑھتے ہیں کلاس میں استاد درس دیتا ہے ہم سن لیتے ہیں اور اس کو لکھ لیتے ہیں جس سے ہمارا عقیدہ پختہ ہوجاتا ہے لیکن عمل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اس کو سو دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں کہ خدا ہے لیکن یہ خدا ایک علمی جملے کے طور پر ہے ہمارے حافظے میں پڑا ہوتا ہے حافظے سے نکل کر وجود کے باقی حصوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا

حافظے میں آتا ہے، حافظے سے نکل کر شاگرد کے حافظے میں چلا جاتا ہے یعنی حافظے کو گرمایا نہیں جاتا، اگر حافظہ گرم ہوجائے تو پھٹ جاتا ہے لہٰذا حافظہ جتنا ٹھنڈا ہو اتنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ حافظے میں جو بات بیٹھی ہوئی ہوتی ہے وہ تو تمنا نہیں بنتی۔ ابھی عقیدہ بھی معلومات بن کر حافظوں سے حافظوں میں منتقل ہو رہا ہے، اسلام حافظوں سے حافظوں تک جا رہا ہے، عقیدہ دل سے دل تک نہیں جا رہا چونکہ حافظے سے دل میں نہیں گیا پس عقیدے کو دل میں اتار دیں تاکہ عقیدہ تمنا، آرزو اور درد بنیں۔ دل تمنا ساز ہے یعنی عقیدہ جب دل میں پہنچے تو تمنا بنتا ہے اور دل سے دل میں پہنچے تو پھر تحریک کرتا ہے۔

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

وہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر کرتی ہے، یوں نہیں تھا کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حافظے میں قرآن ڈال دیا ہو، پھر آپؐ نے حضرتِ خدیجہ سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام کے حافظے میں ڈال دیا اور انہوں نے دوسروں کے حافظوں میں ڈال دیا اور پھر کرتے کرتے آج ہم جو مدرسوں اور حوزوں میں یاد کر رہے ہیں بات یہاں تک پہنچی ہو۔

مفہومِ بعث:

آج ہم محافظ نہیں صرف حافظ بن رہے ہیں۔ پس اس آگاہی کیلئے مزید کوشش کی ضرورت ہے تاکہ یہ درد بن جائیں۔ دردِ دل سے مراد ایک ایسی آگاہی جو انسان کے دل کو تحریک کرتی ہے، اکساتی اور ابھارتی ہے جو انسان کو بیٹھنے نہیں دیتی اس کو بعث کہتے ہیں

''هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ'' (سورہ جمعہ، آیت ۲)

خدا نے امیین کے اندر رسول مبعوث کیا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھڑکایا، بعث کا لفظی معنی ہی اکسانا، بھڑکانا، ابھارنا اور برانگیختہ کرنا ہے اور وہ آگاہی جو خداوند تعالیٰ نے آپؐ کے دل میں ڈال دی ہے انسان اُسی سے ہی برانگیختہ ہوجاتا ہے۔ یہ آگاہی جب دل کی سطح تک پہنچ جاتی ہے تو اس وقت یہ ایمان بن جاتی ہے، اس وقت یہ آگاہی انسان کے سراپا وجود میں چلی جاتی ہے، یہ آگاہی انسان کے وجود کے ہر حصے پر اثر انداز ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ یہ ایمانی آگاہی ہے ابھی ہمیں کتنی باتوں کا علم ہے جن کا ہمارے عمل پر کوئی اثر نہیں ہے یہ علمِ بے عمل ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پناہ مانگتے ہیں۔

''اللھم اعوذبك من علمٍ لا ینفع''

اے پروردگارا! ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نافع نہیں ہے۔

کیفیتِ آگاہی:

ہمیں آگاہی کی کیفیت پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، ابھی ہم ایک بھیڑ چال والی آگاہی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو حافظوں سے حافظوں میں جاتی ہے اور اگر ہزار سال بھی یہ سلسلہ جاری رہے، مفید ترین علم انسان پڑھتا رہے لیکن یہ علم انسان کے ارادوں پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ ہم ایسا ارادہ کرتے ہیں جس میں واضح طور پر جھلک رہا ہوتا ہے کہ یہ ارادہ ایک ایسی آگاہی سے شروع ہوا ہے جس میں خدا کا کوئی تصور نہیں ہے، ہم نے عقائد کی کتابوں میں سو دلیلوں سے پڑھا ہے کہ خدا ہے اور دلیلیں دے کر قانع بھی کیا ہے۔ حافظے کا کام ارادہ کرنا نہیں ہے ارادہ کسی اور مرکز کا کام ہے اور حافظہ کہیں اور ہے، یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ پس لا الہ الا اللہ مکتب کی بنیاد تب بن سکتا ہے جب اسے ہم حافظے تک محدود نہ رکھیں، ہمیں اس کو ارادوں کا جزء بنانا پڑے گا، ہمیں اپنے قلوب کا حصہ بنانا پڑے گا، لا الہ الا اللہ ہمارے دلوں میں رچ بس جانا چاہئے۔ ابھی ہماری حرکات، سکنات، زبانیں، نگاہیں، فیصلے، رجحانات، گھر اور رویے لا الــہ سے آزاد ہیں صرف ہمارے حافظوں میں لا الــہ پڑا ہوا ہے، اس لا الــہ سے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ لا الــہ حافظوں میں رکھ کر انجمن، قبیلہ، قوم اور پارٹی بنا سکتے ہیں لیکن کبھی امت نہیں بن سکتے۔

اقوامِ مشرق سے اقبالؒ کا خطاب:

علامہ اقبالؒ امت سازی کے درپے تھے۔اقوامِ مشرق کتاب میں علامہؒ فرماتے ہیں کہ

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

اے مشرقی لوگو! پس ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یعنی اے مسلمانو! ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ امت سازی کرنی چاہیے، ایک ایک کر کے علامہؒ نے قومیت، وطنیت، لسانیت، علاقائیت اور دیگر چیزوں کو مورتیاں کہا ہے یعنی یہ تہذیب نو کے بنے ہوئے بت ہیں، ان تمام بتوں کو پائمال اور پاش پاش کر کے امت کی بنیاد رکھیں۔

نکتۂ می گویم از مردانِ حال

اہلِ قیل وقال واہلِ حال قدیمی تقسیم بندی ہے۔اہلِ قیل وقال یعنی وہ لوگ جن کا کام صرف باتیں، بحثیں اور مناظرے کرنا ہوتا ہے یا جن کا کام صرف پڑھنا اور پڑھانا ہے یعنی جو عمل کی دنیا میں نہیں ہیں ان کو اقبال اہلِ قیل وقال کہتے ہیں، اہلِ حال یا مردانِ حال سے مراد اہلِ عمل اور مردانِ عمل ہیں، علامہؒ کہتے ہیں کہ ان کے بارے میں ایک نکتہ آپ کو بتا تا ہوں۔

''لا'' اور ''الّا'' کی حقیقت:

اُمّتاں را لَا جلال اِلّا جمال

علامہؒ فرماتے ہیں کہ امتوں کے لئے لا الہ الّا اللہ کا ''لا'' جلالِ امت ہے اور ''الّا اللہ'' جمالِ امت ہے

لَا و اِلّا احتسابِ کائنات

یہ ''لا'' اور ''الّا'' دو لفظ نہیں ہیں بلکہ یہ احتساب کائنات ہے یعنی کائنات کے احتساب کرنے کا نام لا اور الّا ہے۔پوری کائنات کے احتساب کے بعد انسان لا الہ الّا اللہ کہتا ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی خالق، مالک اور معبود نہیں ہے۔

لَا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات

لا اور الّا کائنات کا دروازہ کھولنے کا نام ہے، خداوند تعالیٰ نے جو کائنات بنائی ہے اُس کا انسان نے احتساب کیا ہے اب انسان کو ایک اور کائنات بنانی ہے اس کے لئے لا الہ الّا اللہ فتحِ باب ہے

ہر دو تقدیرِ جہان کاف و نون

''ک'' اور ''ن''، یعنی کن، یعنی یہ دونوں حروف تقدیرِ جہان ہیں

حرکت از لا زاید از اِلّا سکون

لا سے حرکت شروع ہوتی ہے اور الّا سے اطمینان حاصل ہوتا ہے، لا ایک حرکت کا نام ہے۔اقبالؒ کا ایک اور شعر ہے اردو میں کہ

زندہ قوت تھی زمانے میں یہی توحید کبھی

آج فقط ایک مسئلہِ علمِ کلام

یہ توحید کسی زمانے میں زندہ قوت تھی آج فقط علمِ اعتقاد کا ایک مسئلہ ہے یعنی عہدِ نبویؐ میں توحید زندہ قوت کا نام تھا اُس وقت لا الہ کا یہ معنی نہیں تھا جو آج ہے، لا الہ حافظوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ اُس وقت لا الہ وجود میں تھا، سراپا انسان لا الہ تھا۔

تا نہ رمزِ لَا اِلٰہ آید بدست

بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک ہمیں لا الہ کی رمز ہاتھ نہیں آجاتی انسان کے لئے یہ راز و رمز حل نہیں ہوسکتا، جب تک لا الہ الّا اللہ کا راز کشف نہ ہو جائے اس وقت تک غیر اللہ کی زنجیر انسان کے پاؤں سے نہیں کھل سکتی،

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست

ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

اس دنیا میں کام کا آغاز لا سے کرنا ہے، مردِ خدا کی پہلی منزل لا ہے۔

علمِ کلام میں جو عقائد پڑھائے جاتے ہیں یہ صرف ہمارے حافظے میں ہیں، حافظے سے ہماری سوچ، فکر، ارادے اور ہمارے فیصلوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے جیسے مذہبی لوگ کمپیوٹر میں مذہبی باتوں کو ڈیزائن کر کے وال پیپر بنا کر سکرین پر لگاتے ہیں۔جس قسم کا آدمی ہے اس نے اپنے کمپیوٹر کی سکرین پر ویسا ہی وال پیپر لگایا ہوتا ہے، اسی طرح جیسے موبائل کی ٹون اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ انسان کس مزاج کا ہے؟

طاغوت کا انکار:

"فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ" (سورہ بقرہ، آیت ۲۵۶)

غیراللہ کو لا کہنا مردِ خدا کی پہلی منزل ہے، اس کا انکار کرنا ہے، لا صرف حافظے میں نہیں رکھنا بلکہ لا انسان کے سراپا وجود میں سرایت کرے

ملتے کز سوزِ او یک دم تپید
از گلِ خود خویش را باز آفرید

وہ ملت جو لا کے سوز سے گرم ہوگئی ہو، جس کا لہو گرمایا گیا ہو، جس کا قلب تڑپایا گیا ہو، وہ ملت جو لا الہ سے اٹھائی گئی ہو مبعوث کی گئی ہو، اس نے اپنی مٹی سے اپنا نیا جنم پیدا کیا ہے، اپنی نئی آفرینش اور نیا سلسلہ شروع کیا ہے یعنی لا الہ الّا اللہ سے جو ملت گرم ہو جائے اُس سے امت نکلے گی

"وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ" (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴)

پیشِ غیراللہ لا گفتن حیات
تازہ از ہنگامۂ او کائنات

غیراللہ کے سامنے لا کہنا زندگی ہے، اسی لا سے ہنگامۂ کائنات تازہ سے تازہ تر ہوتا جا رہا ہے چونکہ غیراللہ ایک کے بعد ایک سر اٹھا رہا ہے اور ادھر سے مردِ خدا ہر ایک کو لا کہہ رہا ہے، ہر لا درحقیقت ایک نیا ہنگامہ، ایک نیا محشر اور ایک نئی دنیا آباد کر رہا ہے، درحقیقت ہر لا ایک نئی ملت وجود میں لا رہا ہے

از جنونش ہر گریباں چاک نیست
در خورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ لا الہ الّا اللہ میں جو جنون ہے، ہر گریباں اس کے قابل نہیں ہے، یہ شاعرانہ تمثیل ہے کہ جب انسان حالتِ جنون اور حالتِ بے خودی میں آتا ہے تو اپنا گریبان چاک کر دیتا ہے، ہر گریباں اس جنونِ لا الہ کے قابل نہیں ہے، وہ خاص گریباں ہے جو اس جنون یعنی لا الہ کے قابل ہے۔ لا الہ الّا اللہ کی آگ ہر خس و خاشاک کو نہیں جلاتی، یہ بڑی قیمتی چیز کو جلاتی ہے، جو ہر و گوہر کو جلاتی ہے۔

جذبۂ لا الہ الّا اللہ:

جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد
می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

لا الہ الّا اللہ کا جذبہ ڈیرے اور پڑاؤ ڈالے ہوئے امتوں کو راہ نورد اور راہرو بنا دیتا ہے، ان کے اندر تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز

اگر آقا و غلام کی جنگ دیکھنا چاہتے ہو تو لا کا بیج غلام کی کھیتی میں کاشت کرو، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے آقا کی گردن مروڑ دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے کس طرح غلاموں کو سرداروں سے لڑا دیا؟ ممولوں کو شہباز سے لڑا دیا یعنی آپؐ نے لا کا بیج اس کی کھیتی میں اگا دیا، اس کے وجود میں کاشت کیا۔ پس جس انسان کے وجود میں لا داخل ہوگا وہ ہر آقا، ہر ظالم اور ستمگر کی گردن مروڑ دے گا۔

ہر کہ ایں سوز باشد در جگر
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

جس کے دل میں لا الہ کا خوف آ گیا، قیامت سے زیادہ بڑا خوف لا الہ کا ہے۔ ہم جہنم کے خوف سے لرز جاتے ہیں لیکن جس کے دل میں لا الہ کا خوف آ جائے اُس کے لئے جہنم کا خوف کچھ بھی نہیں ہے۔

لَا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے
ایں غُوِ رعد است نے آوازِ نَے

لا ایک لفظ یا تلفظ نہیں ہے بلکہ پے در پے ضربوں کا نام ہے، غیراللہ کے پیکر پر پے در پے وار کرنے کا نام لا ہے۔ یہ جو گرج ہے، یہ نَے کی آواز نہیں ہے یہ گرج درحقیقت دشمن کی آواز ہے، اس کے اوپر پے در پے وار کرنے کا نام لا ہے

علمی اور مذہبی معلومات آگاہی شمار نہیں ہوتیں جو امت کے وجود کا ذریعہ بنتی ہیں یا جس کی بنیاد پر امت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ وہ عقیدہ و نظریہ آگاہی نہیں ہے، وہ آگاہی ضروری ہے جو انسان کے وجود میں رچ بس جائے، اس آگاہی کو انسانوں کے اعضاء و اعمال میں رچا دینا انبیاءؑ کا ہی ہنر ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ گوش گزار کرتے ہیں یا ذہن نشین کرتے ہیں اس سے زیادہ ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا

> ہم سب کچھ حافظے کے سپرد کرتے جاتے ہیں، حافظہ مقامِ معرفت دینی نہیں ہے، حافظہ ایمان کی جگہ نہیں ہے، حافظے کو خداوند تعالیٰ نے آگاہی کا مرکز نہیں بنایا بلکہ حافظہ معلومات کا مرکز ہے، ایمان کا مرکز اور ہے وہاں تک بات پہنچانی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو بات اس مرکز تک پہنچانی ہے اس کو پھر الگ طرح سے بنانا ہوگا۔

ضربِ او ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گردابِ وجود

لا کی ضرب ہر گردن کش کو نابود کر دیتی ہے۔

ظہور اسلام کے بعد عربوں کا کردار:

با تو می گویم ز ایامِ عرب
تا بدانی پختہ و خامِ عرب

یہ عرب قوم، یہ بدو، وحشی، آدم کش اور جاہل کس طرح ایک عظیم امت بن گئے؟ اقبالؒ کہتے ہیں کہ تجھے عرب کی داستان سناتا ہوں، تجھے عرب کے نشیب و فراز سناتا ہوں، تجھے رسول اللہ ﷺ کی سند سناتا ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ یہ جاہلیت میں زندگی گزارنے والی قوم کیسے عظیم بن گئی؟

ریز ریز از ضربِ او لات و منات
در جہات آزاد از بندِ جہات

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ تم نے دیکھا کہ اسی عرب کے ہاتھوں لات و منات پاش پاش ٹکڑے ٹکڑے اور ذرے ذرے ہوگئے۔ یہ جو پہلے ہر جہالت میں جکڑے ہوئے تھے، ہر رسم میں جکڑے ہوئے تھے یہ ناگہان ہر قید سے آزاد ہوگئے

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او

جتنی بھی قبائیں تھیں یہ سب کسی عرب کے ہاتھوں چاک ہوگئی ہیں، سب کو اس نے ختم کر دیا، بڑی بڑی سپر پاوروں کو انہی عربوں نے ختم کر دیا اور یہی عرب جن کے ہاتھوں سے قیصر و کسریٰ سرنگون ہوئے تھے۔

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد

عالمے در آتش او مثلِ خس
ایں ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس

اس کے برہنہ پاؤں کی دھمک سے کبھی صحرا چیختے تھے، یہی عرب جب دریاؤں اور سمندروں میں کود جاتا تھا تو سمندروں کی فریادیں نکلنا شروع ہو جاتی تھیں۔ جب یہ عرب مثلاً دوسرے ملکوں میں جاتے تھے تو ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی، پھر یہ سب کس چیز کے کرشمے تھے؟ یہ سب لا کو وجود میں بسانے کی کارکردگی تھی، ایک باغبان نے عرب کی بنجر زمین پر جا کر لا کا بیج بویا، وہ لا کا بیج اگا اور اس کے ذریعے سے یہ لات و منات سب ریزہ ریزہ ہوگئے، قیصر و کسریٰ نابود ہوگئے، صحرا و طوفان اس کے سامنے ہیچ ہوگئے اور شہروں کے شہر اس کے سامنے ایسے بن گئے جیسے خس و خاشاک ہوتے ہیں۔

''لا'' وسیلۂ وجودِ امت:

اندریں دیرِ کہن پیہم تپید
تا جہانے تازۂ آمد پدید

یہ لا کے کرشمے تھے کہ اس نے مسلسل اس جہان کے اندر اپنی کوشش و تگ و دو کی تاکہ ایک نئی دنیا اور ایک نئی امت وجود میں آجائے۔

بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست
ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست

یہ جو صبح کی اذان ہے، درحقیقت صبح کے طلوع کا اعلان ہے، اب صبح اس کے نعرے سے طلوع ہوتی تھی، یہ صبح کی آذان یعنی قوموں کے اوپر ظلم و ستم کی ظلمتیں اور راتیں ختم کرنے کا نام ہے

اینکہ شمع لالہ روشن کردہ اند
از کنارِ جوئے او آوردہ اند

اب آپ کو کہیں بھی اگر شمع نظر آتی ہے تو یہ درحقیقت وہیں سے شعلہ لے کر آئے ہیں، یہ نورانیت وہاں سے لے کر آئے ہیں۔

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شُست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رُست

مفاہیم صرف حافظے میں جاتے ہیں وہاں سے آگے کہیں بھی نہیں جاسکتے، دل میں لے جانے کے لئے مفاہیم کو مزید بنانا پڑیگا، کسی اور حالت میں تبدیل کرنا پڑیگا، جس طرح پہلے لفظ بنایا، لفظ سے آواز بنائی، آواز سے مفہوم نکالا، یہ اب ہر حصے کے لئے ہے، ایک کان کے لئے، ایک بصارت کے لئے، ایک ذہن کے لئے، ایک حافظے کے لئے ہے ان تمام مراحل کے بعد اب اس کو کچھ اور بنانا ہے یعنی اس کو درد بنانا ہے

عربوں نے اپنا دل غیر اللہ سے پاک کر دیا تھا، انہوں نے غیر اللہ کو اپنے صفحۂ دل سے مٹا دیا تھا جس کی وجہ سے دو سو معرکے پھوٹے۔

هم چناں بینی که در
دورِ فرنگ
بندگی با خواجگی
آمد بجنگ

اقبالؒ کہتے ہیں کہ آج پھر دوبارہ پہلے والا منزل تکرار ہو رہی ہے، جیسے جو خواجگی و بندگی کا نظام مکہ کے اندر تھا آج فرنگ یعنی یورپ اور مغربی تہذیب کی وجہ سے دوبارہ وہی نظام آ گیا ہے یعنی آقا اور غلام کا نظام آ گیا ہے، پھر آج غلاموں اور خواجوں کی جنگ ہے۔

انقلابِ روس کی حقیقت:

روس را قلب و جگر گردیده خوں
از ضمیرش حرفِ لَا آمد بروں
آں نظامِ کهنه را برهم زد است
تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

روس کا قلب و جگر خون ہو گیا، اس کے ضمیر سے حرفِ لا باہر آ گیا ہے، وہاں پر امپیریلزم کے خلاف ایک آواز اٹھی اور انہوں نے امپیریلزم کو نیست و نابود کر دیا ہے

کرده ام اندر مقاماتش نگه
لَا سلاطیں، لَا کلیسا، لَا اِلٰه

یعنی فاسد حکومتوں، فاسد سلطانوں، فاسد نظاموں، فاسد اور نام نہاد مذہبیوں کو لا کہنا ہے یعنی اُن کا انکار کرنا ہے۔

فکرِ او در تندبادِ لَا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

لیکن مشکل یہ ہوئی کہ روس نے لا تو کہہ دیا یعنی انکار تو کیا لیکن الّا اللہ میں نہیں آیا، امپیریلزم کا انکار کیا، غلط نظام اور کلیسا کو بھی لا کہہ دیا، بادشاہت کو بھی لا کہہ دیا لیکن انھوں نے اللہ کو بھی لا کہہ دیا۔ الحادی نظام، اشتراکیت اور کیمونزم برپا کیا۔ روس کی فکر لا کی تند باد یعنی لا کے طوفان میں رک گئی اور الّا کی طرف نہیں آیا، پورا لا الہ الّا اللہ نہیں کہہ سکا۔

آیدش روزے که از
زورِ جنوں
خویش را زیں
تندباد آرد بروں

لیکن ممکن ہے کہ ایک دن ایسا آ جائے کہ اس لا الہ کے بعد اس کو الّا اللہ بھی کہنا پڑ جائے۔ یہ کام امام خمینیؒ نے کیا، روس کو پیغام دے کر کہا کہ تم نے لا تو کہہ دیا ہے اب الّا اللہ بھی کہہ دو، امامؒ نے یہی پیغام دیا تھا جو اقبالؒ بیان فرما رہے ہیں، امامؒ نے روس کے آخری امپراطور گورباچوف کو لکھ کر دیا کہ الّا اللہ کی باری رہ گئی ہے کہ تمہاری تباہی الّا اللہ کی وجہ سے ہے۔

در مقامِ لَا نیاساید حیات
سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لَا و اِلّا ساز و برگِ اُمّتاں
نفیِ بے اثبات مرگِ اُمّتاں

لا کافی نہیں ہے لا کے بعد الّا بھی ہے، لا اور الا امت سازی کا ساز و سامان ہے، روس نے فقط لا کہا لہٰذا وہ پورا کام نہیں کر سکا۔ لا کہہ کر الّا نہ کہنا یہ امتوں کی موت ہے۔

خلیل اللہ کے کام:

در محبت پخته کے گردد خلیل
تا نگردد لَا سوئے اِلّا دلیل

محبت کی وادی میں ایک خلیل اُس وقت پختہ ہوتا ہے کہ جب لا کہہ کر آتش الّا اللہ میں چلا جائے یعنی بتوں، نمرود اور بت کدوں کو لا کہے اور آتش الّا اللہ میں چلا جائے۔

بقیہ صفحہ نمبر ۶۴ پر ملاحظہ کریں............

حجت کے معتقد ہو کر زندگی مغربی طرز کی گزاریں یہ ممکن نہیں ہے۔ کس قدر تاکید ہے کہ دشمنانِ خدا کے حلیے نہ اپناؤ۔ ان حج نے جو اتمامِ حجت اپنی سیرت کے ذریعے سے کی ہے جس نے ہمارے لئے گنجائش مکمل طور پر ختم کر دی ہے اور سب سے بڑی حجت کربلا و عاشورا ہے۔ ہم نے کربلا کو فقط بہشت جانے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ ہم نے یہ سوچا ہے کہ زندگی جیسی بھی گزاریں، فکر اور رویہ جیسا بھی ہو اُس سے کربلا کا کوئی سروکار نہیں ہے۔

کربلا انسان کو جنت بھیجنے سے پہلے زندگی سنوارتی ہے۔ کربلا انسان کو جہنم سے ضرور بچاتی ہے لیکن پہلے جہنمی زندگی سے بچاتی ہے۔ کربلا اُس انسان کو مرنے کے بعد بہشت لے جائے گی جس انسان نے کربلا کی وجہ سے جہنمی زندگیاں ترک کر دی ہیں اور کربلائی و عاشورائی زندگی اپنا لی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جہنمی زندگیاں ختم کریں کیونکہ کربلا کا ذکر ہر قسم کا جواز ہم سے لے لیتا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کو دہراؤ اور ہر سال تکرار کرو تاکہ ہر نسل اس سے آگاہ ہو۔ دیکھیں کہ کربلا کس طرح سے اتمامِ حجت ہوئی ہے؟ اگر سید الشہداؑ یہ سارا سامان جو کربلا لے کر آئے، اگر یہ نہ لاتے تو حجت تمام نہیں ہونی تھی۔ آج ہمارے پاس بہت سارے جواز ہیں، ابھی مجالس میں نہیں آتے کہتے ہیں گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ سید الشہداؑ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کربلا ساتھ لے کر آئے تھے لیکن ہم چھوٹے چھوٹے بچے لے کر مجلس میں نہیں آ سکتے، پھر کیوں کربلا کا ذکر سنتے ہیں؟ کیوں اپنے لئے مزید مشکلیں کھڑی کرتے ہو؟ اس سے ہمارے بچوں اور ہماری نسلوں میں شقاوت آ جائے گی اگر ہم اس حجت کی پیروی نہیں کر سکتے ہیں پھر بہتر ہے کہ ذکرِ کربلا ہی چھوڑ دیں۔

بقیہ: امت سازی از نظر قرآن

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیش نمرودے بزن

اے وہ دانشور اور دانشمند جو کمروں میں بیٹھ کر فقط باتیں کر رہے ہو، ابھی اٹھو، کمرے سے نکل جاؤ اور کسی نمرود کے سامنے جا کر لا کہہ دو۔

ایں کہ می بینی نیرزد باد و جو

از جلالِ لَآ اِلٰہ آگاہ شو

یہ جو تم دنیا بنا کر بیٹھے ہوئے ہو اس کی قیمت دو دانے جَو بھی نہیں ہے یعنی اس کی کوئی قیمت نہیں، یہ جلال، عزت اور شخصیت نہیں ہے، لا الـہ کے جلال سے آگاہ ہو جاؤ، لا جلال ہے الّا جمال ہے۔ جب لا الـہ الّا اللـہ کہو گے تو صاحبِ جلال اور صاحبِ جمال بن جاؤ گے۔

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لَا ست
جملہ موجودات را فرمانرواست

اقبالؒ کہتے ہیں کہ جس کے ہاتھ میں لا الـہ کی شمشیر ہے وہ پوری کائنات کا فرمانروا اور سلطان ہے لیکن جو لا الـہ کی شمشیر چھوڑ دے وہ پوری کائنات کا غلام ہے، جانوروں اور انسانوں کا بھی غلام ہے اور حتیٰ غلاموں کا بھی غلام ہے۔ پس لا الہ الّا اللہ امت سازی کا پہلا مرحلہ ہے۔

خالقِ کائنات کو وجود سے درک کرنا:

اس کائنات کا خالق، مالک اور رب ہے۔ اس خالق، مالک اور رب کو اپنے وجود سے درک کرنا یہ آگاہی ہے جس کے بعد امت کی بنیاد پڑتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہی تعلیم دی، لا الہ الّا اللہ کو فقط حافظوں میں نہیں بٹھایا یا حافظوں میں دلائل اعتقادی نہیں بٹھائے بلکہ انسانی وجود لا الـہ الّا اللـہ پر قائم کیا۔ حافظوں میں بٹھانے سے پیشہ ور بنتے ہیں، جاب ملتی ہے، کہیں مؤذن، کہیں پیش نماز، کہیں مدرس اور کہیں کچھ ہو جائیں گے لیکن امت ہزار سال میں بھی نہیں بنتی۔ اردو نظم میں بھی ہے کہ

خودی کا سرِ نہاں لا الہ الّا اللہ

انشاءاللہ خداوند تبارک و تعالیٰ اس امت کو بھی وہ آگاہی جو رسول اللہ ﷺ نے اُس امت کو عطا کی تھی اور ہم بھی لا الہ کے ذریعے صاحبِ جلال اور صاحبِ جمال بنیں۔ آمین

عبودیت اور بندگی امت سازی کا عملی نتیجہ

گروہ معارف

''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ'' يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ'' عَظِيْمٌ'' ''

(سورہ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

اہم ترین فریضۂ دینی:

قرآن مجید کے مطابق عام انسانوں اور انبیاء علیہم السلام و آئمہ علیہم السلام کے لئے دین کا اہم ترین فریضہ امت سازی ہے اور سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی امت سازی پر استوار ہے، آپؐ نے ہر عمل سے پہلے امت سازی کا آغاز کیا اور ایک امت تشکیل دی۔ آج امت سازی کا فریضہ مسلمانوں میں متروک اور فراموش شدہ ہے اور اس کے متعلقات و لوازمات بھی فراموش شدہ اور متروک ہیں۔ امت سازی کے لئے قرآن مجید نے باقاعدہ پورا نظام ذکر فرمایا ہے یعنی ہدایتِ قرآن کا ایک بڑا حصہ امت سازی سے تعلق رکھتا ہے اور ایک بڑا حصہ امت بننے کے بعد امت کے فرائض اور ذمہ داریوں کے متعلق ہے لیکن پہلا مرحلہ تشکیلِ امت ہے۔ تشکیلِ امت میں چونکہ امت کی اساس اجتماع پر ہے اور جب ایک انسانی اجتماع امت کی شکل اختیار کرتا ہے اس کو محور کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ محور دین ذکر ہوا ہے جس کے لئے، حبل اللہ کی تعبیر ہے یا دیگر مقامات پر خودِ دین یا اسلام کی تعبیر بھی کی گئی ہے۔ عملی طور پر دین کے محور میں جب انسان امت کی طرف سفر کرتا ہے تو پہلا مرحلہ اعتقادی و نظریاتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیرتِ طیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی پہلا مرحلہ امت سازی کا نظریاتی مرحلہ ہے جو ایک لمبے عرصے پر محیط ہے یعنی پورا مکی دور نظریاتی و اعتقادی مرحلہ ہے۔ نظریاتی مرحلے میں سب سے اہم ترین مرحلہ انسان کو آگاہی دینا ہے اور اس آگاہی کو ایمان بنا کر اس کے وجود میں راسخ کرنا ہے۔

خالق اور مخلوق کا تعلق:

جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کائنات کا اور انسان کا تعلق ایک خالق، مالک اور ایک رب سے ہے یعنی یہ کائنات خالق کی خلقت کا نتیجہ ہے۔ یہ کائنات خالق کے کسی ارادے اور حکمت کے تحت وجود میں آئی ہے اور اس میں انسان کی خلقت بھی اسی ارادے اور اسی حکمت کے تحت وجود میں آئی ہے اور وہی کائنات کا مالک بھی ہے جو خالقِ کائنات ہے وہی مالکِ کائنات بھی ہے۔ قرآن مجید میں خالقیت کے ساتھ ساتھ مالکیتِ خداوند متعال کا تذکرہ اور قرآن کی وضاحت بنیادی مسائل میں سے ہے کیونکہ جب تک مالکیت کا درست تصور انسان کے ذہن میں قائم نہ ہو اس وقت انسان کے لئے یہ نظریاتی و ایمانی مرحلہ صحیح طے نہیں ہوتا اور بعد میں عملی مرحلہ بھی یا

امت سازی کے لئے قرآن مجید نے باقاعدہ پورا نظام ذکر فرمایا ہے یعنی ہدایتِ قرآن کا ایک بڑا حصہ امت سازی سے تعلق رکھتا ہے اور ایک بڑا حصہ امت بننے کے بعد امت کے فرائض اور ذمہ داریوں کے متعلق ہے لیکن پہلا مرحلہ تشکیلِ امت ہے۔

عملی زندگی کی بنیاد بھی درست استوار نہیں ہوتی۔

مالکیتِ فرضی کا تصور:

ہم جس مصداق سے آشنا ہیں وہ انسان کا بعض چیزوں کا مالک ہونا ہے، جس طرح سے انسان اپنے لباس، زمین، گھر اور شخصی وسائل کا مالک ہوتا ہے۔ اس مالکیت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مثلاً جس طرح کھیت، جاگیر اور پراپرٹی ہے اور جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اس معاشرے کے اندر یہ احساس ہے یا وہاں لوگ قبول کرتے ہیں کہ اس کا تعلق آپ سے ہے اور آپ کے اختیار میں ہے، اس کے مالک آپ ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر تصرف کا حق صرف آپ کو ہے، اس میں رہنے کا حق اور اس کو آباد کرنے کا حق آپ کو ہے، اس سے آپ استفادہ کر سکتے ہیں لیکن یہ چیز جو آپ کی مالکیت میں ہے اور آپ اس کے مالک ہیں اس کا آپ کے ساتھ کوئی وجودی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک ذہنی تعلق ہے یا کہیں کہ ہمارے ساتھ اس کا قانونی تعلق ہے، قانون نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہم اس کے مالک ہیں، مالکیت کا قانونی مسودہ ہے، اگر ہمارے پاس یہ قانونی دستاویز نہ ہو اور ہمارے پاس کوئی شاہد و گواہ نہ ہوتا تو اس کی قانونی مالکیت، فرضی و ذہنی مالکیت اور عرفی مالکیت ثابت نہ ہوتی اور اس میں مالکیتِ حقیقی کا ایک شائبہ ہے لیکن یہ حقیقی مالکیت نہیں ہے۔

مالکیتِ حقیقی:

مالکیت حقیقی وہاں ہوتی ہے کہ جہاں پر مالک اور ملکیت کے درمیان وجودی تعلق ہو، اس میں قانونی تعلق کی ضرورت نہیں ہے کہ قانون بھی اس کو تسلیم کرتا ہو۔ مالک اور ملکیت میں وجودی تعلق اس طرح کا ہو کہ اگر مالک موجود ہو تو یہ شئی بھی موجود ہے اگر مالک نہیں ہے تو یہ شئی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی یعنی جو چیز ملکیت ہے وہ مالک کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ فرضی مالکیت میں انسان مرجاتا ہے مگر کھیت اور پراپرٹی وغیرہ اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں، آج جن چیزوں کا انسان مالک ہے، ہزاروں لاکھوں لوگ پہلے ان کے مالک رہ چکے ہیں اور یہ چیز ان کی ملکیت سے نکل چکی ہے، جب وہ تھے تب بھی یہ جائیدادیں تھیں اب وہ نہیں ہیں تو بھی یہ جائیدادیں موجود ہیں جبکہ مالکیتِ حقیقی جو خدا کی مالکیت ہے اللہ تعالیٰ ہمیشہ کیلئے اس کائنات کے مالک ہیں۔

خالقیت اور مالکیت کا تعلق:

کائنات اور اس میں موجود تمام چیزوں کا خالق خداوند متعالی ہے، خالقیتِ خدا اس طرح سے نہیں ہے جس طرح سے گھڑی ساز گھڑی بناتا ہے اور بنانے کے بعد دوسروں کے اختیار میں دے دیتا ہے یا مثلاً مکان جو کسی کاریگر نے بنایا ہوتا ہے لیکن بنانے کے بعد معمار کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب بھی ہم خالقیتِ خدا کا تصور کرتے ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں انسانی صنعت کے نمونے آجاتے ہیں جبکہ ذاتِ خداوند متعال کائنات کیلئے اس طرح سے خالق نہیں ہے، خالقیتِ خدا کے لئے صنعتی دنیا کا کوئی نمونہ درست نہیں ہے۔ ذاتِ خدا خالق ہونے کے ساتھ ساتھ مالک بھی ہے جبکہ انسان جس چیز کو خلق کرتا ہے اس کا مالک نہیں ہوتا مثلاً جس انسان نے موٹر کار بنائی ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے۔ مالکیت سے مراد یہ ہے کہ جو چیز ملکیت سمجھی جاتی ہے اس کا دارومدار مالک کے ہونے اور نہ ہونے پر ہو۔ مالک اگر ہے تو یہ بھی موجود ہے اگر مالک موجود نہ ہو تو یہ شئی بھی موجود نہیں ہوسکتی۔ قرآن مجید نے جو مالکیتِ خداوند متعال ذکر فرمایا ہے وہ مخلوق کے ساتھ خداوند متعال کا رابطہ ہے، یہ خالقیت اور مالکیت کی تشریح ہے کہ ذاتِ خدا قیوم ہے، خداوند متعال کا مخلوق کے ساتھ قیومی رابطہ ہے، ان تمام مخلوقات کا دارومدار ذاتِ خدا پر ہے اور ان کا ہونا نہ ہونا خدا کی ذات پر موقوف ہے۔

مالکیتِ حقیقی کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے انسان کے اندر یہ مثال ہے کہ جس طرح سے انسان بصارت کا مالک ہے، بصارت دیکھنے کی قوت ہے جس کا تعلق انسان کے نفس سے قائم ہے، اگر انسان موجود ہو تو بصارت ہے اگر انسان موجود نہ ہو تو بصارت بھی نہیں ہے پس خداوند تبارک تعالیٰ کا رابطہ کائنات کے ساتھ اس طرح سے نہیں ہے جس طرح معمار کا رابطہ عمارت کے

ساتھ ہے یا صنعت کار کا رابطہ مصنوعات کے ساتھ ہے بلکہ اشیاء کے ہونے اور نہ ہونے کا دارومدار خداوند متعال کی ذات پر ہے۔

خالقیتِ کو عملی زندگی میں لانا:

تصورِ خالقیت کو اگر ہم علمی مسئلے کے طور پر اپنے حافظے کے اندر رکھ لیں کہ خدا خالقِ کائنات ہے یہ کافی نہیں ہے، خالقیت واضح اور روشن ہوتا کہ ہم اس کو مشاہدہ کریں اور اس طرح سے مشاہدہ کریں کہ یہ آگاہی جو خداوند متعال کے خالق ہونے کے متعلق ہے ہمارے رہن سہن اور ہماری عملی زندگی پر اثر انداز ہو۔ علمی مسئلے کے طور پر اگر ہمارے ذہن میں یہ ہو کہ خدا خالق ہے ہمارے رہن سہن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، ہمارے اعمال، ہماری حرکات و سکنات اور افکار پر اثر انداز ہونا چاہئے۔ آج ہمارے اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آگاہی ابھی ذہنی مرحلے سے اگلے مرحلے میں داخل نہیں ہوئی یعنی ہم نے خالقیتِ خدا کا مشاہدہ نہیں کیا اور اس سے غافل ہیں۔ اگر اس حد تک ہم تصدیق کرلیں کہ ہماری ہستی اور تمام مخلوقات اور پوری کائنات کا تعلق خداوند متعال سے اس طرح سے قائم ہے جس طرح سے بصارت کی بقاء کا تعلق انسان سے ہے یعنی جب مالکیت خدا پر انسان پہنچتا ہے تو مالکیتِ خدا کے مقابلے میں دوسرا مفہوم عبودیتِ انسان ہے۔

مقامِ عبودیت:

یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ جونہی انسان خدا کی خالقیت و مالکیت کی تصدیق کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے پھر اس ایمان کا اثر انسان میں عبودیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ انسان مقامِ عبودیت پر جا پہنچتا ہے۔ عبد و مالک وہ رابطہ جو مثلاً نوکر اور صاحب کا ہے وہ نہیں ہے، نوکر تنخواہ کا محتاج ہے لیکن باقی چیزوں میں مستقل ہے، نوکر کا وجود اور ہستی اپنی ہے، سوچ، فکر اور خواہش جدا ہے، صرف پیسوں کے لئے اس نے اپنے آپ کو کسی کا نوکر بنایا ہوا ہے جبکہ عبد اس کو کہتے ہیں جس کا کچھ بھی اپنا نہ ہو، جو یہ آگہی رکھتا ہو کہ جو کچھ میرے پاس ہے اس میں سے ایک ذرہ بھی میرا اپنا نہیں ہے، میں اپنی کسی چیز کا مالک نہیں ہوں اور ہر چیز کا مالک ذاتِ خدا ہے۔ عبد یعنی وہ انسان جو اپنی ہر چیز سے لاتعلقی کا اظہار کرے کہ کوئی چیز میری نہیں ہے، حتیٰ میری ہستی، میرا وجود، میرا ارادہ اور میرا ہونا بھی میرا نہیں ہے۔ مالک کے ساتھ رابطہ، عبودیت کا رابطہ ہے، مالک کے مقابلے میں مالک نہیں ہوتا بلکہ مالک کے مقابلے میں فقط ایک مقام رہ جاتا ہے اور وہ مقام عبد ہے۔ اس آگہی سے انسان مقامِ عبودیت تک پہنچتا ہے لہٰذا جب پہلا مرحلہ نظریاتی و اعتقادی طور پر طے ہو جائے انسان مقامِ عبودیت تک پہنچ جاتا ہے۔

حیثیتِ عبد:

اللہ تعالیٰ نے بہت ساری چیزیں انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں تاکہ انسان اپنے رشد، تکامل، نشوونما، تربیت، فکر، علم، اپنی تہذیب اور ماحول کیلئے استفادہ کریں اور ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ اس پر قبضہ نہ کریں، اس پر مالکیت مت جتلائیں بلکہ اس کو استعمال کر کے کام میں لائیں۔ بسا اوقات لوگ اُن چیزوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو صرف کسی مقصد کے حصول کے لئے مہیا کی جاتی ہیں مثلاً پاکستان میں جو زمینیں بڑے بڑے جاگیرداروں کے قبضے میں ہیں یہ ان کے آباؤ اجداد کی نہیں بلکہ بیت المال کی تھیں جو انگریزوں نے جاتے ہوئے ان میں تقسیم کردیں، بہت سارے ایسے جاگیردار ہیں جو انگریزوں کے خچر پالتے تھے، کوئی اصطبل کی صفائی کرتا تھا، کوئی ان کے بوٹ پالش کرتا تھا اور کوئی ان کے کچن میں کام کرتا تھا، ان میں اکثر انگریزوں کے نوکر اور غلام تھے انہوں نے جاتے ہوئے اس ملک کا بیت المال ان میں تقسیم کردیا اور اب یہ زمینوں کے مالک بن گئے ہیں۔ انسان کو اس کائنات میں کس حیثیت سے رہنا چاہئے؟ انسان کا کیا ایمان ہوتا کہ عمل میں وہی رویہ ہو؟ مثلاً ہم جب کسی حکومتی مثلاً ادارے میں ہوتے ہیں وہاں پر ہمارا رویہ بتاتا ہے کہ ہم مالک نہیں ہیں۔ اگر کوئی آپ سے کہے کہ مجھے یہ

مالکیت حقیقی وہاں ہوتی ہے کہ جہاں پر مالک اور ملکیت کے درمیان وجودی تعلق ہو، اس میں قانونی تعلق کی ضرورت نہیں ہے کہ قانون بھی اس کو تسلیم کرتا ہو۔ مالک اور ملکیت میں وجودی تعلق اس طرح کا ہو کہ اگر مالک موجود ہو تو یہ شئی بھی موجود ہے اگر مالک نہیں ہے تو یہ شئی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی یعنی جو چیز ملکیت ہے وہ مالک کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

کھڑکی چاہئے آپ کہتے ہیں کہ یہ میری ملکیت میں نہیں ہے جن کی ملکیت میں ہے ان سے اجازت لے کر لے سکتے ہو، چونکہ انسان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ چیز میری ملکیت میں نہیں ہے، انسان کے شعور و لاشعور میں وہ چیز سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ادارہ اس کا نہیں ہے، اگرچہ اس ادارے میں جانے اور فائدہ لینے کا حق ہے، ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں لیکن یہ دلیل نہیں ہے کہ یہ سب کچھ میرا ہے اور میں دوسروں کو اجازت بھی دے دوں کہ یہاں سے کوئی چیز اٹھا لیں۔ ایسی جگہیں جو انسان کی اپنی نہیں ہوتیں وہاں انسان کا رویہ کچھ اور ہوتا ہے لیکن جب اپنے گھر میں آتے ہیں تو وہاں انسان کے رویے کچھ اور ہی ہوتے ہیں کیونکہ گھر پر اپنی ملکیت کا احساس ہوتا ہے مثلاً جب ہم اپنی گاڑی کے پاس آتے ہیں تو ہمیں ملکیت کا احساس ہوتا ہے لیکن دوسرے کی گاڑی کے پاس کھڑے ہوئے ہوں تو ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ یہ میری نہیں ہے اور یہ احساس رویے سے نظر آ رہا ہوتا ہے۔

معرفتِ الٰہی کو رویے میں بدلنا:

جہاں انسان احساسِ مالکیت رکھتا ہے وہاں طور طریقہ کچھ اور ہوتا ہے لیکن جہاں پر مالکیت کا احساس نہیں رکھتا وہاں طور طریقہ کچھ اور ہوتا ہے مثلاً ایک شخص اپنے گھر میں صوفے پر بیٹھا ہوا ہو اور کوئی آ کر اُس کے دروازے پر دستک دے تو بعض اوقات اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دیتا کیونکہ یہ اُس کا اپنا گھر ہے لیکن اگر یہی شخص پارک میں کسی بنچ پر بیٹھا ہوا ہو اور کوئی آدمی آ کر یہ کہے کہ میں بھی یہاں بیٹھنا چاہتا ہوں تو وہاں اس کو منع نہیں کرتا یعنی ان دونوں جگہوں کی وجہ سے اس کے رویے میں بہت فرق آیا ہے، پس پارک میں موجود بنچ پر بیٹھنے کی اجازت اس لئے دی کہ یہ اُس کی ملکیت نہیں ہے اور گھر آنے سے اس لئے روکا کہ اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے، یہی عمل بتاتا ہے کہ اس چیز پر آپ کی مالکیت ہے یا نہیں ہے۔ پس جب انسان خدا کی ذات کو مالک مان لے اور یہ تصدیق کر لے کہ میرے پاس جو متعلقات ہیں ان سب کا مالک خداوند متعال ہے یعنی میرے وجود کا خدا مالک ہے یہ انسان کا عملی رویہ بن جاتا ہے، اگر یہ علمی مسئلہ ہو تو یہ رویہ نہیں بنتا کیونکہ علمی مسئلہ انسان کے حافظے میں کسی گوشے میں پڑا رہتا ہے اور اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ انسان کے افکار، اعتقادات، ارادوں اور عزائم پر علمی مسئلہ اثر انداز نہیں ہوتا جب تک یہ حافظے سے نکل کر دل میں نہ آئے اور دل کے ذریعے انسان کے پورے وجود میں سرایت نہ کرے اس وقت تک معرفت رویہ نہیں بنتی۔

مومن اور فاسق میں فرق:

ہاتھ انسان کے جسم کا عضو ہے اس کو حرکت دینا انسان کے اختیار میں ہے لیکن اس کا مالک خداوند متعال ہے۔ جب یہ آگاہی ہو کہ اس کا مالک خداوند متعال ہے پھر یہ معرفت رویہ بن جائے یعنی اس ہاتھ کو انسان صرف وہاں استعمال کرے جہاں رضائے الٰہی ہو اور یہی عبودیت ہے۔ حالانکہ کفار، منافقین، فاسقین اور مومنین سب عبد ہیں لیکن سب کو عبد ہونے کی معرفت نہیں ہے، مومن اور فاسق میں یہی فرق ہے ورنہ تکویناً سب عبد ہیں، ساری کائنات عبدِ خدا ہے یعنی ساری کائنات کا مالک خداوند متعال ہے لیکن کچھ کو یہ پتہ ہے کہ مالک خدا ہے لیکن کچھ یہ بھول گئے ہیں کہ مالک خدا ہے، جن کو یہ معلوم ہے کہ مالک خدا ہے وہ مومن کہلاتے ہیں جو بھول گئے ہیں کہ مالک خدا ہے وہ کافر، منافق، فاسق، فاجر اور گناہکار کہلاتے ہیں مثلاً کسی گھر میں رہنے والے کرایہ دار کو پتہ ہے کہ اس کا میں مالک نہیں ہوں لیکن اُس کی اولاد کو پتہ نہیں ہو کہ ہم کرایے پر تھے بلکہ وہ خود کو ہی اُس مکان کا مالک سمجھ بیٹھے لہٰذا دونوں کے رویوں میں بہت فرق ہوگا۔ جس کو پتہ ہو کہ اس مکان کا مالک میں نہیں ہوں وہ اس کو نہیں بیچے گا لیکن جو خود کو مالک سمجھے گا وہ اس مکان کو بیچنے کی کوشش کریگا پس ان دو نسلوں کے رویے معرفت کی وجہ سے مختلف ہیں، یہی حال انسان کا بھی ہے، انسان جو مختلف فرقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اگر ہم قرآنی تقسیمات کو دیکھیں تو قرآن مجید نے، کافر و مومن، منافق و مومن اور فاسق و مومن کے اعتبار سے تقسیم کی ہے۔

قرآن مجید نے جو مالکیتِ خداوند متعال ذکر فرمایا ہے وہ مخلوق کے ساتھ خداوند متعال کا رابطہ ہے، یہ خالقیت اور مالکیت کی تشریح ہے کہ ذاتِ خدا قیوم ہے، خداوند متعال کا مخلوق کے ساتھ قیومی رابطہ ہے، ان تمام مخلوقات کا دارومدار ذاتِ خدا پر ہے اور ان کا ہونا نہ ہونا خدا کی ذات پر موقوف ہے۔

عبد یعنی وہ انسان جو اپنی ہر چیز سے لاتعلقی کا اظہار کرے کہ کوئی چیز میری نہیں ہے، حتیٰ میری ہستی، میرا وجود، میرا ارادہ اور میرا ہونا بھی میرا نہیں ہے۔ مالک کے ساتھ رابطہ، عبودیت کا رابطہ ہے، مالک کے مقابلے میں مالک نہیں ہوتا بلکہ مالک کے مقابلے میں فقط ایک مقام رہ جاتا ہے اور وہ مقام عبد ہے۔ اس آگہی سے انسان مقامِ عبودیت تک پہنچتا ہے لہٰذا جب پہلا مرحلہ نظریاتی و اعتقادی طور پر طے ہوجائے انسان مقامِ عبودیت تک پہنچ جاتا ہے۔

مؤمنانہ اور کافرانہ زندگی:

کافر، منافق، فاسق اور مومن سب اپنے وجود کے مالک نہیں ہیں۔ مومن کو آگاہی ہوتی ہے کہ میں اپنا اور اس کائنات کی کسی عضو کا مالک نہیں ہوں لیکن کافر، منافق اور فاسق اپنی وجود اور ہر ہاتھ آنے والی چیز کا خود کو مالک سمجھتے ہیں، کافر اور مومن میں یہی بنیادی فرق ہے۔ کافر کے افکار، سوچ، طرزِ زندگی اور رویے کافرانہ ہیں۔ کافر اس کا عنوانِ زندگی ہے جس طرح فقیرانہ زندگی، امیرانہ زندگی، عیاشی کی زندگی اور زاہدانہ زندگی عنوانِ زندگی ہیں۔ جو انسان کم از کم ضروریات پر اکتفاء کرے، یہ فقیرانہ زندگی ہے اور جو انسان ضرورت سے زیادہ خرچ کرے یہ اسرافی زندگی ہے۔ پس ''مومنانہ زندگی'' اور ''کافرانہ زندگی'' زندگی کے دو طرز کے نام ہیں۔ مومنانہ طرزِ زندگی یعنی جس زندگی کی بنیاد عبودیت پر ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے کہ جب انسان یہ آگاہی رکھتا ہو کہ میں اس کائنات میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں ورنہ سورج، چاند، ستارے اور کائنات کی ہر چیز عبد خدا ہیں کیونکہ یہ تمام چیزیں ارادۂ خدا، وجودِ خدا اور ہستی خدا سے قائم ہیں ان کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے لیکن چونکہ خدا نے انسان کو ارادہ و اختیار دیا ہے یہ گمراہ ہوجاتا ہے، اپنی عبودیت بھول جاتا ہے، جب عبودیت بھول جاتا ہے، عبد ہونے کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور جب انسان سے احساسِ عبودیت ختم ہوجائے پھر یہ کافرانہ طرزِ زندگی اپنالیتا ہے۔

مفہوم عبد:

عبد کا مطلب نوکر نہیں ہے یعنی عبد کا مطلب کسی کے لئے کام کرنا نہیں ہے، عبد کا مفہوم یہ ہے کہ جس کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے، عبودیت مالکیت کے مقابلے میں ہے، جو مالک نہ ہو وہ عبد ہے، ہم جتنا مالکیت سے دستبردار ہوں گے اُتنے ہی عبد کہلائیں گے اور جتنے مالکیت کے مدعی ہوں گے اتنے ہی عبودیت سے باہر ہوں گے۔ پس جس کو یہ تصدیق ہو جائے کہ میرا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ سب کچھ خدا کا ہے اور یہ اُس کے رویے سے نظر آئے تو وہ عبد کہلائے گا۔

درجاتِ عبادات:

تمام عبادات کے بارے میں تین درجے ہیں یا تین معرفتیں ہیں، جب انسان انھیں حاصل کرے پھر حقیقی عبادت کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ وہ احکامِ عبادات، آدابِ عبادات اور اسرارِ عبادات ہیں۔

۱۔احکامِ عبادات:

احکامِ عبادات سے مراد وہ احکامات ہیں جو توضیح المسائل میں بیان ہوتے ہیں، یہ عبادت کا پہلا مرحلہ ہے، اس مرحلے یا اس معرفت سے انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ عبادت کو صحیح بجالائے۔ احکامِ عبادات عبادت کو صحیح انجام دینے کا طریقہ بیان کرتے ہیں یعنی احکام بتاتے ہیں کہ صحیح عبادت کیا ہوتی ہے؟ جن کو احکامِ عبادات معلوم نہیں یہ صحیح عبادت نہیں کرتے بلکہ غلط عبادت کرتے ہیں اور جو احکامِ عبادات سے واقف ہوں وہ درست عبادت انجام دیتے ہیں۔

۲۔آدابِ عبادات:

آدابِ عبادات یہ بتاتے ہیں کہ خوبصورت اور زیبا عبادت کیسے ہوتی ہے؟ مثلاً لکھنے پڑھنے کا طریقہ اور خوبصورت لکھائی و پڑھائی میں فرق ہے۔ بعض قرآن درست پڑھتے ہیں لیکن بعض درست اور بہت ہی خوبصورت قرآن پڑھتے ہیں، بعض درست اذان دیتے ہیں اور بعض درست اور خوبصورت اذان دیتے ہیں۔ جو احکام سے مکمل آگاہ ہیں وہ عبادت صحیح انجام دیتے ہیں ان کیلئے دوسرا مرحلہ صحیح عبادت کو خوبصورتی سے انجام دینا ہے۔ کسی بھی چیز کے اندر جو کمال ہوتا ہے اس کے ظہور کا نام حسن و جمال ہے۔ کسی شئی، کام یا کسی عمل کے اندر اگر فضیلت پنہاں موجود ہو تو یہ کمال ہے اور اگر یہ فضیلت ظاہر ہوجائے تو یہ جمال ہے۔ جمال و حسن رنگوں، پوڈروں اور

> انسان کے افکار، اعتقادات، ارادوں اور عزائم پر علمی مسئلہ اثر انداز نہیں ہوتا جب تک یہ حافظے سے نکل کر دل میں نہ آئے اور دل کے ذریعے انسان کے پورے وجود میں سرایت نہ کرے اس وقت تک معرفت رویہ نہیں بنتی۔

کریموں سے نہیں آتا بلکہ کمال کے ظہور کا نام حسن ہے۔ حَسین بننے کے لئے دو کام کرنے ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنے اندر فضائل پیدا کرنے پڑتے ہیں اور دوسرا ان فضائل کو مناسب انداز سے ظاہر کرنا پڑتا ہے تب ہی انسان خوبصورت، زیبا اور حسین ہوتا ہے۔ آدابِ عبادت عبادتوں کو حسین، زیبا اور خوبصورت بناتے ہیں۔

۳. اسرارِ عبادات:

تیسرا مرحلہ اسرارِ عبادات ہیں۔ اسرارِ عبادات میں عبادتوں کی حقیقت اور باطنِ عبادات بیان کیا جاتا ہے جو روحِ عبادت ہے۔ احکام و آداب ظاہر سنوارتے ہیں یعنی ایک ظاہر کی تصحیح کے لئے ہے اور ایک ظاہر کی زیبائی کے لئے ہے لیکن اسرارِ عبادات عبادت کی روح اور باطن کے لئے ہیں جس سے یہی حسین و صحیح عبادت زندہ ہوجاتی ہے اور وہ اصل عبادت ہے۔ انسان ظاہرِ عبادات سے عبد نہیں بنتا بلکہ روحِ عبادت اور باطنِ عبادت سے عبد بنتا ہے۔

مفہومِ عبادت:

عبادت، اظہارِ عبودیت کو کہتے ہیں، عبودیت بندگی کا نام ہے اور بندگی دستبرداری کا نام ہے۔ ہم دست درازی کو بندگی کہتے ہیں، دست درازی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو کہتے ہیں۔ گدائی عبودیت نہیں ہے بلکہ دستبرداری عبودیت ہے مثلاً جب ہم کہیں بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی قوی شخص آکر وہاں سے ہٹنے کا حکم صادر کرے تو ہم وہاں سے اٹھتے ہیں، ہم دستبردار ہوتے ہیں۔ پس کسی چیز سے ہاتھ اٹھانے کو دستبرداری کہتے ہیں۔ کسی جگہ بھی دست درازی کی فضیلت نہیں ہے بلکہ دست درازی سے ممانعت کی گئی ہے، اس میں فضیلت ہے کہ کسی پھیلے ہوئے ہاتھ کی مدد کرنی چاہئے لیکن خود کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے کا حکم ہے اس کیلئے عفیف بننے کی ضرورت ہے۔ باعفت انسان کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ یہاں یہ اشتباہ ہوا ہے کہ گدائی و بندگی کو مخلوط کر دیا گیا ہے، گدائی رزیلت ہے یعنی منفی صفت ہے جبکہ بندگی فضیلت ہے۔ بندگی خدا کی بارگاہ میں ہر چیز سے دستبرداری کا نام ہے۔ ہم جب نماز کے بارے میں بتانا شروع کرتے ہیں تو صرف ارکانِ نماز اور واجباتِ نماز بتاتے ہیں مثلاً پہلا واجب نیت ہے اور دوسرا تکبیرۃ الاحرام ہے۔ تکبیرۃ الاحرام کے احکام بھی ہیں اور آداب بھی ہیں، صحیح تکبیر کہنے کے لئے احکام ہیں اور خوبصورت تکبیر کہنے کے لئے آداب ہیں لیکن روحِ تکبیرۃ الاحرام کچھ اور ہے۔

علامتی اظہارِ عبودیت:

ہم نماز کا آغاز اللہ اکبر سے کرتے ہیں اور اللہ اکبر کہتے ہوئے رفعِ یدین کرتے ہیں یعنی ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں۔ اللہ اکبر کے ساتھ ہاتھ اٹھانے کا حکم کیوں ملا ہے؟ کیونکہ اللہ اکبر انسان کی وہی باطنی اور قلبی آگاہی اور معرفت ہے جو اب زبان پر آرہی ہے یعنی جب ہم خداوند متعال کی کبرائی کی گواہی دے رہے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں تو وہ رویہ بھی ساتھ ہونا چاہیے یعنی یہ اللہ اکبر انسان کا رویہ ہونا چاہیے۔ علامہ اقبالؒ کے بقول کہ

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

روحِ بلالی سے مراد کیا ہے؟ یعنی اگر انسان بغیر آگاہی کے اللہ اکبر کہے تو یہ رسمِ اذان ہے۔ حقیقتِ اذان یہ ہے کہ جب ہم اللہ اکبر کہتے ہیں تو اپنی معرفت اور اپنے ایمان کا اظہار کر رہے ہیں اور جب یہ معرفت آگاہی بن کر ہماری زبان پر آتی ہے اس وقت یہی معرفت ہمارا رویہ بن جانا چاہئے۔ جب اللہ اکبر رویہ بنتا ہے کہ اگر خداوند متعال اکبر ہے تو پھر میں اس کا عبادت گزار ہوں، میں اس کا عبد ہوں۔ پس عبد اور عبودیت رویہ ہونا چاہیے اور عبودیت یعنی میرا کچھ بھی نہیں ہے، میں دستبردار ہوں اور میں نے اپنا ہاتھ اٹھالیا ہے چونکہ میرا کچھ بھی نہیں ہے پس یہ رویہ بن جانا چاہئے۔ پس اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھ اٹھانا یہ میرا رویہ ہے البتہ یہ ایک علامتی کام ہے یعنی عبادت علامتی طور پر اظہارِ عبودیت ہیں، علامتی طور پر انسان بارگاہِ خدا میں حاضر ہوکر اپنی عبودیت کا اظہار کرتا ہے۔

حقیقی عبودیت:

تکبیرۃ الاحرام میں اللہ اکبر کہہ کر رفعِ یدین کرنا یہ علامتی رویۂ عبادت ہے لیکن عبودیت جب رویے میں تبدیل ہو جائے تو کیسی عبودیت بنتی ہے؟ آج مسلمانوں کے عملی رویوں میں مسلمانی ہے لیکن کہیں بھی عبودیت نہیں ہے، ہماری نفسیاتی حالت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اوراس نفسیاتی حالت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ہماری عملی زندگی میں ایک مسلمان اور غیر مسلمان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے، ذہنیتوں کا فرق ہے، مسلمان کی ذہنیت غیر مسلمان کی ذہنیت سے مختلف ہے لیکن دونوں کے رویے، رفتار، کردار، ترجیحات، رجحانات، شوق اور خوف ایک جیسے ہیں، پس وہ ربوبیت کے بارے میں جو آگاہی تھی جو نظریاتی مرحلہ تھا کہ خدا خالق و مالک ہے وہ ایمان نہیں بنا بلکہ فقط علم بنا ہے، علمِ کلام میں پڑھ کر کتابیں بھی لکھتے ہیں اور تقریریں بھی کرتے ہیں لیکن ہمارے کسی رویے میں عبودیت و بندگی ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ معرفت اور آگاہی جب رویہ بن جائے تو انسان کے اندر جو احساس یا حالت پیدا ہوتی ہے وہ عبودیت ہے۔

نظریاتی مرحلے کا عملی نتیجہ:

امت سازی کا پہلا مرحلہ نظریاتی مرحلہ ہے، نظریاتی مرحلے کا عملی نتیجہ عبودیت و بندگی ہے۔ اس وقت ہماری جو موجودہ حالت ہے وہ یہ ہے کہ ہماری ذہنیتیں اسلامی ہیں لیکن ہمارے اعمال اور طرزِ زندگی غیر اسلامی ہے، اسلام یا ہماری نفسیاتی حالت ہے یا علمی مسئلہ ہے لیکن ہم عبد بن کر نہیں رہ رہے اور ہماری زندگی کے کسی بھی شعبے میں عبودیت و بندگی نظر نہیں آ رہی۔ قرآن نے اس ترتیب سے تعبیریں استعمال کی ہیں کہ 'یا ایھا الناس '' اے لوگو،''یا ایھا الذین آمنو '' اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو،''یا عباد اللہ' ' اے بندگانِ خداوند متعال۔ یہ وہ سفر ہے جسے ایک امت نے طے کرنا ہے یعنی لوگوں سے مومنین تک اور مومنین سے عبادت تک کا سفر طے کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک انسان عبد بن جاتا ہے اور مقامِ عبودیت و بندگی باور کر لیتا ہے، تصدیق کر لیتا ہے اور بندگی کے دائرے میں آ جاتا ہے تو جب یہ بندگی اس کا رویہ اور عمل بن جاتی ہے، حرکات و سکنات میں تبدیل ہو جاتی ہے، اب اس کی زندگی کے جتنے بھی متعلقہ شعبے ہیں وہ سب کے سب فرمانِ الٰہی کے تحت آ جاتے ہیں یعنی مالک کے دستور کے تحت آ جاتے ہیں۔ جو اپنی عملی زندگی مالک کے فرمان کے مطابق بسر کرے اسی کو عبد کہتے ہیں۔

عبد اور مستکبر:

ہماری عمر، ہماری زندگی اور ہمارے مستقبل کا مالک بھی خداوند متعال ہے۔ عبد کے مقابلے میں مستکبر ہوتا ہے جو انسان عبد ہو لیکن وہ اظہارِ عبودیت نہ کرتا ہو اور عملاً عبودیت کی راہ پر نہ چلتا ہو وہ مستکبر ہے۔ شیطان مستکبر تھا، فرعون مستکبر تھا، تباہی اور گمراہی کے جتنے نمونے قرآن مجید نے ذکر کیے ہیں وہ سب استکباریت کے وجہ سے تباہ ہوئے ہیں، یہ مستکبریت ہم سب کے اندر موجود ہے عبودیت جتنی کم ہے استکباریت اتنی ہی زیادہ ہے۔ عبد کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا، وہ کہتا ہے جو مالک کا فیصلہ ہے وہی میرا فیصلہ ہے کیونکہ میں اپنی اوقات، اپنی عمر اور اپنے لحظات کا مالک نہیں ہوں اگر میں احساسِ مالکیت شروع کروں تو اسی لحظے میں مستکبر ہو جاؤں گا۔ عبد جب کوئی ارادہ یا فیصلہ کرتا ہے تو عبودیت کے تحت ارادہ اور فیصلہ کرتا ہے، جب انتخاب کرتا ہے عبودیت کے تحت انتخاب کرتا ہے، جب کسی چیز کو چنتا ہے تو عبودیت کے تحت چنتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ مستکبر ہے جو مالک کے مقابلے میں اعلان کر رہا ہے کہ

''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' (سورہ النزٰعت، آیت ۲۴)

میں بھی رب اور مالک ہوں، میں بھی کوئی حیثیت رکھتا ہوں۔

بنیادِ امتِ اسلامی:

پس امتِ اسلامی کیلئے درحقیقت عملی زندگی کی بنیاد بندگی ہے، بندگی معرفتِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے یعنی اس نکتے سے کہ میرا خالق، مالک اور رب خداوند

> **عبودیت مالکیت کے مقابلے میں ہے، جو مالک نہ ہو وہ عبد ہے، ہم جتنا مالکیت سے دستبردار ہوں گے اُتنے ہی عبد کہلائیں گے اور جتنے مالکیت کے مدعی ہوں گے اتنے ہی عبودیت سے باہر ہوں گے۔ پس جس کو یہ تصدیق ہو جائے کہ میرا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ سب کچھ خدا کا ہے اور یہ اُس کے رویے سے نظر آئے تو وہ عبد کہلائے گا۔**

متعال ہے، یہ معرفت انسان کے اندر بندگی پیدا کر دیتی ہے، جب بندگی انسان کا عملی رویہ بن جائے تو اس وقت انسان امت بننے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے یعنی مستکبر مل کر امت نہیں بنتے بلکہ عبادِ خداوند متعال مل کر امت بنتے ہیں۔ مستکبر تسلط جمانے، حکومت، قوم، پراپرٹی اور اقتدار پر قبضہ کرنے اور طاقت وقدرت کے حصول کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ عبادِ خدا ان چیزوں کے لئے جمع نہیں ہوتے لہٰذا عبادِ خدا کے جمع ہونے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہوتی چونکہ سب عبد ہیں، مستکبر آپس میں جدا ہوجاتے ہیں مگر عبد کبھی جدا نہیں ہوتے چونکہ سب کا مالک ایک ہے۔ جب سارے ایک مالک کی بندگی واطاعت میں آجاتے ہیں اوراس کے مطیع وفرمانبردار ہوجاتے ہیں تب ایک ہوجاتے ہیں۔

عصرِ حاضر کا حل، روشِ انبیاءؑ:

امت سازی کے حوالے سے قرآن مجید میں خداوند متعال نے انبیاءؑ کا جو طریقۂ کار بیان کیا ہے ہر زمانے کے لئے وہی روشِ انبیاءؑ ہے حتیٰ آج کے لئے بھی وہی طریقہ کار ہے۔ آج انبیاءؑ نہیں ہیں لیکن انبیاءؑ کی روشیں قرآن نے محفوظ رکھی ہوئی ہیں اورانبیاءؑ کے ورثاء کو حکم دیا ہے کہ روشِ انبیاءؑ پر قدم اٹھائیں۔ ایک سوال جو عوام کے ذہنوں میں ہے کہ آج اگر ایک نبی ہوتے تو اس زمانے میں وہ کیا کرتے؟ اگر آج پاکستان میں ایک نبی ہوتے تو کیا کرتے؟ کیا نبی ایک پارٹی بناتے؟ ایک تنظیم بناتے؟ ایک مدرسہ بناتے؟ ایک نبی ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ یہ نبی وہی کام کرتے جو سابقہ انبیاءؑ نے کیا تھا چونکہ سب انبیاءؑ کی روش ایک رہی ہے، انبیاءؑ ایک ہی سنت وروش کے تابع ہیں یعنی انبیاءؑ سب سے پہلے امت سازی کرتے اور امت سازی کے لئے پہلے نظریاتی میدان ہموار کرتے، نظریاتی میدان کی ابتداء لا الہ الّا اللہ سے کرتے اور لا الہ الّا اللہ اس طرح سے انسانوں کو سمجھاتے کہ یہ لا الہ الّا اللہ ان کی آگاہیٔ درونی بن جاتی اورانہیں یہ پتہ چل جاتا کہ مالک خدا ہے، جب مالک خدا ہے تو یہ تمام جو اس معرفت کی طرف آئیں گے یا جن کے اندر یہ معرفت ہوگی، یہ عبدِ خدا بن جائیں گے اور جب یہ خدا کے عبد ہوں گے پھر ان کے آپس کی تمام مشکلات ختم ہوجاتی ہیں، ان کے رویے، ان کا اخلاق، ان کی سوچ، ان کے طور طریقے اوران کی ساری چیزیں بدل کر یکساں ہوجاتی ہیں چونکہ سب کے سب عبدِ خدا و بندگانِ خدا ہیں۔

خاتم النبیّین ﷺ کا طریقۂ امت سازی:

قرآن مجید میں خداوند متعال نے بعض انبیاءؑ کی روشوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ہر نبی نے آکر سب سے پہلے امت سازی کی ہے اورامت سازی کیلئے اپنی قوم میں سب سے پہلا مرحلہ جو طے کروایا وہ یہ ہے کہ انہیں قومیت سے نکال کر امت کے قالب میں تبدیل کیا۔

سورہ بقرہ آیت نمبر۲۱ میں پیغمبر اکرم ﷺ کے متعلق جو آیت آئی ہے وہ یہ ہے کہ

"یَاأَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" (سورہ بقرہ، آیت نمبر۲۱)

انبیاءؑ نے پہلے ہی دن آکر لوگوں کو نمازوں پر نہیں لگایا، رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں عبودیت شروع کروائی اور مدینے میں نمازیں شروع کروائیں، عبادت سے پہلے عبودیت ضروری ہے۔ ہم عبد بنائیں یا نہ بنائیں ہر آدمی کو عبادت گزار بنا دیتے ہیں لہٰذا وہ بغیر وضو کے بھی پڑھ لیتا ہے۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک عالم نے کسی جوان کو نماز پڑھنے کی ہدایت کی اُس نے بہانہ بنایا کہ میں غریب ہوں، مزدوری سے تھکا آتا ہوں جس کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ سکتا، مولانا نے کہا کہ آپ چالیس دن تک نماز پڑھو میں تمہیں بچھڑا دوں گا، یہ جوان گیا اور چالیس دن تک نماز پڑھی، چالیس دن کے بعد واپس آیا اور کہا کہ مجھے بچھڑا دیں تو مولانا نے کہا کہ کس چیز کا بچھڑا؟ جوان نے کہا کہ آپ نے کہا تھا کہ تم چالیس دن نماز پڑھو گے تو میں تمہیں بچھڑا دوں گا اور میں نے پورے چالیس دن نماز پڑھی ہے، مولانا نے کہا کہ وہ تو میں نے آپ کو رغبت دلانے کیلئے کہا تھا جب آپ چالیس دن تک بچھڑے کی خاطر نماز پڑھو گے پھر تمہیں عادت پڑ جائے گی اور تم نمازی بن جاؤ گے، لہٰذا میں آپ کو بچھڑا نہیں دوں گا، اُس جوان نے کہا کہ مجھے شک تھا کہ آپ نہیں دیں گے اسی لئے میں نے ساری نمازیں بغیر وضو کے پڑھی تھیں۔ اکثر لوگ غربت کو

حَسین بننے کے لئے دوکام کرنے ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنے اندر فضائل پیدا کرنے پڑتے ہیں اور دوسرا ان فضائل کو مناسب انداز سے ظاہر کرنا پڑتا ہے تب ہی انسان خوبصورت، زیبا اور حسین ہوتا ہے۔ آداب عبادت عبادتوں کو حسین، زیبا اور خوبصورت بناتے ہیں۔

ہماری عملی زندگی میں ایک مسلمان اور غیر مسلمان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے، ذہنیتوں کا فرق ہے، مسلمان کی ذہنیت غیر مسلمان کی ذہنیت سے مختلف ہے لیکن دونوں کے رویے، رفتار، کردار، ترجیحات، رجحانات، شوق اور خوف ایک جیسے ہیں، پس وہ ربوبیت کے بارے میں جو آگاہی تھی جو نظریاتی مرحلہ تھا کہ خدا خالق و مالک ہے وہ ایمان نہیں بنا بلکہ فقط علم بنا ہے

بہانہ بنا کر عبادات بجا نہیں لاتے۔ امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ ”جب تمہیں خدا کی نعمتیں ملیں تو تم ان نعمتوں کے ذریعے سے بدمست مت بنو اور جب خدا نعمتیں لے لے تو بدبخت مت بنو“ اس وقت لوگ دو حصوں میں تقسیم شدہ ہیں جن کے پاس کچھ ہے وہ بدمست ہیں اور جن کے پاس کچھ نہیں ہے وہ بدبخت ہیں۔ لالچ کی نماز اور عبودیت کی نماز میں یہی فرق ہوتا ہے، لالچ کی نماز بغیر وضو کے بھی ہو جاتی ہے لیکن عبودیت کی نماز ایسے ممکن نہیں ہے۔

دیگر انبیاءؑ کی روش:

سورہ مائدہ آیت نمبر ۷۲ میں ہے کہ

”وَقَالَ الۡمَسِيۡحُ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبَّكُمۡ......“

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو سب سے پہلے آپؑ نے بھی اپنی قوم کو کہا کہ میرے اور اپنے رب کی بندگی کرو۔

سورۂ اعراف آیت نمبر ۶۵ میں ہے کہ

”وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ......“

جب خداوند متعال نے حضرت ہود علیہ السلام کو قوم عاد کی طرف بھیجا تو آپؑ نے بھی سب سے پہلے یہی کہا کہ اے قوم! بندگی خدا کرو۔ اسی طرح سورہ اعراف کی آیت نمبر ۷۳ میں ہے کہ

”وَاِلٰى ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ ......“

جب حضرت صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی طرف بھیجا تو انہوں نے بھی آ کر کہا اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، عبادِ خدا بنو۔ اسی طرح سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۸۵ میں ہے کہ

”وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ ......“

جب حضرت شعیب علیہ السلام ایک علاقے میں آئے تو انہوں نے بھی آ کر سب سے پہلے یہی کام کیا اور کہا کہ اے قوم اللہ کی بندگی کرو۔ اسی طرح سورہ نوح کی آیت نمبر ۲۳ میں ہے کہ

”وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ ......“

جب حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں آئے تو آپؑ نے بھی اسی سے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ جہاں پر انبیاءؑ کا تذکرہ آیا ہے وہاں پر یہ تذکرہ بھی آیا ہے کہ اے لوگو! عبادتِ خدا و بندگیٔ خدا کرو۔

امت سازی کا پہلا مرحلہ:

پس امت سازی کیلئے پہلا مرحلہ لوگوں کو خداوند متعال کی بندگی میں لانا ہے، ایسا نہیں ہے کہ جیسے بھی انسان ہوں ان کو ملا کر ہم ایک گروہ بنالیں اور اس گروہ کا نام امت رکھ لیں، انبیاءؑ نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ امت سازی کے لئے پہلا مرحلہ پروردگار اور مالک کے بارے میں آگاہی دینا اور انسان کو مقامِ بندگی تک پہنچانا ہے، جس میں زیادہ اہم نکتہ ربوبیت کا ہے۔ ربوبیت انبیاءؑ کی دعوت میں سرِ فہرست ہے۔ جس چیز سے انسان امت بنتا ہے، انسانی گروہ امت کی شکل اختیار کرتے ہیں اور ایک نظام کے تحت آ جاتے ہیں وہ یہی نکتۂ ربوبیت ہے لہٰذا خداوند متعال نے سب سے زیادہ اپنی جس صفت کا ذکر کیا ہے وہ وہی ربوبیت ہے، مالکیت، خالقیت اور صانعیت کا ذکر کیا ہے، اپنے علم و سمیع و بصیر ہونے کا ذکر فرمایا ہے، بہت ساری صفات خداوند متعال نے قرآن مجید میں اپنے لئے ذکر فرمائی ہیں لیکن سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ جس چیز کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے وہ ربوبیتِ خدا کا ذکر ہے، ہم دعاؤں میں اور قنوت میں جو ”ربنا“ کا استعمال کرتے ہیں یہی سب سے مشکل مرحلہ ہے، ربوبیت ہی طے کرنے کے لئے دشوار ترین مرحلہ ہے، چونکہ نظامِ الٰہی، ربوبیتِ الٰہی کے تحت آتا ہے۔ ہم ربوبیت کو بھی کلامی بحث بنا کر اس کا لفظی تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں پھر اس کے بعد دو تین دلیلیں دے کر بحث ختم کر کے قرض لینے کے لئے امریکہ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ آج ہمارا رب اللہ نہیں ہے بلکہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام ہمارا رب ہے، ہمارا رب وہ نظام ہے جس کے ساتھ ہم منسلک ہیں۔ پس امت سازی بہت ہی دشوار کام ہے۔ عبد

مستکبر مل کرامت نہیں بنتے بلکہ عبادِ خداوند متعال مل کرامت بنتے ہیں۔ مستکبر تسلط جمانے، حکومت، قوم، پراپرٹی اور اقتدار پر قبضہ کرنے اور طاقت وقدرت کے حصول کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ عبادِ خدا ان چیزوں کے لئے جمع نہیں ہوتے لہٰذا عبادِ خدا کے جمع ہونے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہوتی چونکہ سب عبد ہیں، مستکبر آپس میں جدا ہوجاتے ہیں مگر عبد کبھی جدا نہیں ہوتے چونکہ سب کا مالک ایک ہے۔

بننا بھی بہت ہی دشوار کام ہے، خصوصاً ان انسانوں کے لئے جو عبودیت سے کوسوں دور ہو چکے ہیں جو استکباریت میں اتنے آگے جا چکے ہیں کہ ان کے سامنے فرعون چھوٹا نظر آتا ہے۔ ایک مصنف نے ''انسان جو خدا بن گئے'' کے نام سے کتاب لکھی ہے یعنی وہ انسان جو اس زمین پر رہ کر خدا بن گئے ہیں یعنی انہیں اپنی خدائی کا دعویٰ ہے، جیسے فرعون کہتا تھا کہ

''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' (سورہ النزعٰت، آیت ۲۴)

ربوبیت کا دعویٰ رکھتا تھا، ہمیں اپنے گھروں کے اندر غور کرنا چاہئے، والد جو گھر کا کفیل ہے، کمانے والا ہے وہ خود کو خاندان کا رب سمجھتا ہے، فیکٹری کا مالک خود کو مزدوروں کا رب سمجھتا ہے، یہ وہ انسان ہیں جو عبد نہیں بنے بلکہ رب بن گئے ہیں۔ فرعونیت استکباریت ہے، یہی سادہ اور معصوم چہروں کے اندر خطرناک ترین فرعونیت چھپی ہوئی ہے، بہت وحشت ناک فرعونیت پنہان ہے۔

شرحِ صدر کی ضرورت:

یہ لوگ جو خود کو رب سمجھتے ہیں ان کو ربوبیت کے درجے سے اتار کر نارمل حالت میں لانا ہے اور پھر وہاں سے انھیں عبودیت تک پہنچانا ہے جو بہت ہی دشوار کام ہے۔ فرعونوں کو عبد بنانے کے لئے شرحِ صدر چاہیے۔ سورہ طٰہ میں ہے کہ

''قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ . وَیَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ . وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ'' (سورہ طٰہ، آیت نمبر ۲۵ تا ۲۷)

یہ دشوار ترین کام ہے، اس کے لئے خدا سے دعا مانگیں کہ خدایا اس اندرونی فرعون کو ربوبیت کی کرسی سے اتار کر عبودیت تک پہنچانے کے لئے شرحِ صدر عنایت فرما۔ یہ سارے متاع انسان کو چاہئیں تا کہ اس کے ذریعے سے انسان اس فرعون کو ربوبیت سے نکال کر عبودیت میں لے آئیں۔ ہمیں چاہئے کہ یہ تجربہ ہم اپنی ذات سے کریں۔ انبیاءؑ نے لاکھوں فرعونوں کو فرعونیت سے نکال کر عبودیت کے مقام تک پہنچایا اور عبودیت تک پہنچا کر پھر اُن سے امت بنائی، کیوں کہ امت عباد سے بنتی ہے فرعونیت سے نہیں بنتی۔

ربوبیت اہم ترین رکن:

اس مرحلے کا دوسرا اہم ترین نکتہ ربوبیت ہے لہٰذا ہم اگر قرآن مجید کا مطالعہ کریں اور غور وتدبر کریں تو سب سے زیادہ تذکرہ ربوبیت کا ملتا ہے چونکہ ربوبیت نظامِ خدا کا نام ہے، عبودیت یعنی انسان ربوبیتِ خدا کے تحت آجائے یعنی مربوب بن جائے جس طرح سید الشہداءؑ دعائے شریفِ عرفہ میں فرماتے ہیں کہ

''انت الرب وانا لمربوب''

تو رب ہے اور میں مربوب ہوں، مربوبِ خدا بننا دشوار کام تھا جو انبیاءؑ نے انجام دیا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم خود ان اصولوں کو سمجھیں، ان پر ایمان لے آئیں اور پھر امت سازی کے لئے انہیں اصولوں کو بروئے کار لائیں، امت سازی یوں ممکن نہیں ہے کہ ہم قرآن کو چھوڑ کر شرق وغرب کی کتابوں کا مطالعہ کرکے، تنظیموں اور انجمنوں کا انسائیکلوپیڈیا پڑھیں اور پھر ان سے دستور نکالیں اور ان کا نام اسلامی رکھتے جائیں، اس سے کوئی چیز اسلامی نہیں ہوتی، اسلامی چیز وہی ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے، جو قرآن کی راہنمائی میں بنے وہ اسلامی نظام ہے۔

۱۰

امت سازی از نظر قرآن

انسان کا فراموش شدہ عھد ربوبی

گروہ معارف

تشکیلِ امت، اہم ترین فریضہ:

قرآن مجید میں خداوند متعال نے انبیاء کرامؑ، آئمہ ھدیٰؑ، اولیائے کرام، عام مسلمانوں اور مومنین کے لئے تشکیلِ امت کو اہم ترین فریضہ قرار دیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران آیت نمبر ۱۰۴ میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ"...... (آلِ عمران/۱۰۴)

امت سازی ایک عمومی، بنیادی اور اولین فریضہ ہے۔ یہ وہ فریضہ ہے جس کے قیام سے دین کے تمام فرائض قائم ہو سکتے ہیں اور جس کے ترک کرنے سے سارا دین ترک ہو جاتا ہے جیسا کہ آج دین صرف اسی وجہ سے متروک ہے۔ امت سازی کا حکم خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے اور ساتھ ہی عملی طریقۂ کار اور منشور بھی بتایا ہے کہ کس طرح سے یہ امت تشکیل دی جا سکتی ہے اور اس کیلئے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

مفہومِ امت:

اُمت اُس انسانی اجتماع کو کہتے ہیں جو دین کے گرد وجود میں آیا ہو اور جس کا محور دین ہو اور دین ہی نے یہ اجتماع قائم کیا ہو لیکن دین کے لئے شرط ہے کہ وہ بھی مکتبی شکل میں ہو اور قابلِ تمسک ہو، خداوند متعال کا فرمان ہے کہ

"وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا"

(سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳)

اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامو اور آپس میں تفرقہ نہ کرو اور اس کے بعد فرمایا کہ

"وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ"......

حبل اللہ سے اعتصام کرنا یہ امت سازی کیلئے بنیادی رکن ہے۔

نظریاتی و اعتقادی مرحلہ:

امت سازی کیلئے پہلا مرحلہ نظریاتی مرحلہ ہے جیسا کہ سیرتِ طیبہ رسول اللہ ﷺ میں بھی ہے اور قرآن مجید نے بھی آغاز اس مرحلے سے کیا ہے۔ امت سازی کیلئے سب سے پہلے نظریاتی اور اعتقادی مرحلہ طے ہونا چاہئے چونکہ ہر چیز کی بنیاد انسان کے اعتقاد اور نظریے پر ہے، اگر نظریاتی میدان میں انسان درست نظریہ اپنا لے تو ایک درست نظام بھی اس کی بنیاد پر قائم کر سکتا ہے اور اگر نظریاتی مرحلے میں انسان صحیح نظریہ نہ اپنا سکے اور خطا کر جائے تو پھر ہرگز وہ درست نظام اختیار نہیں کر سکتا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرے کے اندر فاسد ترین نظام، فاسد ترین طرزِ زندگی اور فاسد ترین ماحول موجود ہے اور ان سب کی وجہ وہ غلط نظریات ہیں جن کی بنیاد پر یہ فاسد نظام قائم ہوئے ہیں پس وہ نظریات درحقیقت فساد کا شکار ہیں اور

امت سازی ایک عمومی، بنیادی اور اولین فریضہ ہے۔ یہ وہ فریضہ ہے جس کے قیام سے دین کے تمام فرائض قائم ہوسکتے ہیں اور جس کے ترک کرنے سے سارا دین ترک ہوجاتا ہے جیسا کہ آج دین صرف اسی وجہ سے متروک ہے۔ امت سازی کا حکم خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے اور ساتھ ہی عملی طریقۂ کار اور منشور بھی بتایا ہے کہ کس طرح سے یہ امت تشکیل دی جاسکتی ہے اور اس کیلئے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

درست نہیں ہیں۔ چونکہ نظریاتی مرحلے میں دین محور ہے پس دینی نظریہ اور دینی تفسیر کی ضرورت ہے جس کی بنیاد لا الہ الّا اللہ ہے یعنی خداوند تعالیٰ کی ذات خالق، مالک اور رب ہے۔

نظریاتی مرحلے میں پہلا قدم:

نظریاتی مرحلے میں سب سے اہم مرحلہ جو اُمت سازی کے لئے رہبرانِ امت اور خود امت نے بھی طے کرنا ہے وہ نظامِ ربوبیت کو سمجھنا ہے۔ قرآن مجید میں عدد اور تاکید کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ اسرار اسی نظامِ ربوبیت پر ہے۔ قرآن مجید نے ربوبیت کو ایک نظام کے طور پر ذکر کیا ہے یعنی انسان کا اعتقاد و ایمان ہو اور تصدیقی ایمان ہو کہ خداوند تعالیٰ تمام عالمین کا رب ہے۔ جب تک راز و رمزِ ربوبیت نہیں کھل جاتا نظریاتی مرحلہ طے نہیں ہوسکتا، کم از کم وہ نظریاتی مرحلہ طے نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر امت تشکیل دی جاسکے اور جس پر امت کا وجود قائم کیا جاسکے۔

عہد ربوبیت:

خداوند تعالیٰ نے تمام بشریت سے جو عہد لیا ہے وہ بھی اپنی ربوبیت کا ہی لیا ہے باقی جہات کا عہد نہیں لیا۔ سورۂ مبارکہ اعراف آیت نمبر ۱۷۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ

”وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ......“

”یعنی یاد کریں اُس منظر کو کہ جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو حاضر کیا۔“ بعضوں نے یہ کہا ہے کہ انسانوں کو خلقت سے پہلے ذروں کی شکل میں حاضر کیا اور پھر اُن سے عہد لیا گیا لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ یعنی آپ یاد کریں اس منظر کو کہ جب تیرے پروردگار نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو حاضر کیا، یہاں آدم کی پشت سے نہیں ہے بلکہ بنی آدم اور ابنائے آدم کی پشت سے حاضر کیا ہے اور حاضر کرنے کے بعد پھر پوچھا کہ

”......اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ......“

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ پھر ان سب نے کہا کہ

”......قَالُوْا بَلٰی......“

ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ پھر اس کے بعد کہا کہ

”......شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ“

ہم آج گواہی دیتے ہیں لیکن قیامت میں اس سے غافل ہوں گے۔ پس خداوند تعالیٰ نے ہم سب سے خالقیت کا عہد نہیں لیا بلکہ ربوبیت کا عہد لیا ہے۔ یہ عہد کسی ایک معین تاریخ کو مجمع لگا کے لفظی عہد نہیں لیا گیا بلکہ یہ ایک امرِ مسلسل اور ایک وجودی عہد ہے۔ پشتِ بنی آدم میں بننے سے پہلے انسان آدمیت میں نہیں ہوتا بلکہ مٹی میں ہوتا ہے اُس کے بعد ایک مرحلے میں انسان آتا ہے جہاں مرحلۂ آدمیت میں داخل ہوتا ہے تو پھر عہد ہوتا ہے، پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا رب کون ہے؟ اور وہ عہد کرتے ہیں کہ ہمارا رب خدا ہے، اس کے علاوہ کسی چیز کا عہد نہیں لیا جاتا فقط انسان سے ربوبیت کا عہد لیا جاتا ہے۔

انسان کو خودی یاد دلانا:

آج ہم عہدِ ربوبیتِ خدا کو بھول گئے ہیں چونکہ جس نے عہد کیا تھا ہم اسی کو بھول گئے ہیں یعنی ہم اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہیں، جس دن انسان کو اپنا علم ہو اُس دن اُسے عہدِ ربوبیت بھی یاد آجائے گا مثلاً ایسا شخص جو کسی حادثے کی وجہ سے سب کچھ بھول چکا ہو، اُسے اُن بھولی ہوئی چیزوں کو یاد دلانے کیلئے اُس کی یادداشت بحال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جب اس کی یادداشت بحال ہوجائے گی تو اسے سارے عہد و پیمان بھی یاد آجائیں گے۔ آج ہمیں یہ یاد نہیں ہے کہ ہم نے اللہ سے ربوبیت کا عہد کیا ہے اور یہ اس

لئے یاد نہیں ہے چونکہ ہمیں خود اپنی ہی یاد نہیں ہے، ہمارا حافظہ خراب ہو گیا ہے، ہم خود شناس نہیں بلکہ خود فراموش ہو چکے ہیں اور جو شخص خود فراموش ہو اُسے کیسے پتہ چلے گا کہ اس نے کون سا عملی اور فطری عہد کیا تھا؟ پس انسان کو پہلے یہ سکھایا جائے کہ اُس نے کیا عہد کیا ہے۔ لہٰذا روایت میں ہے کہ

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ"

"یعنی جس نے خود کو پہچان لیا پس اُس نے اپنے رب کو بھی پہچان لیا۔" چونکہ رب نے جو عہد لیا ہے وہ خودی سے لیا ہے اور اس خودی کو کوئی بھی نہیں جانتا یعنی ربوبیت یہ ہے کہ پہلے انسان کو انسان تلاش کر کے بتایا جائے کہ خود تم کیا چیز ہو؟

کاذب خودی:

آج ہم خود گمشدہ ہو چکے ہیں، اپنے آپ سے گمشدہ ہیں، ہماری جو 'خود' اور 'میں' بنی ہوئی ہے وہ کاذب ہے، وہ خود ہم نہیں ہیں وہ کوئی اور چیز بن گئی ہے۔ خواہشات نے دیکھا ہے کہ کیونکہ یہ خود کو بھولا ہوا ہے انہوں نے آ کر خود بن کر جگہ بنالی ہے اور اب ہماری جگہ پر وہ 'میں' بن گئی ہیں، خواہشات، ہوس اور شہوات ہی 'میں' یا 'انا' بن گئی ہیں۔ ایک لطیفہ نما عربی شعر ہے کہ

شغلتنا کثرۃ کارناعن پروردگارنا

آج ہمیں روز مرہ کی مصروفیات نے مشغول کر دیا ہے اور اتنا مشغول کر دیا ہے کہ ہم اپنے پروردگار سے بھی غافل ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی بیان ہوا ہے کہ

"لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ"

(سورہ حشر، آیت ۱۹)

ان لوگوں کی طرح مت بنو جو خدا کو بھول گئے ہیں اور خدا فراموشی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود کو بھی بھول گئے ہیں۔ خدا فراموشی درحقیقت خود فراموشی ہے اور خود فراموشی خدا فراموشی ہے اسی طرح خود شناسی خدا شناسی ہے اور خدا شناسی ہی خود شناسی ہے۔ خود اور خدا مربوط ہیں، خدا خالق ہے اور خود اس کی مخلوق اور تجلی ہے جس کو خود کا پتہ نہیں ہوا سے خداوند تعالیٰ کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ شخص خدا شناسی کا درس ہی کیوں نہ دیتا ہو لیکن جب خودی کو فراموش کیا ہوا ہے لہٰذا اس پر کوئی اعتبار نہیں کہ اس سے کوئی چیز مل جائے۔

زبانِ درد:

فیض ایک کیمونسٹ شاعر ہے لیکن بعض چیزوں کی طرف انہوں نے اچھی نشاندہی کی ہے، اُن کی ایک نظم کا عنوان یہ ہے کہ "میرے درد کو جو زباں ملے" یعنی انسان میں درد ہو اور اُس درد کو گفتگو کرنے کے لئے زبان مل جائے۔ فیض کہتے ہیں کہ

میرا درد نغمۂ بے صدا میری ذات ذرۂ بے نشاں
میرے درد کو جو زباں ملے مجھے اپنا نام و نشاں ملے
میری ذات کا جو نشاں ملے مجھے رازِ نظمِ جہاں ملے
جو مجھے یہ رازِ نہاں ملے میری خاموشی کو بیاں ملے
مجھے کائنات کی سروری مجھے دولتِ دو جہاں ملے

میرا درد نغمہ ہے لیکن صدا نہیں ہے۔ یہ انسان کے اندر ایک درد، چبھن، اٹھان، تکلیف دہ احساس ہے جس کی کوئی آواز نہیں ہے یعنی مجھے اپنے بارے میں پتہ نہیں ہے کہ یہ میرا درد ہے لیکن اس درد کے پاس زبان نہیں ہے اگر اس کو زبان مل جائے تو بتائے گا کہ یہ کیا درد ہے؟ میرا درد یہ نہیں ہے کہ میرے پاس دولت، ثروت، سلطنت، جاگیر اور فلاں فلاں چیزیں نہیں ہیں بلکہ درد اس چیز کا ہے کہ مجھے یہ نہیں پتہ کہ میں کیا ہوں؟ میں ایک بے نشان ہوں اور اس کی کوئی نشانی مل جائے، کوئی علامت مل جائے کہ میں کون ہوں؟ اگر میرے درد کو زبان مل جائے پھر میں اپنے آپ کو سمجھوں گا کہ میں کیا ہوں؟

خودبینی میں رازِ جہاں:

اگر مجھے اپنی ذات کا پتہ چل جائے تو مجھے دو جہاں کے راز معلوم ہو جائیں گے۔ اگر مجھے یہ رازِ پنہاں ومخفی مل گیا تو میری خاموشی ٹوٹ جائے گی، اس وقت مجھے کائنات کی سروری مل جائے گی۔ اس معرفت کے اندر کائنات کی سروری، سرداری، سلطانی اور حاکمیت ہے، اگر یہ نہ ملی تو پھر میں ہر چیز کا

اُمت اُس انسانی اجتماع کو کہتے ہیں جو دین کے گرد وجود میں آیا ہو اور جس کا محور دین ہو اور دین ہی نے یہ اجتماع قائم کیا ہو لیکن دین کے لئے شرط ہے کہ وہ بھی مکتبی شکل میں ہو اور قابلِ تمسک ہو،

غلام ہوں۔ اس وقت جاگیردار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں کے اتنے مربعے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اتنے بڑے کھیت کا غلام ہے۔ اس وقت انسان جانوروں، گاڑیوں، عمارتوں اور زمینوں کا غلام ہے چونکہ انہیں کو بنانے اور سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ پس نوکر وہی ہوتا ہے جو کسی کی خدمت کر رہا ہو۔ یہ مخدوم ہیں اور انسان خادم بنا ہوا ہے اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ یہ خود کو بھولا ہوا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہے کہ یہ کیا ہے؟ یہ اپنی اصلی شان، خصوصیات اور حیثیت کو بھول چکا ہے۔ انسان بھول چکا ہے کہ میں زمین پر خلیفۂ خدا ہوں۔ قرآن مجید کی تعبیر ہے کہ

"لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" (سورہ بقرہ، آیت ۲۹)

جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کچھ تمہارے لئے ہے لیکن اس وقت برعکس ہے کہ انسان ان کے لئے بنا ہوا ہے جبکہ یہ انسان کے لئے نہیں ہیں، انسان سب کے لئے بن گیا ہے پس یہ انسان اب حاکم نہیں ہے۔ اگر یہ عہد ہمیں یاد نہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے چونکہ ہمیں اس سے بھی بڑی چیز یاد نہیں ہے اور وہ ہم خود ہیں، ہمیں خود اپنا پتہ نہیں ہے کہ ہم کیا ہیں؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معدہ ہے اور ہمارا کام صرف اسی کو بھرنا اور خالی کرنا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنا خدا سے کیا ہوا عہد بھول گئے ہیں۔

کیا امت سے مراد انجمن بننا ہے؟

خداوند متعال نے انسان سے ربوبیت کا عہد لیا ہے۔ ربوبیت کو نظریاتی مرحلے میں سمجھنا اور سمجھانا امت سازی کی بنیاد ہے، اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد ربوبیتِ خدا ہے۔ ہم انجمنیں بنا کر سمجھتے ہیں کہ امت بن گئی ہے۔ اگر امت بنانا اتنا آسان ہوتا تو رسول اللہ ﷺ بھی مکہ میں ایک انجمن بناتے پھر ابوجہل کو صدر اور ابولہب کو سیکرٹری بنا کر فرماتے کہ یہ بہترین امت بن گئی ہے۔ پہلے مرحلے میں آپ ؐ نے ابوجہل کو کہا کہ یہ لات و منات تیرے رب نہیں ہیں بلکہ اللہ ہی تیرا رب ہے۔

مجتہدینِ لغت و اساتیدِ لغت میں فرق:

بعض نے ربوبیت کے بہت زیادہ معانی ذکر کیے ہیں۔ اہلِ لغت کی دو قسمیں ہیں بعض لغت میں مجتہد ہیں اور بعض لغت میں استاد ہیں۔ واقعاً لغت شناس بہت کم ہیں، جن کے اندر ملکۂ اجتہاد آ گیا ہے لیکن اساتیدِ لغت زیادہ ہیں جو صرف لغت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مجتہدینِ لغت جانتے ہیں کہ رب کا معنی کیا ہے لیکن جو صرف لغت کا مطالعہ کرتے ہیں وہ معانی اور لوازمِ معانی میں تشخیص نہیں دے سکتے لہٰذا بعض نے جو رب کے کئی معانی ذکر کیے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اخبار میں لغت پڑھی ہے جبکہ مجتہدِ لغت نہیں ہیں لہٰذا انھوں نے رب کے جتنے بھی معانی ذکر کیے ہیں ان میں سے ایک بھی درست نہیں ہے۔

رب کا لفظی معنی:

لفظِ رب، رَبَبَ سے مشتق ہے، اس کے اندر مصدری خاصیت بھی ہے اور صفتی خاصیت بھی اور ربوبیت اسمائے فعلیہ میں سے ہے، لفظِ رب جو اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے وہ اپنے لئے عنوان کے طور پر انتخاب کیا ہے۔ لفظِ رَبَبَ کو عرب کسی ناقص چیز سے اُس کے نقص کو برطرف کرنے کے بعد اُس کو ضروری لوازمات فراہم کر کے کمال تک پہنچانے کو کہتے ہیں یعنی ایک ناقص چیز جو کمال تک پہنچ سکتی تھی لیکن نہ پہنچی ہو اُسے مطلوبہ کمال تک پہنچانے کو کہتے ہیں۔ رب تکامل یا کمال تک پہنچنے کو نہیں کہتے بلکہ کسی ایسی چیز جس میں کمال تک پہنچنے کی صلاحیت ہے لیکن وہ کمال تک نہیں پہنچ رہی تو اُسے کمال تک پہنچانے کو کہتے ہیں۔

پس رب خصوصاً اس تکمیل کو کہتے ہیں جس چیز کے اندر نشوونما ہو مثلاً صنعتی

> امت سازی کیلئے پہلا
> مرحلہ نظریاتی مرحلہ ہے جیسا کہ سیرتِ طیبہ رسول اللہ ﷺ میں بھی ہے اور قرآن مجید نے بھی آغاز اس مرحلے سے کیا ہے۔
> امت سازی کیلئے سب سے پہلے نظریاتی اور اعتقادی مرحلہ ہونا چاہئے چونکہ ہر چیز کی بنیاد انسان کے اعتقاد اور نظریے پر ہے، اگر نظریاتی میدان میں انسان درست نظریہ اپنالے تو ایک درست نظام بھی اس کی بنیاد پر قائم کرسکتا ہے اور اگر نظریاتی مرحلے میں انسان صحیح نظریہ نہ اپنا سکے اور خطا کر جائے تو پھر ہرگز وہ درست نظام اختیار نہیں کرسکتا۔

> قرآن مجید نے ربوبیت کو ایک نظام کے طور پر ذکر کیا ہے یعنی انسان کا اعتقاد و ایمان ہو اور تصدیقی ایمان ہو کہ خداوند تعالیٰ تمام عالمین کا رب ہے۔ جب تک راز و رمزِ ربوبیت نہیں کھل جاتا نظریاتی مرحلہ طے نہیں ہوسکتا، کم از کم وہ نظریاتی مرحلہ طے نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر امت تشکیل دی جا سکے اور جس پر امت کا وجود قائم کیا جا سکے۔

ترکیب یا کیمیکل ترکیب کے ذریعے کسی چیز کو مکمل کرنا یہ کمال تک پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ ایک چیز جو خود نشو ونما اور رشد کر رہی ہے لیکن ایک چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے رشد رُکا ہوا ہو، اب اِس چیز میں اُس کمی کو پورا کر کے اُسے کمال تک پہنچانے کو عرب ربّ کہتے ہیں مثلاً ایسا پودا جو زمین میں لگایا گیا ہو لیکن اُس کے رشد میں کوئی چیز رکاوٹ ہو تو اُس کو رشد کرنے کے لئے اُس رکاوٹ کے ہٹنے کی ایک مخفی طلب موجود ہے کیونکہ اس میں رشد کرنے کی پنہان استعداد موجود ہے۔ اس استعداد کو باہر آنے کیلئے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے اور اگر وہ ضروریات اُسے میسر ہوں اس کی یہ مخفی استعداد باہر آتی ہے اور یہ درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے لہٰذا پودے میں باہر سے کچھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے اس کو خاص آب و ہوا، مٹی، پانی اور ایک معین درجۂ حرارت کی ضرورت ہے تاکہ اس کے اندر موجود صلاحیت پنپ سکے، اگر ان ضروریات میں سے ایک چیز کم ہو جائے پھر اُس کے بڑھنے کی استعداد رک جاتی ہے لہٰذا نامیاتی استعداد جس شئی کے اندر موجود ہو اس کے بڑھانے کو عرب ربّ یا ربوبیت کہتے ہیں۔

مفہوم ربوبیت:

عام طور پر اسمِ رب سے مراد پالنے والے یا پروردگار کیا جاتا ہے یعنی وہ رب جس نے ہمیں خلق کیا ہے اور ساری نعمتیں ہمیں عطا کی ہیں یا دوسرے لفظوں میں ہمیں اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک نام رب بھی ہے۔

"اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی" (سورہ بنی اسرائیل، آیت ۱۱۰)

یہ تمام اسماء اللہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو کسی بھی نام کے ساتھ یاد کر سکتے ہیں لیکن درحقیقت ہر اسم یا صفت کا ایک خاص معنی اور ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ رب بھی اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور اس اسم میں خداوند متعال کا وہ پہلو ہے جس کے ذریعے سے نظامِ کائنات بنا ہے اور نظامِ کائنات چل رہا ہے اور نظامِ کائنات برپا ہے اس کی طرف اشارہ ہے یعنی رب درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نظام کیلئے عنوان ہے۔ پس رب صرف ایک اشارے کے لئے نہیں ہے درحقیقت نظامِ الٰہی کا ایک عنوان ہے۔

خداوند متعال نے اس لفظ کو اپنے نظام، فعل، عمل اور مخلوق کے ساتھ اپنے تعلق کے لئے انتخاب کیا ہے۔ یہ عنوان اس لئے بھی استعمال کیا ہے کہ ایک تو ذاتِ خدا خالق ہے یعنی ہر شئے کو عدم و نیستی سے ہستی کا لباس پہنایا ہے جیسے انسان عالمِ ہستی میں نہیں تھے، انسانوں کو خداوند تعالیٰ نے ہست بنایا ہے یہ بھی خالقیتِ خداوند متعال ہے۔

اللہ اور رب کے عنوان میں فرق:

قرآن مجید میں ذاتِ حق تعالیٰ نے اپنے لئے سب سے زیادہ جو عنوان استعمال کیے ہیں اُن میں ایک اسمِ جلالہ اللہ ہے اور ایک عنوانِ رب ہے باقی عنوان کم استعمال ہوئے ہیں۔ 'اللہ' ذات حق تعالیٰ کا جامع عنوان ہے یعنی جب ہم اللہ کے عنوان سے خالقِ کائنات کو یاد کرتے ہیں تو اللہ کا عنوان جامع ترین عنوان ہے جس میں سارے اسماء، پہلو اور صفات آجاتی ہیں لیکن رب تمام حیثیتوں اور تمام پہلوؤں کے لئے جامع نہیں ہے بلکہ رب فقط اس تعلق کے لئے استعمال ہوا ہے جو خداوند تعالیٰ کا مخلوق کے ساتھ ہے اور مخلوق کے ساتھ تعلق کی کیفیت اور نوعیت کے لئے لفظِ رب استعمال ہوا ہے لہٰذا سورۂ مبارکہ فاتحہ کا آغاز ہی اسی عنوان سے ہوتا ہے۔

"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ"

یہاں اللہ ذات کی طرف اشارہ ہے اور رب اس تعلق و عنوان کی طرف اشارہ ہے جو عالمین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا بنتا ہے یعنی عالمین کے ساتھ رابطے کی نوعیت کا عنوان رب ہے۔ پس ربوبیت درواقع نظامِ الٰہی ہے۔

خلقتِ انسان کے مراحل:

انسان جب ہستی میں آ گئے ہیں یعنی جب لباسِ ہستی پہن لیا تو یہ انسان جو صرف ایک نطفہ تھے۔ امیر المومنینؑ کے فرمان کے مطابق صرف ایک نجس اور بدبودار قطرہ تھے بلکہ یہ صرف قطرہ بھی نہیں تھا بلکہ اس قطرے کے اندر بھی لاکھوں اور کروڑوں نطفے تھے اور اس قطرے کے اندر انسان بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ یہ نطفہ ذریت بننے سے بھی پہلے والا مرحلہ ہے۔ جس طرح خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے

"وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ طِیۡنٍ" (سورہ مؤمنون، آیت ۱۲)

ہم نے انسان کو طین کے سلالہ سے پیدا کیا۔ طین پانی والی مٹی کو کہتے ہیں یعنی پہلے وہ مٹی تھی، مٹی کو گارا بنایا، گارے کو پھر سلالہ بنایا یعنی مٹی کا جوس بنایا۔ انسان نے ابھی تک ساری چیزوں کا جوس نکال لیا ہے لیکن مٹی کا جوس نہیں نکال سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے مشینری لگائی ہوئی ہے جس کا کام صبح شام مٹی کا جوس نکالنا ہے، یہ سبزیاں، پھل، اناج اور غلہ جو انسان کھاتے ہیں ان سے مٹی کا جوس بنتا ہے۔

"ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَۃً فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ" (سورہ مؤمنون، آیت ۱۳)

پھر ہم نے اس سلالہ کو نطفہ بنایا اور پھر اس نطفہ کو قرارِ مکین میں رکھ دیا، قرارِ مکین یعنی امن کی جگہ پر رکھ دیا جہاں اس کو ٹھہراؤ آ گیا ہے یعنی پہلے جمادی مرحلہ تھا اب جمادی مرحلے سے نموو کا مرحلہ شروع ہوا ہے اور نموو کا مرحلہ طین کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس نطفے کے بعد پھر گوشت، ہڈیاں، اعصاب اور رگیں وغیرہ بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ ساری چیزیں بنتی ہیں

"فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ" (سورہ مؤمنون، آیت ۱۴)

اب یہ پورا انسان بن گیا ہے اور انسان کی خلقت کے دوران اس نطفے کے اندر انسان بننے کی استعداد تھی اور اس میں باہر سے کچھ بھی نہیں ڈالا گیا یعنی انسان کو یوں نہیں بنایا گیا کہ انسان کے پہلے الگ الگ اعضاء بنا کر پھر جوڑ دیئے گئے ہوں جیسے گاڑی کے پارٹ الگ الگ تیار کر کے پھر جوڑ کر گاڑی بنائی جاتی ہے۔ دراصل انسان کی نمو ہوئی ہے سب کچھ اس میں موجود استعداد کی وجہ سے ہوا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھا تھا۔

آج ہم عہدِ ربوبیتِ خدا کو بھول گئے ہیں چونکہ جس نے عہد کیا تھا ہم اسی کو بھول گئے ہیں یعنی ہم اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہیں، جس دن انسان کو اپنا علم ہوا اُس دن اُسے عہدِ ربوبیت بھی یاد آ جائے گا مثلاً ایسا شخص جو کسی حادثے کی وجہ سے سب کچھ بھول چکا ہو، اُسے اُن بھولی ہوئی چیزوں کو یاد دلانے کیلئے اُس کی یاداشت بحال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جب اس کی یاداشت بحال ہو جائے گی تو اسے سارے عہد و پیمان بھی یاد آ جائیں گے۔

مفہوم نمو:

نمو سے مراد کسی شے کا اس کے اندر موجود استعداد کے ذریعے ابتدائی ترین حالت سے نکل کر انتہائی حالت تک پہنچانے کو کہتے ہیں مثلاً ہم جب کوئی دیوار بناتے ہیں تو یہ نمو نہیں کرتی بلکہ اسے ہم باہر سے اینٹیں اور پتھر وغیرہ لگا کر مکمل کرتے ہیں جبکہ اگر ہم کوئی پودا لگاتے ہیں تو اس میں باہر سے ہم کوئی چیز نہیں ڈالتے بلکہ وہ خود ابتدائی ترین حالت سے انتہائی حالت کی طرف جا رہا ہوتا ہے اور اسی کا نام نشو و نما ہے۔ یہیں سے مادیت الگ ہو جاتی ہے، مادیت کے قائل لوگ یہ کہتے ہیں کہ نشو و نما خود کار سسٹم ہے پس پودا خود بخود اگتا ہے جو کہ مادے کا تغیر ہے جبکہ درحقیقت یہ خود نشو و نما نہیں کر رہا، کوئی اور ہے جو اس کو رشد دے رہا ہے لہٰذا خداوند متعال نے سورۂ واقعہ میں اسی نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے کہ

"اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ" (سورہ واقعہ، آیت ۵۸)

یعنی کبھی تم نے غور کیا ہے کہ جو کچھ تم نے امناء کیا ہے یعنی تم نے اس پر غور کیا ہے کہ تم نے نطفے کو منتقل کرنے کے سواء کچھ کیا ہے؟

"ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ" (سورہ واقعہ، آیت ۵۹)

یعنی اس کے اندر موجود اس ابتدائی حالت کو انتہاء تک کس نے پہنچایا ہے؟ نطفے کے اندر تو تم نہیں اترے ہو، تمہیں تو خبر ہی نہیں ہے کہ نطفے کے اندر کیا چیز ہے؟ اس کو کیا بنانا ہے اور یہ کیسے رشد کرے گا؟

"اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ" (سورہ واقعہ، آیت ۶۳)

یہ بیج جو تم نے حرث کیا ہے، کھیتی میں ڈالا ہے، زمین میں گاڑھا ہے، کیا اس پر تم نے کبھی غور کیا ہے؟

"ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ" (سورہ واقعہ، آیت ۶۴)

حرث تمہاری ہے مگر زراعت کس نے کی ہے؟ حارث تو تم ہو لیکن زارع کون ہے؟ یعنی مٹی میں دانہ تو تم نے چھپایا ہے لیکن دانے کے اندر چھپی ہوئی چیز کو کس نے ابھارا ہے؟ دانے کو باہر کس نے نکالا ہے؟ پس وہ تو تم نے نہیں کیا۔ جو ظاہر تھا تم نے مٹی میں چھپایا ہے لیکن دانے کے اندر چھپی ہوئی صلاحیت کو میں نے ابھار کر اس دانے کو باہر نکالا ہے۔

خالقیت اور ربوبیت:

کسی مخلوق کو لباسِ ہستی دے کر اس کو بالکل ابتدائی ترین حالت میں رکھنا یہ خالقیت ہے اور اس کو کمال تک پہنچانا یہ ربوبیت ہے مثلاً انڈہ لباسِ خلقت دینا ہے لیکن انڈے کے اندر موجود زردی کو حیات دے کر اُس کو چوزہ بنانا یہ ربوبیت ہے۔ ربوبیت کے لئے بہت ساری صفات کی ضرورت ہے یعنی رب کو ابتدائی حالت سے ترقی، نشوونما اور رشد دے کر اس کو انتہائی نکتے تک پہنچانے کیلئے بہت ساری صفات کی ضرورت ہے مثلاً اگر کوئی چیز جب ابتدائی حالت میں ہو تو وہاں پر اس کے بارے میں دقیق علم رکھنا اور اس کی نشوونما کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب اس کے اختیار میں ہوں پھر ہر مرحلے میں جتنی آفاتِ تکامل ہیں ان کے بارے میں علم ہو اور اُن سے بچانے کی صلاحیت بھی ہو اور پھر اس کے نقطۂ کمال سے بھی آشنا ہو کہ یہاں پر یہ نقطۂ کمال بنتا ہے یعنی وہ ساری صفات جن کے ذریعے سے کسی چیز کے تمام پہلوؤں کو ابتدائی حالت سے نقطۂ کمال تک پہنچایا جائے ان کا نام ربوبیت ہے۔

انسان کے تمام مراحل میں ربوبیت کا کردار:

انسان کے اندر بہت ساری چیزیں ہیں جن کو نشوونما کی ضرورت ہے۔ ایک ذاتیاتِ انسان ہیں جن کی وجہ سے انسان، انسان ہے یہ بھی انسان کا ایک شعبہ ہے جسے نشوونما کی ضرورت ہے اور وہ چیزیں جو ذاتیات نہیں ہیں بلکہ ذات سے باہر ہیں لیکن ذات کے ہمراہ ہیں جن کو عوارض یا عرضیات کہتے ہیں یہ انسان کا دوسرا اہم شعبہ ہے جسے نشوونما کی ضرورت ہے۔ اگر ان عوارض کو شمار کریں تو ایک تفصیل بن جاتی ہے مثلاً علوم انسانی، معرفتِ انسانی، شعورِ انسانی اور صفاتِ انسانی جن کو نشوونما کی ضرورت ہے تا کہ انسان انسانیت کے مرحلے میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح انسانی خلقیات، انسانی اخلاق، انسانی آداب جو انسان کے اندر پیدا ہو جائیں اور ان تمام شعبوں میں انسانیت کو سنوارنا، ابھارنا اور ان تمام پہلوؤں سے انسان کو کمال تک پہنچانا ربوبیت کہلاتا ہے۔

انسان کا جسمانی مرحلہ بھی ہے اور اس کا روحانی مرحلہ بھی ہے۔ انسان کی ضروریات، احساسات، غرائض اور جذبات کے مراحل بھی فرض کیے جا سکتے ہیں کہ ان کی نشوونما کے لئے بھی ربوبیت کی ضرورت ہے یعنی ظاہر و باطن سب کو ربوبیت کی ضرورت ہے مثلاً انسان جب بن جائے گا تو اس کو بصارت کی ضرورت پڑتی ہے اور بصارت کیلئے پھر آنکھوں کی ضرورت ہے پھر آنکھ بننے کیلئے اُن لوازمات کی ضرورت ہے جو نہ گوشت ہیں نہ ہڈی ہیں بلکہ کچھ اور ہی چیزیں ہیں۔ اسی طرح باقی حواس بھی انسان کو چاہئیں اور ان سب مراحل کے لئے ربوبیت چاہئے۔

مالکیت:

رب کو مالک بھی ہونا چاہئے، یہاں مالک سے یہ مراد نہیں ہے جس طرح انسان زمین یا گاڑی کا مالک ہوتا ہے یہ رب نہیں بن سکتا مثلاً انسان درخت کاٹ سکتا ہے مگر درخت پال نہیں سکتا پس اس کے لئے مالکِ حقیقی ہونا ضروری ہے۔ مالک اس کو کہتے ہیں جس کے اوپر شئی کا دارومدار ہو، اس کا ہونا نہ ہونا مالک سے مربوط ہو پس مالکِ حقیقی اس کو کہتے ہیں کہ شئی جو اس کی ملکیت میں ہے وہ اس سے قائم ہو، اس کا دارومدار اس مالک پر ہو لہٰذا رب کے لئے پہلا لازمہ یہ ہے کہ مالک بھی ہو چونکہ نشوونما وہی دے سکتا ہے جس کے اختیار میں وہ چیز ہو اور جو اس کا مالک و خالق ہو چونکہ یوں نہیں ہو سکتا کہ لباسِ

> **خدا فراموشی درحقیقت خود فراموشی ہے اور خود فراموشی خدا فراموشی ہے اسی طرح خود شناسی خدا شناسی ہے اور خدا شناسی ہی خود شناسی ہے۔ خود اور خدا مربوط ہیں، خدا خالق ہے اور خود اس کی مخلوق اور تجلی ہے جس کو خود کا پتہ نہیں ہوا سے خداوند تعالیٰ کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ شخص خدا شناسی کا درس ہی کیوں نہ دیتا ہو لیکن چونکہ خودی کو فراموش کیا ہوا ہے لہٰذا اس پر کوئی اعتبار نہیں کہ اسے کوئی چیز مل جائے۔**

ربوبیت کونظریاتی مرحلے میں سمجھنا اور سمجھانا امت سازی کی بنیاد ہے، اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد ربوبیتِ خدا ہے۔ ہم انجمنیں بنا کر سمجھتے ہیں کہ امت بن گئی ہے۔ اگر امت بنانا اتنا آسان ہوتا تو رسول اللہ ﷺ بھی مکہ میں ایک انجمن بناتے پھر ابوجہل کو صدر اور ابولہب کو سیکرٹری بنا کر فرماتے کہ یہ بہترین امت بن گئی ہے۔ پہلے مرحلے میں آپؐ نے ابوجہل کو کہا کہ یہ لات ومنات تیرے رب نہیں ہیں بلکہ اللہ ہی تیرا رب ہے۔

ہستی کسی اور نے دیا ہو اور نشو ونما کوئی اور کر رہا ہو۔ نشو ونما ہی وہی خالق و مالک کر سکتا ہے جس کو معلوم ہو کہ اس کے اندر کونسی صلاحیتیں اور استعدادیں رکھی ہوئی ہیں اور یہ سب کچھ خالق کو ہی معلوم ہے۔

رب کے معانی اور لوازمِ ربوبیت:

عرب رب کا ایک معنی سید بھی کرتے ہیں۔ جیسے حضرت عبدالمطلبؑ جب ابرہہ سے اپنے اونٹ واپس لینے آئے تھے تو ابرہہ نے کہا کہ میں سمجھا تھا شاید آپ کعبہ چھڑانے آئے ہیں جبکہ آپ اپنے اونٹ چھڑانے آئے ہیں، حضرت عبدالمطلبؑ نے جواب دیا کہ

"انا رب الابل وللبیت ربٌ"

میں اونٹوں کا مالک ہوں اور کعبہ کا اپنا رب ہے، یہاں عبدالمطلبؑ نے اپنے لئے جو رب کا لفظ استعمال کیا ہے یہ نشو ونما دینے والا نہیں ہے بلکہ حاکم، سردار اور حاکمیت ہے یعنی آپ کہہ رہے تھے کہ یہ اونٹ میرے اختیار میں ہیں میں ان کا صاحب ہوں جبکہ کعبے کا اپنا صاحب موجود ہے۔ رب کا ایک اور معنی سرپرست بھی کرتے ہیں یہ بھی اصل معنی کا لازمہ ہے سرپرستی یعنی جو رب ہے وہ سرپرست ہونا بھی ضروری ہے۔ رب کے لئے مالک، خالق، صاحب اور سید ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں سید سے مراد اردو والا سید نہیں ہے، اردو میں سید آلِ رسول ﷺ کو ہی کہتے ہیں لیکن عربی میں سید سردار کو کہتے ہیں۔ بعض نے ربوبیت کا معنی ''دیکھ بھال کرنا'' کیا ہے لہٰذا عربوں نے چرواہے کو بھی رب کہا گیا ہے۔ دیکھ بھال کرنا رب کا معنی نہیں ہے بلکہ رب کا لازمہ ہے چونکہ رب نشو ونما دیتا ہے اور جب دیکھ بھال کرتا ہے تب ہی تو نشو ونما ہوتی ہے، دیکھ بھال اس کے لوازم میں سے ہے۔

بعضوں نے رب کا معنی سنوارنے اور تعادل کرنے والا کیا ہے، یہ بھی رب کا معنی نہیں ہے بلکہ سنوارنا رب کا لازمہ ہے۔ بعضوں نے قائم رکھنے والے کو رب کہا ہے، قائم رکھنے والا رب نہیں ہے بلکہ رب کے لوازمات میں سے ہے۔ اسی طرح بعض اشیاء کو باہم ملانے والے کو بھی رب کہتے ہیں اور اشیاء کا آپس میں ربط قائم کرنا یہ بھی ربوبیت کے لوازم میں سے ہے۔ بعض نے مصلح کو رب کہا ہے۔ جب نشو ونما کے مرحلے کے دوران کسی شئے کے اندر فساد طاری ہو جائے تو اس وقت ربوبیت کا ایک تقاضا یا لازمہ یہ بھی ہے کہ اُس فساد کو برطرف کر کے اس کو دوبارہ نظامِ ربوبیت کے قانون کے اندر لا سکے۔ بعضوں نے رب کا ایک معنی محکم و مستحکم کرنے والا کیا ہے، یہ بھی معنیٔ ربوبیت نہیں ہے بلکہ ربوبیت کا لازمہ ہے۔ اسی طرح شادابی کو بھی ربوبیت کا معنی کیا ہے لیکن یہ بھی اِس کا کامل معنی نہیں ہے بلکہ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ اس کے اندر شادابی بھی موجود ہو۔ بعض نے رب کا معنی انتظام کرنے والا بھی کیا ہے لیکن یہ بھی لازمۂ ربوبیت ہے۔ عرب اُس مجمع کو رُبّ کہتے ہیں جس میں دس ہزار سے زائد آدمی جمع کیے گئے ہوں لیکن وہ مجمع جو خود جمع ہوا ہو اُس کو ربّ نہیں کہتے مثلاً نمازِ جمعہ میں اگر دس ہزار سے زیادہ لوگ اکٹھے ہو جائیں تو اس کو عرب رُبّ کہتے ہیں چونکہ ان کو اکٹھا کرنے کیلئے اذان دی جاتی ہے یہ خود جمع نہیں ہوتے۔

معاشرتی اجتماعی نظام اور ربوبیت:

رب کا معنی کسی شئے کو نشو ونما دے کر تکمیل کرنے والا ہے اور تکمیل اس چیز کی ہوتی ہے جو ابتدائی حالت میں پیدا کی گئی ہو، لباسِ خلقت اس کو ابتدائی حالت میں دیا گیا ہو لیکن اس کے اندر انتہائی حالت تک پہنچنے کی گنجائش موجود ہو۔ تمام تقاضوں اور لوازمات کے ساتھ اس ابتدائی حالت سے نکال کر انتہائی حالت تک پہنچانا ہی ربوبیت کہلاتا ہے۔ خداوند متعال نے اس لفظ کو اپنے اور مخلوق کے درمیان رابطے کیلئے عنوان کے طور پر استعمال کیا ہے یعنی خالقِ ذرات، خالقِ انسان اور خالقِ موجودات فقط خدا ہی ہے چونکہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ارادہ واختیار دیا ہے اور اس کے لئے شریعت وقانون بنایا

بقیہ صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ کریں..........

کر، روڈ پر ٹھنڈی راتوں میں بیٹھی ہوئی ہیں۔

ہر ماں کو کربلا سے دلاسہ ملا:

عزیزان! کچھ ایسی بھی لاشیں تھیں جو اصلاً ملی ہی نہیں ہیں، دھماکہ اتنا شدید تھا کہ لاش کے ٹکڑے بھی نہیں ملے، لاش ناپید ہوگئی، اب وہ ماں کس کو رو رہی ہوگی، اس ماں کو کون تسلی دے رہا ہوگا، اس ماں کے دل کی ڈھارس کیا ہوگی جس کے لختِ جگر کا مزار بھی نہیں بنے گا، جس کے لختِ جگر کی قبر بھی نہیں بنے گی، جب اس کو اپنا لختِ جگر یاد آئے گا وہ ماں کہاں جائے گی؟ شاید دھماکے کی جگہ آ کر کسی خلوت میں آ کر، رو کر چلی جائے! معلوم نہیں کہ جب یہ ماں دھماکے کی جگہ سے گزرے گی اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

بقیہ: امت سازی از نظر قرآن

ہے تا کہ اپنے ارادے سے نظامِ خدا کو خود نافذ کرے۔ پس بنا برایں انسان کے لئے ربوبیت کا معنی بہت ہی اہم ہو جاتا ہے تا کہ انسان اپنے معاشرے کے اندر جو اجتماعی نظام برپا کرے وہ نظام، نظامِ ربوبیت کے مطابق ہو، نظامِ ربوبیت کے تحت ہو اور انسان اس باور کے ساتھ اس نظام کو برپا کرے کہ اللہ رب ہے چونکہ سب سے بڑی خطا انسان اسی مرحلۂ ربوبیت میں کرتا ہے۔ ساری خرابی یہاں پیدا ہو جاتی ہے۔

آغازِ گمراہی:

انسان جب راہِ نظامِ ربوبیت گم کر بیٹھتا ہے تو یہی گمراہی کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہیں سے شیطان انسان کے ذہن میں توہّمات ڈالتا ہے کہ یہ ربوبیت خداوند تعالیٰ میں منحصر نہیں ہے اس کے علاوہ بھی رب موجود ہیں مثلاً اگر آج ہم مسلمانوں کو ہی دیکھیں، مسلمانوں کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ اللہ کی ربوبیت پر ایمان نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ انہوں نے اور بھی ارباب بنائے ہوئے ہیں وہ ارباب خود مسلمانوں میں سے بھی ہیں یعنی اپنے حکمرانوں، علماء، جاگیرداروں، سرداروں، سرمایہ داروں، صنعت کاروں، سیاستدانوں اور پیروں کو ارباب مانا ہوا ہے۔ یہ سارے نظام جس نے جہاں جہاں سے لئے ہیں ان سب کو بھی اپنا ارباب مانا ہوا ہے یعنی جس کے سامنے بھی یہ خاضع اور تسلیم ہیں یہ درحقیقت اس کی ربوبیت کے قائل ہیں۔ قرآن اس کو بیان کرتا ہے کہ انسان کی ساری دشواری یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ جب انسان یہ خطِ ربوبیت بھول جاتا ہے اور یہاں پر شیطان انسان کو گمراہ کرتا ہے اور ربوبیتِ خدا کے نظام سے ہٹا کر دیگر گمراہانہ نظام کی طرف انسانوں کو لے جاتا ہے۔ پس امت سازی اس وقت ہوتی ہے کہ جب نظریاتی اور اعتقادی مرحلے میں انسان نظامِ ربوبیتِ الٰہی کو سمجھ جائے اور اس پر ایمان لے آئے۔ اُمت سازی کے لئے ضروری ہے کہ ہم واقعاً خداوند تعالیٰ کو اپنا رب مان لیں اور تحتِ ربوبیتِ خدا میں آ جائیں۔